# طلوع اسلام

اپریل اور مئی سنہ ۵۸ء
کا
مشترکہ پرچہ

قیمت ۔ ایک روپیہ آٹھ آنے

یکم مئی ۵۸ء سے ادارہ طلوع اسلام کا پتہ :-

B—25 گلبرگ کالونی لاہور

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

# طلوعِ اسلام

ماہنامہ — کراچی


| بدلِ اشتراک | اس پرچہ کی قیمت | یکم مئی سے ادارہ کا پتہ |
|---|---|---|
| ہندوستان اور پاکستان سے سالانہ آٹھ روپے | ایک روپیہ آٹھ آنے | ۲۵-بی گلبرگ کالونی لاہور |
| غیر ممالک سے ۱۲ شلنگ | | |

جلد ۱۱ — اپریل - مئی ۱۹۵۸ء — نمبر ۴، ۵


## فہرست مضامین


| | | |
|---|---|---|
| ادارۂ طلوعِ اسلام کراچی سے لاہور | | ۲ |
| لمعات | | ۳ |
| کراچی سے لاہور | محترم پرویز صاحب | ۹ |
| نقد و نظر | | ۱۱ |
| ریاست کا اسلامی تصور | ڈاکٹر محمد عبداللہ العربی | ۱۷ |
| سائنس اور اسلام | ڈاکٹر رضی الدین صدیقی | ۲۷ |
| اسلام میں ملکیتِ زمین کا مسئلہ | ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی | ۳۳ |
| جمہوریت اور شریعتِ اسلامیہ | ڈاکٹر کوٹلر ینگ | ۴۹ |
| اسلامی خود اعتمادی پر ایک غیر مسلم کا تبصرہ | ڈاکٹر برٹولڈ اسپولر | ۵۶ |
| جواں سال ترکوں کے سیاسی افکار | ڈاکٹر برنارڈ لیوس | ۶۲ |
| اسلام میں آزادیٔ مذہب | پروفیسر محمد خلف اللہ | ۶۶ |
| اسلام میں قانون سازی کے امکانات اور اجتہاد کا مقام | پروفیسر جے۔ شاخت | ۷۳ |
| اسلام اور تحصیلِ علم | استاد بدیع الزمان فروزانفر | ۷۷ |
| قرنِ اول کے مذہبی فرقے | علامہ احمد امین مصری مرحوم | ۸۱ |
| مذاہبِ عالم کی حقیقت | محترم عبداللہ المدوزی | ۱۲۱ |
| دعوتِ انقلاب | ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب | ۱۲۹ |
| حقائق و عبر | - - - | ۱۴۷ |
| رابطۂ باہمی | - - - | ۱۵۶ |
| فہرست پیش کش | - - - | ۱۵۸ |

# اِدارۂ طلوعِ اسلام

## کراچی ــــــ سے لاہور

جیسا کہ سابقہ پرچہ میں اعلان کیا گیا تھا، ادارۂ طلوعِ اسلام کا ہیڈ کوارٹر، کراچی سے لاہور منتقل ہو رہا ہے۔ اس سلسلہ میں حسبِ ذیل امور کا پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔

(۱) زیرِ نظر شمارہ اپریل اور مئی ۱۹۵۵ء کا مشترکہ پرچہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مئی کا الگ پرچہ شائع نہیں ہوگا۔ اگلا پرچہ شروع جون میں قارئین کے پاس پہنچے گا۔

(۲) جون کا پرچہ لاہور سے شائع ہوگا۔

(۳) نقلِ مکانی کی وجہ سے، اپریل کے مہینے میں دفتر طلوعِ اسلام کا کاروبار بند رہے گا۔

(۴) کراچی کے پتہ پر مزید خط و کتابت بالکل نہ کی جائے۔

(۵) یکم مئی سے ادارہ کا دفتر لاہور میں کھل جائے گا۔ پتہ حسبِ ذیل ہوگا۔

**۲۵-بی گلبرگ ــــ کالونی ــــ لاہور**

(۶) جن خریداران کا چندہ اپریل یا مئی کی اشاعت کے ساتھ ختم ہونے والا ہے ان کے لئے اطلاعی چٹ شریکِ پرچہ میں رکھ دی گئی ہے۔ وہ سالِ آیندہ کا چندہ یکم مئی ۱۹۵۵ء کو ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام۔ ۲۵ بی گلبرک کالونی لاہور کو بذریعہ منی آرڈر بھیجیں۔ شکریہ!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# لمعات

علامہ اقبالؒ کو ہم سے رخصت ہوئے آج پورے بیس سال ہو گئے۔ اس بیس سال کے عرصہ میں دنیا کہیں سے کہیں چلی گئی۔ بساطِ سیاست پر بے شمار انقلابات آئے۔ کائنات کی فضاؤں نے نئے نئے تحرکات دیکھے۔ چشمِ فلک نے ابنِ آدم کے کہکشاں گیر و ثریا بوس عزائم کا نظارہ کیا۔ زمین والوں نے اپنے چاند آسمان پر اُڑا دیئے یہ سب کچھ اس بیس برس میں ہوا لیکن اُس مردِ دانا و بینا نے امتِ مسلمہ کی نفسیات کا جو تجزیہ کیا تھا اُس میں سرِ مو فرق نہ آیا۔ اس نے (اپنی وفات کے وقت نہیں بلکہ اس سے بہت پہلے کہا تھا کہ

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

اس تمام عرصہ میں، ہر نئے دن کا طلوع ہونے والا آفتاب اس حقیقت کی شہادت دیتا چلا گیا کہ اس ملت کے دل سے فی الواقعہ احساسِ زیاں جاتا رہا ہے۔ متاعِ کارواں کا لُٹ جانا کوئی ایسا اندوہناک اور اضطراب انگیز حادثہ نہیں ہوتا جس پر قوم کے گھروں میں صفِ ماتم بچھ جائے۔ اس قسم کے حوادث (قرآن کے الفاظ میں) گردشِ دولابی سے زیادہ کچھ نہیں ہوتے، رہٹ کی بدھنیاں اگر ایک وقت میں، خالی ہاتھ سر نگوں۔ نیچے جاتی نظر آتی ہیں تو دوسرے وقت میں وہی بدھنیاں، لبالب بھری ہوئی اوپر کو چڑھتی دکھائی دیتی ہیں۔ ان کی تہید سنتی، ان کی لبریزی کی تمہید اور سرنگونی، سرفرازی کی دلیل ہوتی ہے۔ لہٰذا زندہ قومیں وقتی شکستوں اور ہنگامی نقصانوں سے قطعاً اثر پذیر نہیں ہوتیں۔ یہ نقصانات (بلکہ) ان کے لئے مہمیز کا کام دیتے ہیں۔ ان سے ان کے ایمان میں اور بھی پختگی آجاتی ہے۔ اَلَّذِیْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ۔ فَزَادَهُمْ اِیْمَانًا (۳/۱۷۲) یہ وہ لوگ ہیں کہ جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ مخالفین نے تمہارے خلاف بڑے بڑے جرار لشکر جمع کر لئے ہیں

بلاشبہ انہیں ان سے ڈرنا چاہیئے، تو اس سے ان کا ایمان اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ لیکن جب کسی قوم کے دل سے احساسِ زیاں جاتا ہے تو وہ دن بدن نیچے ہی نیچے چلی جاتی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے جب کہا تھا کہ اس قوم (اُمتِ مسلمہ) کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا ہے تو انھوں نے ایک عظیم حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا۔ صدیاں گذر گئیں کہ اس کارواں کی متاعِ دین و دانش لٹی اور اس کے بعد آج تک اس لوٹ کا سلسلہ بدستور جاری ہے۔ لیکن اس سوختہ بخت قوم کی حالت یہ ہے کہ یہ (غالب کے الفاظ میں) اپنی متاعِ بردہ کو رہزنوں پر قرض سمجھے ہوئے ہے اور مطمئن بیٹھی ہے کہ یہ قرض (مع سود) گھر بیٹھے واپس مل جائے گا۔

احساسِ زیاں کا یہ فقدان مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے کسی ایک شعبے سے متعلق نہیں۔ ان کا ہر گوشۂ حیات اس سے متاثر، بلکہ اس کا نوحہ خواں اور ماتم کناں ہے۔ اس وقت (بجز چند مختصر خطوں کے) دنیا کے ہر ملک کا مسلمان (سیاسی اصطلاح کے لحاظ سے) آزاد ہے لیکن بنظرِ غائر دیکھیئے تو تحقیقی معنوں میں ان کی کوئی مملکت بھی آزاد نہیں۔ ان سب کی حالت یہ ہے کہ

جاں بھی گروِ غیر بدن بھی گروِ غیر

یہ تو رہی ان کی بین الاقوامی حالت۔ خود داخلی زندگی میں ان کی کیفیت یہ ہے کہ ان کے ہاں نہ سامانِ زیست ہے نہ کیریکٹر یعنی نہ جسم ہے نہ جان۔ یہی وہ کیفیت تھی جس کے پیشِ نظر، علامہ اقبالؒ نے آج سے تیس پینتیس سال پہلے (۱۹۲۵ء میں) کہا تھا کہ

> اسلام اس وقت زمانے کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے۔ اور شاید تاریخ اسلام میں اس سے پہلے ایسا وقت کبھی نہیں آیا۔

جہاں تک (پہلے) ہندوستان اور (اب) پاکستان کے مسلمانوں کا تعلق ہے انھوں نے ۱۹۳۶ء میں اپنے ایک خط میں لکھا تھا کہ

> اسلام کے لئے اس ملک میں نازک زمانہ آرہا ہے۔ جن لوگوں کو کچھ احساس ہے ان کا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کے لئے ہر ممکن کوشش کریں۔ علماء میں مداہنت آ گئی ہے۔ یہ گروہ حق کہنے سے ڈرتا ہے۔ صوفیا اسلام سے بے پرواہ اور حکام کے تصرف میں ہیں۔ اخبار نویس اور آج کل کے تعلیم یافتہ لیڈر خود غرض ہیں اور ذاتی منفعت اور عزت کے سوا کوئی مقصد ان کی زندگی کا نہیں۔ عوام میں جذبہ موجود ہے مگر ان کا کوئی بے غرض راہنما نہیں۔

ان کی زندگی کے آخری ایام میں، مسلم لیگ ہی مسلمانوں کی مؤثر سیاسی جماعت تھی۔ اس جماعت کے متعلق وہ قائدِ اعظم مرحوم کو لکھتے ہیں کہ

> مسلم لیگ کو آخر کار یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ وہ بدستور سابق مسلمانوں کے اعلیٰ طبقے کی نمائندگی تک محدود رہے گی یا مسلمان عوام کی نمائندگی بھی کرے گی۔ ذاتی طور پر میں سمجھتا ہوں کہ جو سیاسی جماعت عام مسلمانوں کا درجہ بلند کرنے کی داعی نہیں وہ عوام میں کبھی مقبول نہیں ہو سکتی۔

ایک اور خط میں رقمطراز ہیں۔

> آئین کے مطابق اعلیٰ عہدے امراء کی اولاد کے لئے وقف ہیں اور نچلے درجے کے عہدے وزیروں کے دوستوں اور

رشتہ داروں کا حصہ ہیں۔ دیگر امور میں ہمارے سیاسی اداروں نے عامۃ الناس کا عمومی درجہ بلند کرنے کا کبھی خیال تک نہیں کیا۔ پیٹ کا مسئلہ دن بدن لاینحل ہوتا جا رہا ہے۔ مسلمان نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا ہے کہ وہ دو سو سال سے ذلیل سے ذلیل تر ہوتا جا رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ مسلمان کے افلاس کا مسئلہ کیسے حل کیا جائے۔ لیگ کا سارا مستقبل اس مسئلہ کے حل پر منحصر ہے۔ اگر لیگ اس مسئلہ کے حل سے قاصر رہی تو مجھے یقین ہے کہ عوام اس سے دور رہیں گے خوش قسمتی سے اس کا حل اسلامی آئین کی تنفیذ میں ہے۔ طویل غور و فکر کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اس طرز آئین کو کماحقہٗ نافذ کر دیا جائے تو کم از کم ہر ایک کا حق معیشت تو محفوظ ہو جاتا ہے۔

انھوں نے ان خیالات کا اظہار ۱۹۳۷ء میں کیا تھا۔ غور کیجئے کہ بعد کے واقعات نے کس طرح حرفاً حرفاً ان کی تصدیق کر دی، حالانکہ اس وقت ہنوز مسلمان انگریز کی غلامی میں تھا۔ بعد میں اسے آزادی مل گئی اور اس باب میں کاملۃً خود مختار ہو گیا کہ اپنے ہاں جس قسم کا آئین چاہے نافذ کر لے۔ لیکن چونکہ ہمارے ارباب اقتدار کے دل میں اس امر کا احساس ہی نہیں کہ اگر افراد مملکت کا حق معیشت محفوظ نہ کیا گیا تو اس سے کس قدر اجتماعی نقصان ہوگا، اس لئے اس آزادی اور "خود آئینی" کے بعد، حالات اور بھی خراب ہو گئے اور نوبت بایں جا رسید کہ اب گداگری کے ٹکڑوں سے بھی قوم کا پیٹ نہیں پلتا۔ اس سے زیادہ کسی قوم کی ذلت کی انتہا اور کیا ہو گی؟

روٹی کی سطح سے اوپر اٹھئے تو کیریکٹر کا سوال سامنے آتا ہے (بلکہ اصل تو یہ ہے کہ خود کیریکٹر کا مسئلہ بھی روٹی کے سوال کے ساتھ اس طرح پیوست ہے کہ ان دونوں کو الگ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے صلوٰۃ اور معاش کا چولی دامن کا ساتھ بتایا ہے)۔ سیرت و کردار کے معاملہ میں (خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی) ہم اس قدر نیچے گر چکے ہیں کہ اس سے پست تر سطح شاید ہی کوئی ہو۔ ستم بالائے ستم یہ کہ اس سے پہلے ہمیں اس امر کا احساس تھا کہ (مثلاً) بددیانتی بُری چیز ہے اور رشوت نہایت مذموم حرکت۔ دھوکا دہی شرفِ انسانیت کے منافی ہے اور غداری جرمِ عظیم۔ لیکن اب یہ احساس اس حد تک مٹ چکا ہے کہ یہ تمام ذمائم و رذائل زندگی کا دستور بن چکے ہیں۔ یہ سب معائب و جرائم معاشرہ کا معمول بن چکے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ ان حالات میں کیا کیا جائے؟ جہاں یہ سوال سب سے زیادہ مشکل اور دشوار ہے وہاں یہ سب سے زیادہ آسان اور سہل بھی ہے۔ مشکل اور دشوار اس لئے کہ جب کوئی قلب حساس دیکھتا ہے کہ

سینہ تمام داغ داغ۔ پنبہ کجا کجا نہم

تو وہ مرض کو ناقابلِ علاج سمجھ کر، ایک ٹھنڈی سانس کے ساتھ، باصد حسرت و یاس کہہ دیتا ہے کہ

یوں خدا کی خدائی برحق ہے
پر اثر کی نہیں تو آس نہیں

یہی وہ مایوسی ہے جس نے آج اچھے اچھے سمجھدار اور درد دل رکھنے والے مسلمانوں کو (مسلمانوں کی طرف سے نہیں بلکہ خود) اسلام کے مستقبل کی طرف سے ناامید کر دیا ہے۔ غالباً یہی وہ نازک مرحلہ تھا جس کے پیش نظر علامہ اقبالؒ کے قلب حزیں سے یہ آہ نکلی تھی کہ

میرے دل میں عالمِ اسلامیہ کے موجودہ حالات دیکھ کر بے انتہا اضطراب پیدا ہو رہا ہے۔ یہ بے چینی اور اضطراب محض اس وجہ سے ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ نسل گھبرا کر کوئی اور راہ اختیار نہ کر لے۔

لیکن اس کے ساتھ ہی یہ مسئلہ آسان اور سہل اس لئے ہے کہ جب مرض کی تشخیص صحیح ہو جائے تو پھر علاج کی طرف سے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ جہاں تک تشخیص کا تعلق ہے، علامہ اقبال نے، اس بصیرت کی بنا پر جو انھیں قرآن پر مدتوں غور و فکر کے بعد حاصل ہوئی تھی، (۱۹۳۲ء میں) کہا تھا کہ

قومیں فکر سے محروم ہو کر تباہ ہو جاتی ہیں۔

یہی وہ حقیقت کبریٰ ہے جس کی طرف، قرآن کریم نے، بہ لسانِ نبوت، یہ کہہ کر توجہ دلائی کہ قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ان سے کہہ دو کہ میں تم سے (کوئی لمبا چوڑا وعظ نہیں کہنا چاہتا) صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ اور وہ یہ کہ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَ فُرَادٰى۔ ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا (۳۴/۴۶) تم اللہ کے لئے ایک ایک دو دو کر کے کھڑے ہو جاؤ۔ اور پھر سوچو۔

احساسِ زیاں کے فقدان کے معنی ہی یہ ہوتے ہیں کہ قوم نے سوچنا چھوڑ دیا ہے۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ کوئی سوچے اور پھر اسے زیاں کا احساس نہ ہو۔ لہٰذا علتِ مرض یہ ہے کہ قوم نے سوچنا ترک کر رکھا ہے اور ــــ تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے ــــ کہ

قومیں فکر سے محروم ہو کر تباہ ہو جاتی ہیں

قرآن نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ (امن کی حالت میں تو ایک طرف) اگر میدانِ جنگ میں سوافراد اس قوم کے ہوں جو سوچ سمجھ کر قدم اٹھاتی ہے تو وہ اس قوم کے ہزار افراد پر غالب آ جائیں گے جو تدبر، تفقہ سے کام نہیں لیتی۔ سورۂ انفال میں ہے وَ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ (۸/۶۵) اس آیت جلیلہ سے یہ حقیقت بھی سامنے آ جاتی ہے کہ قرآن نے تدبر، تفقہ کو کافر اور مومن میں خط امتیاز قرار دیا ہے اور سوچ سمجھ سے کام نہ لینے والوں کو جہنمی ٹھہرایا ہے (۷/۱۷۹)۔

یہ ہوا ہمارے مرض کی تشخیص کا پہلا جزو۔ اب اس کے بعد آگے بڑھئے۔ سوال یہ ہے کہ صحیح فکر کہتے کسے ہیں؟ اس لئے کہ دنیا میں (طبعی طور پر پاگلوں کے علاوہ) ہر شخص یہی کہے گا کہ ہم ہر بات کا فیصلہ سوچ سمجھ کر کرتے ہیں۔ کوئی نہیں کہے گا کہ ہم عقل و فکر سے کام نہیں لیتے۔

اگر ہم بھی دنیا کی اور قوموں کی طرح ہوتے تو اس سوال کا جواب فکری آزادی سے دے سکتے تھے۔ لیکن ہماری حالت دیگر اقوامِ عالم سے مختلف ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ زندگی کی کچھ مستقل اقدار (ناقابلِ تغیر اصول) ہیں جنھیں ہم نہ چھوڑ سکتے ہیں۔ نہ ان سے تجاوز کر سکتے ہیں۔ لہٰذا ہماری فکر ان مستقل اقدار (حدود اللہ) کی چار دیواری کے اندر کام کرے گی۔ بالفاظِ دیگر، ہم وحی کی روشنی میں عقل سے کام لیں گے۔ لہٰذا ہمارے مرض کی تشخیص کا دوسرا بنیادی جزو یہ ہے کہ ہم نے وحیِ خداوندی کو چھوڑ رکھا ہے۔

قرآن نے تشخیصِ مرض کے ان ہر دو اجزا کو ایک ہی اصطلاح میں سمیٹ دیا ہے۔ اور وہ اصطلاح ہے "تدبر فی القرآن"۔ وہ پکار پکار کر کہتا ہے کہ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا (۴۷/۲۴) کیا قرآن میں تدبر نہیں کرتے؟ کیا ان کے دلوں پر تالے پڑ چکے ہیں؟۔ اگلی آیت میں قرآن اس روشِ زندگی کو (جس میں قرآن میں تدبر نہ کیا جائے) "ارتداد" قرار دیتا ہے۔ یعنی دین سے پھر جانا۔

لہٰذا ہمارے مرض کی علت یہ ہے کہ ہم نے قرآن میں غور و فکر کرنا چھوڑ دیا ہے اور اس طرح دین سے عملاً مرتد ہو چکے ہیں۔ اور اس کا عملی ثبوت یہ ہے کہ آج جس معجونِ مرکب کا نام ہم نے اسلام رکھ چھوڑا ہے اس میں سب کچھ ہے بجز عقل اور قرآن کے۔ یہ وہ اسلام ہے جو ایرانی (مجوسی) اثرات کے ماتحت عباسی حکومت کے ٹکسال میں ڈھلا اور مذہبی پیشوائیت کے بل بوتے پر آگے چلا۔ یہی وہ اسلام ہے جس کی نشو و نما کے سامان بہم پہنچانے کی کوششوں کا نام خدمتِ دین قرار دیا جاتا اور جسے زندہ و پائندہ رکھنے کی مساعی کو وجہِ خوشنودیِ باری تعالیٰ بتایا جاتا ہے۔ چونکہ اس اسلام میں، ملوکیت، سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت کا نظام پروان چڑھتا ہے اس لئے سلطنتوں کی طرف سے اس کی حمایت اور مترفین کی طرف سے اس کی مدافعت کی پوری پوری کوشش کی جاتی ہے۔ دورِ حاضرہ میں اسی اسلام کا دوسرا نام "اسلامی ثقافت و تہذیب" ہے جس کے متعلق علامہ اقبالؒ نے صدمت ہوئی کہا تھا کہ

> ہندوستان کے مسلمان صدیوں سے ایرانی تاثرات کے اثر میں ہیں۔ ان کو عربی اسلام اور اس کے نصب العین اور غرض و غایت سے آشنائی نہیں۔ ان کے لٹریری آئیڈیل بھی ایرانی ہیں اور سوشل نصب العین بھی ایرانی۔

اسی کو وہ "ہمارا مجوسی ورثہ" کہہ کر پکارتے ہیں اور کہتے ہیں کہ

> اس مجوسی ورثہ نے اسلام کی زندگی کی سوتیں خشک کر دیں اور اس کی روح کی نشو و نما اور اس کے مقاصد کی تکمیل کے سلسلہ کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔

اسی اسلام کے متعلق انھوں نے بالِ جبریل میں کہا ہے کہ

تمدن۔ تصوف۔ شریعت۔ کلام　　　　بتانِ عجم کے پجاری تمام

یہی وہ اسلامی ثقافت اور تہذیب ہے جس کے احیاء اور تقویت کے لئے مختلف ادارے کھلتے اور جس کی ریسرچ کے لئے متنوع انسٹی ٹیوٹس بنتی ہیں جنہیں حکومت کے خزانۂ عامرہ سے لاکھوں اور کروڑوں روپے کی امداد ملتی ہے۔ (بلکہ اب تو آئینِ پاکستان کی رُو سے، خود مرکزی حکومت کے زیرِ اہتمام، اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا افتتاح ہوا ہے جس کے لئے ساڑھے تین لاکھ روپے حالیہ بجٹ میں رکھے گئے ہیں)۔ یہ ادارے قوم کے نوتعلیم یافتہ (ماڈرن) طبقہ کے ہاتھوں میں رہتے ہیں۔ بو العجبی ملاحظہ ہو کہ ہمارا یہ ماڈرن طبقہ، مُلّا کو مُلّاحیاں سناتا ہے لیکن اپنی ریسرچ سے اسی اسلام کو ماضی کا درخشندہ کارنامہ کہہ کر پیش کرتا ہے جس اسلام کا علمبردار مُلّا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی تہذیب و ثقافت کی ریسرچ کے یہ ادارے اور ہمارے قدیم مذہبی مکاتب ایک ہی روح کے مختلف پیکر ہیں۔ فرق صرف پیرہن کا ہے۔ ان (قدامت پرستوں اور جدت پسندوں) میں جو باہمی مخالفت دکھائی

دیتی ہے وہ جنگ زرگری کے سوا کچھ نہیں۔ مقصد دونوں کا ایک ہے۔ یعنی اُس اسلامی شریعت یا اسلامی تہذیب و ثقافت کا تحفظ جسے اسلام سے کچھ واسطہ نہیں۔ بلکہ جو اسلام کی نقیض ہے۔ قرآن نہ ان کے سامنے ہے نہ اُن کے۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبالؒ نے کھلے کھلے الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ

عالماں از علمِ قرآں بے نیاز — صوفیاں درندہ گرگ و مو دراز
ہم مسلمانانِ افرنگی مآب — چشمۂ کوثر بجویند از سراب
بے خبر از سرِّ دین اند ایں ہمہ — اہلِ کین اند۔ اہلِ کین اند۔ ایں ہمہ
گرگاں را رسم و آئینِ دیگر است — سطوتِ پروازِ شاہیں دیگر است

اندریں حالات، مسلمان کے مرض کا مداوا نہ قدامت پرست مُلّا کے پاس ہے۔ نہ اِن جدت پسند ریسرچ اسکالرز کے پاس۔ اس کے مرضِ کہن کا علاج اس "آبِ نشاط انگیز" (قرآن) میں ہے جس نے عرب کی بے برگ و گیاہ زمین کے عروقِ مردہ میں خونِ زندگی دوڑا دیا تھا۔ کرنے کا کام یہ ہے کہ قرآن کو ہماری درسگاہوں میں تعلیم کا مرکز اور قرآن ہی کو مجالس آئین ساز میں مسلمانوں کے قوانین و ضوابط کا محور قرار دیا جائے۔ ہم اپنے ماضی کو پرکھیں تو اسی کسوٹی پر اور اپنے تمدن و تہذیب کا جائزہ لیں تو اسی معیار سے۔ ہماری ریسرچ ہو تو اس نقطۂ نگاہ سے کہ زندگی کے عملی مسائل کا حل قرآن سے کس طرح دریافت کیا جائے اور ہماری فکر ہو تو اس مقصد کے لئے کہ اس کے ابدی اور غیر متبدل اصولوں کو کس طرح زمانے کے بدلتے ہوئے حالات پر منطبق کیا جائے۔ جب تک یہ نہیں ہوگا ہمارا کوئی قدم صحیح راستہ پر نہیں اٹھیگا۔ لیکن ایسا وہی کر سکے گا جو موجودہ حالات کی رو کے ساتھ بہنے کے بجائے اس کے رُخ کو موڑنے کی ہمت رکھتا ہو۔ اس کے لئے بڑے آہنی عزم اور بلند حوصلے کی ضرورت ہے۔ یہ رونوں کے بھکاریوں کے بس کی بات نہیں۔

اقبالؒ نے قوم کو عمر بھر یہی پیغام دیا اور یہی کچھ کہتا ہوا وہ مردِ درویش اس دنیا سے چلا گیا۔ قوم نے چند دنوں تک اس کی یاد میں ہنگامہ آرائیاں کیں اور اس کے اُٹھنے بیٹھنے کے قابل بھی نہ سمجھا۔ کہیں کہیں اس کے نام کی تختیاں اب بھی آویزاں نظر آتی ہیں لیکن یہ بھی اس وقت تک ہیں جب تک یہ تختیاں کشادگیٔ رزق کے تعویذ کا کام دیتی ہیں۔ اس کے بعد اتنا بھی باقی نہیں رہے گا۔ لیکن اقبالؒ کا پیغام بہرحال باقی رہے گا اور جب بھی کوئی اللہ کا بندہ صحیح اسلام کے احیاء کے لئے اٹھیگا، وہ اس کی فکر کی راہ نمائی قرآن کی طرف کرنے میں مدد دے گا۔ یہی اقبالؒ کی حقیقی یادگار ہوگی اور اسی سے قوم کو نئی زندگی ملے گی۔ دیکھا بصائر للناس۔

# کراچی سے لاہور

معنیٔ او از تنک آبی رم است
ترکِ شبنم بہرِ تسخیرِ یم است

پرویز

طلوع اسلام کنونشن (منعقدہ لاہور) میں جب یہ ریزولیشن زیر بحث تھا کہ ادارہ طلوع اسلام کا ہیڈ کوارٹر کراچی سے لاہور منتقل کر لیا جائے، تو ایک صاحب نے کہا کہ جس شخص پر اس تبدیلی کا سب سے زیادہ اثر پڑے گا، اس سے بھی تو پوچھ لیا جائے؟ (ان کا اشارہ میری طرف تھا)۔ اس پر محترم صدر صاحب (خان بخت جمال خان نے اپنے مخصوص قلندرانہ انداز میں فرمایا کہ ان امور میں اب پرویز صاحب کا ذاتی اختیار کوئی نہیں رہا۔ جہاں قرآنی مشن کے لئے فضا زیادہ سازگار ہوگی انھیں وہیں رہنا ہوگا۔ لہٰذا فیصلہ اس نقطۂ نگاہ سے کیا جائے کہ اس مشن کے فائدہ کے لئے ادارہ کا صدر مقام کس جگہ ہونا چاہیئے۔ نہ اس خیال سے کہ پرویز صاحب کس جگہ رہنا پسند کرتے ہیں۔ چنانچہ فیصلہ یہی ہوا کہ مشن کے مفاد کے پیش نظر ادارہ کا صدر مقام کراچی سے لاہور منتقل کر لیا جائے۔

محترم خان بخت جمال خاں صاحب نے بات ٹھیک کہی تھی۔ میری زندگی اب قرآنی مشن کے لئے وقف ہے اس لئے مجھے وہی کچھ کرنا ہوگا جو اس مشن کے لئے زیادہ سے زیادہ نفع رساں ہو اور وہیں رہنا ہوگا جہاں کی فضا اس مقصد کے لئے زیادہ سازگار۔ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ لَا شَرِیْکَ لَہٗ۔ وَ بِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ۔

میں تقسیم ہند کے بعد، دہلی سے سیدھا کراچی آ گیا تھا۔ گھر مشرقی پنجاب میں تھا جو وہیں لٹ لٹا گیا اور اس طرح "وطن" کی ہلکی سی نسبت بھی مجھ سے دور ہو گئی اور میں یہ کہنے کے قابل ہو گیا کہ

درویشِ خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی　　　گھر میرا نہ دلّی ۔ نہ صفاہاں نہ سمرقند

اس کے بعد میں مسلسل کراچی ہی میں رہا۔ میرے احباب بھی وہی ہیں جو میرے قرآنی مشن سے متفق ہیں۔ ان میں سے اکثر دہلی سے ساتھ آئے۔ پھر اس حلقہ میں کراچی میں اضافہ ہوتا گیا۔ ان احباب سے جدا ہونے کے خیال سے دل کو ایک دھچکا سا لگتا ہے، لیکن اس کے باوجود میں کوشش کرتا ہوں کہ میری آنکھیں نم آلودہ نہ ہونے پائیں۔ مجھے اس کا بھی احساس ہے کہ ان دوستوں کے دل پر جدائی کے اس تصور سے کیا گذر رہی ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ جس بلند مقصد کی خاطر میں عمر بھر کے اِن مخلص رفیقوں کو چھوڑ رہا ہوں، اُس مقصد سے محبت، ان رفیقوں کو بھی اس کی ہمت دیدے گی کہ وہ اس مفارقت کو بخوشی گوارا کریں۔

جن دوستوں سے اس قسم کے قلبی تعلقات ہوں، وہ تشکر اور سپاس گزاری کی رسمیات سے بہت بلند ہوتے ہیں۔ لیکن بایں ہمہ میں اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس تمام عرصہ میں ان کی طرف سے جس اخوت و محبت۔ جس یگانگت اور رفاقت۔ جس یکدلی اور ہم نگہی جس ایثار اور خلوص کا مظاہرہ ہوتا رہا ہے، میرے دل پر اس کا گہرا نقش ہے اور یہی وہ متاعِ گرانبہا ہے جسے میں کراچی سے اپنے ساتھ لئے جا رہا ہوں۔ ان میں بعض احباب تو یقیناً ایسے ہیں جو گویا میری زندگانی کا جزو بن چکے ہیں اور میں سمجھ ہی نہیں سکتا کہ ان کے بغیر زندگی کس حال سے گذرے گی؛ اس خلا کو اگر کوئی چیز پُر کر سکتی ہے تو وہ یہی ہے کہ جس خطۂ زمین کی طرف میں اِنّی ذاھبٌ اِلیٰ اللہ کہہ کر منتقل ہو رہا ہوں، وہاں کے رفقائے کار مقصدِ پیشِ نظر کی تکمیل کے سلسلہ میں ایسے نتائج مرتب کر دکھائیں جو اس مفارقت کا مداوا بن جائیں اور جنہیں دیکھ کر کراچی کے احباب کو بھی اتنی تسلی ہو جائے کہ ان کے جذبات کی قربانی رائیگاں نہیں گئی۔

میں غم اور خوشی کے ان ملے جلے جذبات کے ساتھ، کراچی کے احباب کو اپنا محبت بھرا الوداعی سلام کہتا ہوں۔ اور مقصد کی کامیابی کی تابندہ آرزوؤں اور حسین توقعات کی معیت میں لاہور کے احباب کی طرف قدم اٹھاتا ہوں۔ ان دعاؤں کے ساتھ کہ

وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّ
اَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا
نَّصِیْرًا

کراچی کی ہواؤ! اللہ تمہیں خوشگوار رکھے ـــــ لاہور کی فضاؤ! خدا تمہیں خوشگوار تر ثابت کرے۔

پرویز

# نقد و نظر

## ۱۔ مقدمہ ابن خلدون ۔ اردو

دنیا کی کم کتابوں کو ایسی شہرت نصیب ہوئی ہوگی جیسی ابن خلدون کے مقدمہ کو ہوئی۔ ابن خلدون وہ پہلا مورخ ہے جس نے (قرآن کریم سے اس راز کو پاکر) تاریخ کو ایک فلسفہ کی حیثیت سے پیش کیا۔ یعنی جس شعبۂ علم کو آج "فلسفۂ تاریخ" کہا جاتا ہے، مبالغہ نہیں ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ ابن خلدون اس کا اولین محقق ہے۔ کم از کم اتنا تو مغرب کے اکثر نامور مورخین و مفکرین کو بھی تسلیم ہے کہ عمرانیات (SOCIOLOGY) میں اولیت کا سہرا ابن خلدون ہی کے سر ہے۔ اس نے سات جلدوں میں مسلمانوں کی تاریخ مرتب کی تھی۔ اس کی پہلی مبسوط جلد اس کتاب کا مقدمہ ہے۔ اور یہی وہ مقدمہ ہے جس سے جریدۂ عالم پر مصنف کا دوام ثبت ہوگیا۔ اس مقدمہ کا (مکمل یا بعض حصوں کا) ترجمہ یورپ کی قریب قریب ہر علمی زبان میں ہوچکا ہے۔ بہت عرصہ ہوا کتب خانہ وطن (لاہور) کی طرف سے اس کا اردو میں ترجمہ شائع ہوا تھا لیکن اس کی طباعت وغیرہ بڑی ناقص تھی۔ (اور وہ بھی مدت سے نایاب ہے)۔ اب اسی مقدمہ کا اردو ترجمہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب، آرام باغ۔ کراچی کی طرف سے شائع ہوا ہے۔ ترجمہ مولانا سعد حسن خاں یوسفی (فاضل الٰہیات) نے کیا ہے اور خاصہ رواں ہے۔ کتاب متوسط تقطیع کے قریب چھ سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ اور مجلد کی قیمت پندرہ روپے ہے۔ کتابت اور طباعت بھی خوشگوار ہے۔ امید ہے کہ علمی طبقہ کارخانہ تجارت کتب کی اس کوشش و کاوش کو قدر کی نگاہ سے دیکھے گا۔

---

## ۲۔ زیردستوں کی آقائی

ڈاکٹر طٰہٰ حسین (مصری) دنیائے علم میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ان کی ایک کتاب الوعد الحق بڑی دلچسپ۔ پر از معلومات اور سیدھی دل میں اتر جانے والی ہے اس میں انھوں نے اولین شیدایانِ اسلام (مثلاً حضرت یاسر۔ عمار بن یاسر۔ بلال حبشی۔ صہیب رومی۔ عبداللہ ابن مسعود وغیرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم) کے کوائفِ حیات بڑے دلآویز انداز میں لکھے ہیں اور جن صبر آزما مراحل سے انھیں گزرنا پڑا ان کا ایسے موثر انداز سے نقشہ کھینچا ہے کہ ہو نہیں سکتا کہ آپ کتاب پڑھیں اور آپ کا دل خون ہو کر آنکھوں سے نہ ٹپک پڑے۔ طٰہٰ حسین کی اس کتاب کا ترجمہ سید محمد جعفر شاہ صاحب ندوی پھلواری نے کیا ہے۔ طٰہٰ حسین کی کتابوں کا

ترجمہ کرنا کچھ آسان کام نہیں۔ لیکن جعفر شاہ صاحب نے جس کامیابی سے یہ ترجمہ کیا ہے ہم اس پر انھیں مستحق مبارکباد سمجھتے ہیں۔ انھوں نے ترجمہ میں اصل کا انداز اور اثر باقی رکھا ہے۔ شروع میں طٰہٰ حسین کے خود نوشت سوانح حیات بھی شامل ہیں۔ کتاب ادارۂ ثقافت اسلامیہ۔ لاہور کی طرف سے شائع ہوئی ہے اور مجلد کی قیمت -/۸/۳ روپے ہے۔ کتاب کا نام (اصل اور ترجمہ دونوں ہی) اس کے مضمون کا آئینہ دار نہیں۔

ہم سفارش کریں گے کہ اس کتاب کو آپ خود بھی پڑھئے اور اپنے بچوں کو بھی پڑھائیے۔

---

## ۳۔ اسلام اور موسیقی

یہ کتاب سید جعفر شاہ صاحب کی تصنیف ہے جو (سنہ ۱۹۵۶ء میں) ادارۂ ثقافت اسلامیہ۔ لاہور کی طرف سے شائع ہوئی تھی۔ اس میں انھوں نے بتایا ہے کہ یہ جو ہمارے ہاں عام خیال ہے کہ اسلام میں موسیقی حرام ہے، ہماری تاریخ اس کی تائید نہیں کرتی۔ اسلام میں موسیقی حرام نہیں ہو سکتی۔

اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے ہاں جو "غلط مسلمات" رائج ہو چکے ہیں، ان کے خلاف کچھ کہنا بڑا جرأت طلب مرحلہ ہے اور اس نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو ایک "ندوی" کا اس موضوع پر قلم اٹھانا ہمت کا کام تھا۔ اس لحاظ سے شاہ صاحب کی یہ پہلی کوشش بہرحال قابلِ ستائش ہے۔ لیکن ایسے معاملات میں ہم "بین بین" کی روش کو مفید نہیں سمجھتے۔ ہمارے نزدیک صحیح روش یہ ہے کہ غلط مسلمات کا قرآن کی روشنی میں پورا پورا تجزیہ کیا جائے اور پھر قرآن کا فیصلہ صاف، واضح اور دو ٹوک انداز میں سامنے لایا جائے۔

بہرحال کتاب شاہ صاحب کی وسعتِ معلومات کی آئینہ دار اور ان کے مخصوص دلکش اور شگفتہ اندازِ بیان کا عمدہ نمونہ ہے۔ قیمت مجلد سوا تین روپے۔

---

## ۴۔ محکمات

علامہ عبداللہ العمادی (مرحوم) جامعہ عثمانیہ کے دارالترجمہ کے رکن تھے۔ عربی ادب و لغت پر ان کی نظر گہری اور مطالعہ وسیع تھا۔ انھوں نے زیرِ نظر کتاب میں قرآن کریم کی بعض آیات کے متعلق یہ بتایا ہے کہ ہمارے مفسرین نے انھیں کس طرح چیستاں بنا دیا اور ان کا حقیقی مفہوم کیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ علامہ مرحوم کے بعض تفسیری نتائج سے ہمیں اتفاق نہیں۔ لیکن اس کتاب میں ہماری کتبِ تفاسیر کی جو بوالعجبیاں یکجا جمع ہو گئی ہیں، وہ بجائے خویش اپنی انفرادی حیثیت رکھتی ہیں۔ جو مضامین اس کتاب میں شامل ہیں، ان میں سے اکثر بعض مجلات میں بطور مقالات شائع ہوئے تھے۔ لیکن زیرِ نظر کتاب کے دیباچہ سے معلوم ہوا کہ یہ تمام مضامین ابتداءً بھی "محکمات" کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوئے تھے۔ اور اب اس کتاب کو مکتبۂ نشاۃ ثانیہ۔ معظم جاہی مارکیٹ حیدرآباد (دکن) نے دوبارہ شائع کیا ہے۔ کتاب کی قیمت دو روپے بارہ آنے ہے۔ لیکن یہ کہیں نہیں لکھا کہ پاکستان میں کتاب کہاں سے مل سکے گی۔

---

## ۵۔ محمد بن قاسم

جنرل محمد اکبر خاں سپاہی ہیں اور فن سپہ گری و حرب و ضرب کے ماہر۔ انھوں نے اسی میدان میں اپنی عمر صرف کی ہے اور دنیا کی دونوں عظیم جنگوں اور نیز آزادی کشمیر کی لڑائی میں عملی حصہ بھی لیا ہے۔ اس طرح میدان جنگ میں فوجوں کی نقل و حرکت کے طور طریقوں اور دشمن پر کامیابی سے حملہ کرنے کی چالوں اور مدافعت کی تدبیروں کے متعلق ذاتی علم کے بنا پر ذوق و اعتماد سے رائے زنی کرنے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے فن حرب و ضرب پر تصنیف و تالیف کا ایک دلچسپ سلسلہ شروع کیا ہے۔ جو اردو لٹریچر میں ہمارے علم کی حد تک بالکل نیا ہے۔ زیر نظر کتاب اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اس میں محمد بن قاسم فاتح سندھ کے جنگی کارناموں اور ان کے نظم و نسق و انتظام امور مملکت پر روشنی ڈالی ہے۔ فنی اصطلاحات سے حتی الامکان پرہیز کیا گیا ہے اور اسے عام فہم اور دلچسپ بنانے کی پوری پوری کوشش کی گئی ہے۔ ساتھ ہی اہم لڑائیوں کے میدانِ جنگ کے نقشے بھی دیئے گئے ہیں۔ جس سے متخاصم جنرلوں کی تدابیر جنگ بآسانی سمجھ میں آجاتی ہیں۔

بہتر ہوتا کہ اس کتاب کا تاریخی حصہ جن کتب سے ماخوذ ہے ان کے حوالے بھی حاشیہ پر دیدیئے جاتے۔ تاکہ مزید معلومات کے خواہشمندوں کو سہولت ہوتی۔

قیمت تین روپے آٹھ آنے۔ فیروز سنز۔ کراچی و لاہور۔

---

## ۶۔ تاریخ جمہوریت

ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور نے شاہ حسین رزاقی صاحب کی "تاریخ جمہوریت" شائع کر کے پولیٹیکل سائنس کے اردو لٹریچر میں عمدہ اضافہ کیا ہے۔ اگرچہ اردو زبان میں متعدد کتابیں اس مضمون پر شائع ہو چکی ہیں لیکن ایسی جامع اور پُر از معلومات کتاب اس مضمون پر ہماری نظر سے نہیں گذری۔

جب سے انسان میں سماجی شعور پیدا ہوا ہے اس وقت سے لے کر آج تک جمہوریت کی تدریجی ترقی تکنیک پر اس کتاب میں سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور اسلامی اصولِ جمہوریت کو اس تاریخی جائزہ میں کافی شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور بتلایا گیا ہے کہ قرآنی ہدایت و تعلیم نے جس معاشرہ کو متشکل کیا ہے وہ کس مکمل حد تک خالص جمہوری ہے۔ اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ہزارہا سال سے انسانی آبادی کے نصف حصہ یعنی عورتوں کے ساتھ کیسی کیسی ناانصافیاں ہوتی رہیں۔ اسلام نے کس طرح پہلی مرتبہ انھیں ان کے جائز حقوق دلوائے اور معاشرہ میں ان کا صحیح مقام متعین کر کے انھیں دیرینہ ظلم و استبداد کے پنجے سے نجات دلائی ہے۔ اسی طرح غلاموں کی زبوں حالت کی بتدریج اصلاح کر کے بالآخر اس قبیح انسانیت سوز رسم کہن کا قطعی انسداد کر دیا۔ فاضل مصنف نے ظہور اسلام سے ماقبل کے حالات پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ انصاف و عمرانی مساوات کی تاریخ میں اسلام ایک انقلاب آفریں موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کتاب کی تدوین میں کم و بیش ایک سو مستند کتب سے مدد لی گئی ہے جس کی فہرست شریک کردی

گئی ہے۔ یہ کتاب بہرحال قابل قدر ہے اور اسکولوں اور کالجوں کے نصاب میں شریک کئے جانے کے قابل۔

ناشر۔ ادارہ ثقافت اسلامی لاہور۔ قیمت سات روپے۔

---

**۷۔ اسلامک اسٹیٹ اینڈ سوسائٹی (انگریزی)** اس کتاب میں مظہرالدین صدیقی صاحب نے آغاز اسلام کے زمانہ سے لے کر آج تک کی مسلمانوں کی سیاسی، سماجی اور اقتصادی تنظیم و ترقی کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور اپنے اس مطالعہ کو بجز اُن واقعات و تحریکات کے جو تشکیل ریاست اور معاشرتی تبدیلیوں کا باعث ہوئی ہیں غیر ضروری تاریخی واقعات سے بوجھل نہیں ہونے دیا۔ طلوع اسلام سے پیشتر عرب ہی نہیں بلکہ دوسرے متمدن ممالک کے سیاسی و سماجی حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے اسلام کے انقلاب آفریں پیغام و ہدایت اور اس کے اثرات سے خوش اسلوبی اور وضاحت سے بحث کی ہے۔ کتاب دلچسپ اور معلومات آفریں ہے۔

قیمت۔ دس روپے۔ ناشر۔ ادارہ ثقافت اسلامی۔ لاہور

---

**۸۔ مسلم ثقافت ہندوستان میں** گذشتہ ایک ہزار سال میں جب سے مسلمان برصغیر ہند میں فاتحانہ داخل ہوئے ہندی تہذیب و ثقافت کو مسلمانوں نے کن کن برکتوں سے مالا مال کیا ہے ان کی یہ ایک تفصیلی سرگزشت ہے۔ مسلمانوں کی ثقافت کن اصول و عقائد اور کن اقدار و معیارات پر قائم تھی اور ہندوستان کی معاشرتی خرابیوں کی اصلاح میں ان کا کیا حصہ ہے۔ نیز ہر عہد تاریخی کے علمی۔ تعلیمی۔ صنعتی و حرفتی ترقیات کے ساتھ ساتھ ادب اور فنون لطیفہ کی ترقی اور ہندوستان کی سماجی شیرازہ بندی میں کیا کیا تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ ان تمام پہلوؤں پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

جہاں تک مسلمانوں کے فیوض و برکات کا تعلق ہے جس سے ہندوستان اور اسکی ساری قومیں متمتع ہوئی ہیں۔ یہ تذکرہ نہایت خوش آئند ہے لیکن مسلمان خود اس ملک میں کس طرح رفتہ رفتہ اپنے بام عروج سے گر کر سیاسی و معاشی خرابیوں کے قعر ذلت میں جا پڑا، یقیناً ایک نہایت جگر خراش داستان ہوگی۔ فاضل مصنف نے گذشتہ سو سال کی سیاست ہند پر تبصرہ کرتے ہوئے ان تحریکات و واقعات پر بھی اجمالی نظر ڈالی ہے جو بالآخر تشکیل پاکستان کا موجب بنے۔ کاش ایسے موقع پر جبکہ ہم پھر آزادی سے ہمکنار ہوئے ہیں اپنے درخشاں کارناموں کی یاد ہماری کھوئی ہوئی عظمت ماضی کو پھر سے حاصل کرنے کی آرزو اور صالح زندگی بسر کرنے کے لئے مناسب عمل کی توفیق پیدا کرے۔

قیمت دس روپے۔ ملنے کا پتہ۔ ادارہ ثقافت اسلامی۔ لاہور

---

**۹۔ مسئلہ زمین اور اسلام** ہمارے ملک میں صنعت کاری میں بہت کچھ ترقی ہوئی اور ہو رہی ہے۔ اسکی ضرورت تھی۔ لیکن پاکستان بالآخر ایک زرعی ملک ہے۔ اور اس کی اقتصادی ترقی میں زراعت کو اہم مقام حاصل ہے لیکن افسوس کے ساتھ دیکھا جاتا ہے کہ زراعت اور زراعتی پیداوار بڑھانے کی طرف ارباب حل وعقد نے اب تک کوئی خاص توجہ نہیں کی۔ ادارہ ثقافت اسلامی لاہور نے شیخ محمود احمد صاحب کی کتاب زیر نظر شائع کر کے اس اہم مسئلہ کی طرف خاص توجہ کرنے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ اس کتاب میں فاضل مصنف نے پاکستان اور دوسرے متحدہ ملکوں کے زرعی نظم وانتظام اور پیداوار کا مقابلہ کرتے ہوئے واضح کیا ہے کہ ہماری زرعی اصلاح میں کیا کیا رکاوٹیں ہیں اور انھیں کس طرح دور کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے اس مسئلہ پر بھی خاص توجہ مرکوز کی ہے کہ ملکیت زمین اور مزارعت کے متعلق اسلامی تعلیمات سے کیا ہدایت درہبری ملتی ہے۔ اس سلسلہ میں علمائے اسلام نے کون کون سے نظریے پیش کئے ہیں اور اسلامی احکام کی کیا تعبیریں ہوئی ہیں۔ بالخصوص زمانہ حال میں مرزا بشیر الدین احمد صاحب اور سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے "قرآن وحدیث" کے حوالوں سے زمین پر انفرادی ملکیت کا جو غیر قرآنی نظریہ پیش کیا ہے ان پر مصنف نے سیر حاصل تبصرہ اور بے لاگ تنقید کی ہے اور ان ہستیوں کے "تبحر علمی اور عظمت عالمانہ" کے اعتراف کے باوجود یہ بتلایا ہے کہ ان کے نظریے کس طرح اسلام کی صحیح اسپرٹ کے متغائر ہیں منافع اور سود کے مسائل بھی زیر بحث آئے ہیں اور ان کے باہمی فرق وامتیاز اور جواز وعدم جواز سے بھی بحث کی گئی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے تا وقتیکہ پاکستان صحیح معنوں میں مملکت اسلامی نہ ہو جائے اور الارض للہ کا صحیح منشا ومفہوم ذہن نشین نہ ہو ہمارے نظام مزارعت کی خرابیاں۔ سرمایہ داروں اور زمینداروں کی زبردستیاں اور زیردست مزارعین کی زبوں حالی اور بھوک وافلاس کی لعنت دور نہ ہوگی اور ہماری معاشرت وحیثیت میں وہ انقلاب پیدا نہ ہوگا جس کا اسلام متقاضی ہے بحالت موجودہ جو مشورے اور تجویزیں پیش کی گئی ہیں قابل غور ہیں اور صحت مندانہ اقدام۔

بہرحال شیخ محمود احمد صاحب نے جس محنت سے کتاب لکھی ہے وہ یقیناً قابل تحسین ہے۔

ناشر۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ۔ لاہور۔ قیمت چار روپے۔

---

**۱۰۔ سرسید علیہ الرحمۃ کے افکار مذہبی۔ (انگریزی)** سید احمد خاں کی حیات اور کارناموں پر بیسیوں کتابیں انگریزی اور اردو میں لکھی جا چکی ہیں۔ اور مولانا حالی مرحوم کی "حیات جاوید" سب سے زیادہ مفصل اور مستند سمجھی جاتی ہے۔ اس لئے کہ حالی مرحوم کو سرسید کے ساتھ رہنے، کام کرنے اور ان کے خیالات وافکار اور سیرت وکردار کا نزدیک سے مطالعہ کرنے کا پورا موقع حاصل تھا۔ زیر نظر کتاب میں نہ صرف سرسید کی حیات اور کارناموں پر دوسری کتابوں سے جو اب تک لکھی جا چکی

ہیں بلکہ خود اُن کی اپنی تصنیفات سے پوری مدد لی گئی ہے اور ان کی دینی خدمات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ بتایا گیا ہے کہ کس حد تک مسلمانانِ ہند ہر میدان میں پست، زبوں حال اور مائل بہ زوال تھے۔ اور کس طرح ہر طرف تباہی و بربادی کا بھیانک چہرہ نظر آ رہا تھا۔ اس عالم یاس میں سرسیدؒ نے صحت حال کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ کس طرح غیروں سے زیادہ اپنوں نے ان کی مخالفت کی۔ اور یہ مردِ خدا اپنے عزم پر مضبوطی سے قائم رہا۔ اور مسلمانوں کی ذہنی، تعلیمی اور معاشرتی و اقتصادی اصلاح میں ہمہ تن مصروف ہو گیا تاکہ مسلمان دیرینہ غلط روایت پرستی اور اندھی تقلید سے آزاد ہو کر علم و اجتہاد کی روشنی میں ایک صالح معاشرہ قائم کریں۔ اور جدید علوم و فنون سے بہرہ مند ہو کر ترقی کی دوڑ میں کسی سے پیچھے نہ رہیں۔
فاضل مصنف نے ان کے خطبات اور تہذیب الاخلاق کے مضامین سے جو اب قدیم کتب خانوں کی زینت ہو کر رہ گئے ہیں کافی مواد اکٹھا کر کے اُسے خوش اسلوبی سے مرتب کیا ہے اور سرسید نے تفسیر قرآن اور حدیث کا صحیح مقام متعین کرنے میں جو گرانقدر خدمات دینی انجام دی ہیں ان سے بالتفصیل بحث کی ہے۔ یہ کتاب ہر نوع دلچسپ اور قابل قدر ہے۔

ناشر۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور۔ قیمت آٹھ روپے۔

---

اسلام میں

# قانون سازی

کا اصول

اس کتاب میں پاکستان کے علاوہ بعض دیگر ممالک اسلامیہ کے بلند پایہ مقننین کے افکار کی روشنی میں بتایا گیا ہے کہ ایک اسلامی مملکت میں قانون شریعت کا کام کس نہج پر ہونا چاہیے۔
یہ کتاب وقت کی اہم ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ آپ اپنا نسخہ فوراً منگا لیجیے
قیمت فی جلد:- دو روپے آٹھ آنے

ناظم ادارہ

مذاکرہ عالم اسلامی (لاہور)

# ریاست کا اسلامی تصور

از ڈاکٹر محمد عبد اللہ العربی (مشیر قانون و معاشیات، اسلامک کانگریس، قاہرہ)

مملکت کا وجود مغربی سیاسی دستور کی رو سے تین عناصر مثلاً علاقہ، قوم اور حکومت سے ترتیب پاتا ہے۔ تینوں عناصر کا اتحاد ہی مملکت کے وجود کا ضامن ہے۔

یہ تو ہوا مغربی نظریہ ــــ کیا اسلام بھی ایسا ہی نظریہ رکھتا ہے ــــ؟ کیا وہ اُن کی طرح صرف مادی وجود کو ہی کافی سمجھتا ہے؟ اور کیا مملکت کی تنظیم اور اس کے ڈھانچے کے لئے اسلام جو الٰہی مذہب ہے مثبت نظریات پیش کرتا ہے؟

مغربی ریاستی نظریے کی رو سے مذہب اور ریاست دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ اس لئے مذہب کو مملکت کے امور میں دخل دینے کا حق نہیں، کیونکہ یہ معاملات انسانی اختیار سے باہر نہیں اور وہ حالات کے مطابق جیسا مناسب سمجھتے ہیں ان کا انتظام کرتے ہیں۔ خدا کو اپنے کاموں سے غرض رکھنی چاہیئے اور بادشاہ کو اپنے کام سے کام ہونا چاہیئے۔ ملک بادشاہ کا ہے اور مذہب خدا کا۔ ملکی معاملات کا مختار بادشاہ ہے اور مذہبی معاملات میں خدا حاکم ہے۔ ہاں البتہ مذہب کے چند اخلاقی قوانین عوام سے مملکت کے قوانین منوانے میں ممد و معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔

چونکہ اسلام اس دنیا میں خدا کا آخری مذہب تھا وہ انسانیت کی نشوونما اور ترقی کو بھانپ گیا تھا اس لئے اس نے چند ایسے بنیادی قوانین پیش کئے جو زندگی کے تمام امور پر خواہ وہ انفرادی تھے یا اجتماعی۔ صرف حاوی ہی نہیں بلکہ کارآمد بھی تھے۔ اسلام نے یہ آزادی عطا کی کہ ہر وہ قوم جو اسلام کے دامن میں پناہ لیتی ہے ان بنیادی اصولوں پر اپنی مملکت کا ڈھانچہ تیار کر سکتی ہے اور زمانہ و حالات کے مطابق اس میں ترمیم اور وسعت پیدا کر سکتی ہے۔ لیکن یہ لازمی ہے کہ اس عمل سے بنیادی اصولوں پر ضرب نہ پڑے اور اس کی حدود کو نہ توڑا جائے۔

اسلام نے ہمیشہ حقائق کو فراخ دلی سے تسلیم کیا اس لئے وہ مادی نظریہ مملکت کے بارے میں مغربی سیاست دانوں سے اختلاف نہیں رکھتا، کیونکہ مملکت کے لئے بہرحال مادی عناصر ضروری ہیں، لیکن وہ ان عناصر میں غیر مادی عناصر کا بھی اضافہ کرتا ہے۔ اور ایسے بنیادی اصول پیش کرتا ہے جو اخلاقی معاشی اور سیاسی میدان میں انسانیت کی اقدار کے حامل ہیں۔ دونوں نظریات میں فرق صرف اتنا ہے کہ مغربی مفکرین صرف مادی وجود کافی سمجھتے ہیں اور اسلام وسعت نظر اور دور رس نگاہ کی وجہ سے آگے بڑھ کر کئی بنیادی انسانی اقدار

کو بھی شامل کر دیتا ہے۔

اب ہم اسلام کے ان بنیادی اصولوں کا جائزہ لیں گے جو مملکت کا غیر مادی ڈھانچہ تیار کرتے اور اس کے انتظامی امور کی جزئیات تک کو متاثر کرتے ہیں۔ آخر میں تین مادی عناصر میں سے قومیت کے متعلق اسلام کا نقطۂ نظر پیش کریں گے۔

## بنیادی نظریات کا سہ طرفہ اتحاد یا اتحادِ ثلاثہ

۱۔ اسلامی نظریۂ مملکت کی بنیاد اخلاقیات، معاشیات اور سیاسیات جیسے بنیادی اصولوں کے اتحادِ ثلاثہ پر قائم ہے اور ان اصولوں کو عملی شکل دینے کے لئے خدائی احکام کا رتبہ عطا کیا جاتا ہے۔ اور اس وقت تک اسلام کا مملکت کے بارے میں تصور کا سمجھنا بہت مشکل ہے جب تک کہ اتحادِ ثلاثہ کو اچھی طرح نہ سمجھ لیا جائے کیونکہ یہ اصول ایسے ہیں جو عمل میں ایک دوسرے کا ساتھ دیتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں اور اتحاد میں رکاوٹیں بھی پیدا کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

جب تک اخلاقیات کو نہ اپنایا جائے، معاشی اصول بیکار ثابت ہوں گے کیونکہ اس کا نتیجہ لازمی طور پر یہ ہوگا کہ رشوت ستانی زوروں پر ہوگی، اور حکومت کی انتظامی قوتیں اس کا شکار ہو جائیں گی۔ اور اگر اسلام کے معاشی اصولوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو سماجی ڈھانچہ کمزور ہو جائے گا ورنہ تو معاشی اصول اپنا مقصد حاصل کر سکیں گے، نہ اخلاقیات کا عمل دخل سماج میں باقی رہ جائے گا۔ دونوں کے اتحاد کے بغیر اس مقاصد کی تکمیل ناممکن ہو جاتی ہے۔

## ۲۔ اخلاقی نظریات

اسلام کے اخلاقی نظریات کی بنیاد خدا کی وحدت پر ہے۔ اس کے مطابق صرف اللہ ہی پرستش کے لائق ہے۔ انسان کو بتوں کی، خواہ وہ مٹی اور پتھر کے ہوں یا انسانی شکل و صورت و خواہشات کا روپ دھارے ہوئے ہوں، عبادت نہیں کرنی چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو زمین پر اپنا نائب[1] بنا کر جہاں بلند رتبہ عطا کیا وہاں بہت سی ذمہ داریاں بھی عاید کیں۔ اس لئے انسان کا الٰہی اقدار اپنانا اور انہیں رائج کرنا اس کے نائب مقرر کئے جانے کا لازمی اور منطقی نتیجہ ہے۔

اسلام نے صرف انسان کی نفسیاتی اور نظریاتی رہنمائی تک ہی اپنے آپ کو محدود نہیں رکھا بلکہ اسے پائیدار اور مستقل بنانے اور رائج کرنے کے لئے عملی اقدامات بھی ضروری قرار دیئے ہیں۔ روزانہ کی عبادت یعنی نماز کو صرف اسی لئے فرض قرار دیا گیا ہے کہ انسان کو ان اخلاقی اصولوں کو اپنانے کی عملی ترغیب دی جائے اور اس کا شعور اس سے آگاہ رہے کہ کوئی اعلیٰ ہستی ہے جو اس کے ہر عمل پر ہر لحظہ نگاہ رکھتی ہے۔

## ۳۔ معاشی نظریات

اسلام کے معاشی نظریات کو جب قانون کی شکل دی گئی تو اس کا نتیجہ مسلمان قوم میں امداد باہمی کی صورت میں رونما ہوا اور سرمایہ و محنت پر ان قوانین کا اطلاق اس لئے ضروری تھا کہ مادی ترقی اس کے بغیر ناممکن ہے اور مسلمان مادی ترقی کی قدر و قیمت سے بھی آگاہ تھے۔ اسلام کی نظر میں صرف خدا ہی جو واحد خالق ہے، تمام دنیاوی اشیاء کا

---

[1] اس تصور کی قرآن سے تائید نہیں ملتی۔　　(طلوع اسلام)

واحد مالک ہے۔ انسان دنیا میں خدا کا نائب ہے اس لئے اس کی املاک کا مالک نہیں بلکہ صرف امانت دار ہے۔ لہٰذا امانت داری کے فرض سے عہدہ برآ ہونے کے لئے لازمی ہے کہ ان تمام اشیاء کا جو اس کی تحویل میں ہیں مناسب اور فائدہ بخش انتظام اس لئے کرے کہ امانت داری کے اصول پر ضرب نہ لگے یعنی ایمان داری اور دیانتداری کا خیال رکھے اور چونکہ اللہ تعالیٰ اسے اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ ان اشیاء کے نفع کو اپنے کام میں لائے اس لئے اس کا فرض ہے کہ اس پاک ذات خالق و جبار کا شکریہ ادا کرے۔

امانت داری کے عقیدے کی وجہ سے جو فرائض عائد ہوتے ہیں وہ مثبت پہلوؤں کے ساتھ ساتھ منفی پہلو بھی رکھتے ہیں یعنی امر و نہی دونوں پہلو لئے ہوئے ہیں۔ وہ احکام جن کی بجا آوری کا حکم دیا گیا ہے مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ زکوٰۃ۔ یعنی ہر سال اپنے سرمائے کا کچھ مقررہ حصہ ضرورت مندوں کے لئے خرچ کرنا۔

۲۔ انفاق یا خیرات۔ اس کا عمل زکوٰۃ سے وسیع پیمانے پر ہوتا ہے کیونکہ یہ سرمایہ کا وہ حصہ ہے جو خوشی سے خدا کی راہ میں خرچ کیا جاتا ہے اور سماجی و قومی فلاح و بہبود پر لگایا جاتا ہے۔

۳۔ سرمایہ کو کار آمد بنانا یعنی قومی دولت میں اضافے کے لئے اور خود نفع حاصل کرنے کے لئے سرمایہ کو کام میں لگانا۔ اسلام سرمایہ کو دبا کر رکھنے اور حصول دولت میں اس سے کام نہ لینے کے سخت خلاف ہے اور قانون کی رو سے ایسا سرمایہ ضبط کئے جانے کے لائق ہے اور وہ کام جنھیں نہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ اجارہ داری۔ اسلام اس سے بچنے کا حکم دیتا ہے کیونکہ اس کا مطلب سرمایہ کو قوم اور سماج کو نقصان پہنچانے کے لئے استعمال کرنا ہے۔

۲۔ استحصال زر۔ اسلام سرمایہ دارانہ لوٹ کھسوٹ کے بھی خلاف ہے۔

۳۔ تعیش و کنجوسی۔ عیش پر حد سے زیادہ خرچ کرنا یا کنجوسی سے کام لینا اور سرمایہ جمع کرنا بھی ناجائز ہے اسلام دونوں کی متوازن صورت کو پسند کرتا ہے۔

جہاں تک محنت کا سوال ہے اسلام ایسی محنت کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے جو اپنے اور قوم کے لئے حصول دولت پر صرف ہوتی ہے اور وہ کاہلی اور مفت خوری کو ناجائز قرار دیتا ہے۔ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اپنے لئے اور قوم کی خاطر کسی نہ کسی مفید کام میں لگا رہے۔ عمل عبادت میں شامل ہے۔ وہ برائی کی طرف مائل نہیں ہو سکے گا کیونکہ وہ ہر وقت عالم الغیب کی نگاہوں میں رہے گا اور اسے اس بات کا شعور ہوگا۔ محنت کو کبھی بھی منڈی کی جنس کی طرح قابل خرید و فروخت چیز نہیں سمجھا گیا اور نہ اس کا انحصار مانگ اور رسد پر رکھا گیا ہے۔ یہ توانسانیت کی تذلیل ہے اور اسلام انسان کے بلند رتبہ ہونے کا قائل ہے۔ اس لئے قرآن و سنت کی رو سے مزدور کو چند ٹکوں پر مانگ اور رسد کے مطابق خریدا نہیں جا سکتا بلکہ برابر کا حصہ دیا جاتا ہے۔

جگہ کی کمی کے باعث اس بات کا ذکر نہیں کیا گیا کہ اگر ان معاشی اصولوں کو اپنایا جائے تو ایک ایسی سوسائٹی کی بنیاد پڑے گی جو موجودہ سوسائٹیوں سے مندرجہ ذیل معاملات میں مختلف ہوگی۔

۱۔ سرمایہ کو تحصیلِ دولت کے لئے صرف کرنا اور صرف دولت کے معیارِ ضرورت کو مدنظر رکھنے کا انتظام کرنا۔

۲۔ دولت کی مساویانہ تقسیم۔

۳۔ طبقاتی مراتب کی حدبندی ختم کرنا تاکہ ایک طبقہ اتنا نہ گر جائے کہ مشکل و عسرت میں زندگی کے دن کاٹے اور دوسرا بغیر محنت کے عیش و عشرت میں مگن رہے۔ اقلیت کی پانچوں گھی میں ہوں اور اکثریت محروم و نامراد رہے۔

یہ صاف ظاہر ہے کہ اگر ان معاشی نظریات کو قانونی شکل دے کر رائج کیا جائے تو متضاد مفادات کے باوجود معاشی توازن پیدا کیا جاسکے اور اسلامی مملکت کے امن کے علاوہ دوسرے مقاصد بھی آسانی سے حاصل کئے جاسکتے ہیں اور اس کے فلاح و بہبود کے منصوبے کامیاب ہوسکتے ہیں۔

## ۴۔ سیاسی نظریات

مملکت کے ڈھانچے کے لئے اسلام ایسے بنیادی اصول پیش کرتا ہے جو زمانے کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال سکتے اور وسعت پیدا کرسکتے ہیں۔ اسلام سیاسی تنظیم کے خلاف نہیں بلکہ ہر قوم میں ایسی تنظیم کو ضروری قرار دیتا ہے۔ قرآن حکیم میں ہے "تم میں ایک ایسا گروہ ہونا چاہئے جو سچائی کو رائج کرے اور لوگوں کو برائی سے روکے۔" لفظ 'سچائی' یا عربی اصطلاح "المعروف" اپنے اندر وسیع معانی رکھتی ہے اس میں وہ تمام اسلامی قوانین اپنی جزئیات سمیت شامل ہیں جو سوسائٹی کی بھلائی کے لئے بنائے گئے ہیں اور اسے ترقی کی راہ پر گامزن کرتے ہیں۔ لفظ 'برائی' یا عربی اصطلاح "المنکر" میں بھی وہ تمام امور آجاتے ہیں جنہیں اسلام ناجائز قرار دیتا ہے اور اسے سوسائٹی کی اصلاح بھلائی اور ترقی کے لئے مضر سمجھتا ہے۔

منتظمین کی جماعت کے لئے اسلام ایک عالمگیر اصول پیش کرتا ہے اور وہ ہے الشوریٰ یعنی باہمی مشورہ۔ عوام کی رائے ہر حالے میں لینا ضروری ہے خواہ اس کا تعلق حاکم کے انتخاب سے ہو یا حکومت کی تنظیم و مملکت کی تعمیر سے یا اس کے اغراض و مقاصد سے لیکن حاکم مطلق العنان نہیں ہوسکتا۔ مغربی مفہوم میں وہ عوام کے سیاہ و سفید کا مالک نہیں ہوسکتا کیونکہ سب کا حقیقی حاکم صرف خدا ہے۔ قوم کا فرد خواہ اس کا تعلق رعیت سے ہو یا حکومت سے ایک جیسا رتبہ رکھتا ہے اور دونوں پر ایک جیسی اور برابر کی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ جو گروہ یا قوم اپنی رائے سے حکمرانوں کا انتخاب کرتی ہے اس کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ حکام کے احکام کو جائز یا ناجائز قرار دیں۔ وہ اور حکومت کے تمام محکمے جب تک انہیں اسلام کے بنیادی اصولوں کے مطابق خیال کرکے صحیح قرار نہ دیں اس وقت تک ان احکام پر عملدرآمد نہیں ہوسکتا۔ اس طرح پوری قوم کو احساس ہو جاتا ہے کہ حقیقی حاکم صرف خدا ہی ہے۔ اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ مسلمان حکام کا حکم نہیں مانتا بلکہ اپنی قوم کا یا دوسرے معنوں میں خدا کا حکم بجالاتا ہے۔

مجلس مشاورت اسلام کا اہم و لازمی قانون ہے۔ اس قانون کی اہمیت و رتبہ اس بات سے واضح ہے کہ پیغمبر اسلام کو جنہیں وحی آتی تھی یہ حکم دیا گیا تھا کہ صحابہ سے دنیاوی امور میں مشورہ کیا کریں[1] اسلام میں حکومت کسی انسان کی، خواہ وہ خلیفہ ہو یا صدر و گورنر تسلیم نہیں

---

[1] یہ فریضہ پوری کی پوری امت کا ہے۔ (طلوع اسلام)

کی جاتی بلکہ خدا ہی حاکم اعلیٰ تصور کیا جاتا ہے۔ یہ چیز مغربی مفکرین کے اس نظریے کو غلط ثابت کرتی ہے کہ اسلامی حکومت کٹر و متعصب حکومت ہے۔

وہ جماعت جس کے ذمے المعروف کا حکم دینا اور المنکر سے روکنا ہے اس کی کیسے تنظیم کی جائے وہ اپنے احکام کس طرح منوائے اور اگر ایسی جماعت کو منظم کر لیا جائے اور وہ اپنے احکام بھی جاری کرنے لگے تو کیا قوم کے تین گروہ نہیں بن جائیں گے یعنی ایک تو احکام دینے والا۔ دوسرا حکم ماننے والا۔ اور تیسرا جھگڑے کی صورت میں ان احکام کو جائز یا ناجائز قرار دینے والا۔ اور پھر یہ کہ ان گروہوں کی کیسے تنظیم کی جائے اور اس کی جزئیات سے کیسے عہدہ برآ ہوا جائے ۔۔۔؟ ایسے سوالوں کا جواب اسلام نے انسانی فہم و ذکا پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ زمانہ و مقام کی مناسبت سے جیسے درست سمجھے کرے جس طرح حالات اجازت دیں اور جیسا مقامی قوم کا مزاج تقاضہ کرے اسی کے مطابق ان چیزوں کی تنظیم کرے لیکن ساتھ ہی ساتھ اسے قرآن و سنت کو نہ بھولنا چاہیئے۔ اس کی عقل و فہم قرآن و سنت کی روشنی میں جو مناسب اور صحیح راستہ سمجھتی ہے اس کو اختیار کرے۔

اسلام نے انسانی ذہن کی نشو و نما اور ترقی کے لئے بہت کچھ کیا ہے حتیٰ کہ عقائد تک کو اسی نظر سے پیش کیا ہے۔ خدا کا وجود اور اس کی وحدانیت۔ روز قیامت اور روز جزا جبکہ انسان اپنے اعمال کا حساب دیگا ان تمام کو عقلی دلائل سے ثابت کیا ہے۔ اور معجزات یا فوق الفطرت واقعات کو بیان کر کے عقائد کو پیش نہیں کرتا بلکہ اس کا طریقہ ترغیب عقلی دلائل ہیں۔

عقل و فہم میں وسعت و گہرائی پیدا کرنے کی خاطر اسلام علم کا حاصل کرنا (خواہ وہ کہیں بھی ملے) ضروری بلکہ فرض قرار دیتا ہے تاکہ فرض کی ادائیگی سے اُسے یہ احساس ہو کہ وہ خدا کے قریب آگیا ہے اور اس کی نظر میں عزیز ہے۔ چند کتابوں تک علم کو محدود سمجھنے کے بجائے دنیا کی ہر شے سے علم (خواہ وہ عبرت کی صورت میں ہو) حاصل کرنا چاہیئے اسلام دنیا کے بحر بے کنار کی گہرائیوں سے دولت علم حاصل کرنے کی تلقین کرتا ہے اور جب انسان دیکھتا ہے کہ اس مالک الملک نے دنیا کی تمام اشیاء اس کے لئے بنائی ہیں تو اس کی اعلیٰ ہستی پر اس کا اعتقاد اور مضبوط ہو جاتا ہے۔ قرآن حکیم اپنے ارشادات میں ہمیشہ جہالت پر لعنت بھیجتا رہا ہے اور مسلمانوں کو علم حاصل کرنے میں اپنی پسندیدگی کا اظہار کرتا رہا ہے۔

۵۔ مملکت کی تعمیر و ترقی کے لئے فقہائے اسلام کا معیار تنقید وضع کرنا۔

اسلام نے عقل و فہم سے کام لینے کی جو تلقین کی ہے اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ فقہا نے قرآن و سنت کی روشنی میں معیار تنقید کی ایسی کسوٹی وضع کی جو مذہبی رسوم کے علاوہ اسلام کے مختصر لیکن بنیادی اصولوں کو ماحول کے مطابق ڈھال سکنے کے بارے میں صحیح رہنمائی کر سکتی تھی۔ اس طرح سوسائٹی کے تمام معاشی اخلاقی اور سیاسی متعلقہ قوانین وقت و مقام کے ساتھ دینے کے قابل ہو گئے۔ اس معیار تنقید نے الٰہی قوانین کو جامد بنانے کے بجائے حرکی قوت عطا کی۔ چونکہ انسان تیزی سے ارتقاء و ترقی کی منازل طے کر رہا ہے اور دنیا بھی ہر لحظہ متغیر ہے۔ اس لئے اسلام نے بھی اس دور و تبدیلی کا ساتھ دینے کی خاطر اپنے قوانین کو نئے رنگ میں رنگنے کی اجازت دیدی لیکن ساتھ ہی یہ شرط بھی لگا دی کہ وہ اپنے بنیادی مقاصد سے دور نہ چلے جائیں۔

اس کسوٹی یا معیار تنقید کو ہم "مطابقت" یا "قیاس" "استصلاح" یا "کار آمد و عمدہ استعمال" کا نام دیتے ہیں۔ سوسائٹی کی

فلاح و بہبود کے لئے اور اسے ضرر رساں عناصر سے پاک کرنے کے لئے ہم اسی تناظر میں دوسری تنقیدی اصول بھی استعمال میں لائیں گے۔

لیکن بدقسمتی سے ان معیار تنقید کے اصولوں کو بنیادی نظریات کے لئے مسلسل استعمال نہیں کیا گیا جس کی وجہ سے اسلامی نظریہ مملکت ارتقائی منازل طے نہ کر سکا نتیجۃً مسلمان مملکتیں بہت جلد زوال کا شکار ہوگئیں۔ اور مسلم سوسائٹی بے حال و حیا ہو کر رہ گئی اور ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ اس کا الزام غلط راہوں پر چلنے والے مسلمانوں کے بجائے اسلام کے سر تھوپ دیا جاتا ہے۔

(۶) اسلام کے بنیادی اصولوں کو عملی شکل دینے کی پہلی کوشش۔

بہرحال پھر بھی اسلام کے چند ہدایت یافتہ خلفاء نے مملکت کی بنیاد انہی اصولوں پر رکھی اور ان کی پابندی بڑی احتیاط سے کی اور اخلاقیات معاشیات و سیاسیات کو جدا جدا کام میں لانے کے بجائے ان میں مکمل اتحاد قائم رکھا۔ ابتدائی سوسائٹی کے تقاضوں کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ چند ترقی یافتہ عناصر کو بھی شامل کر لیا اور نئی اصلاحات عمل میں لے آئے۔

مملکت کے صدر یا خلیفہ کا انتخاب بااثر دوٹوں سے ہوا کرتا تھا۔ اس طریقۂ انتخاب کو جدید اصطلاح میں الیکشن کہتے ہیں لیکن اس وقت الیکشن کا کوئی باقاعدہ لائحہ عمل تجویز نہیں کیا گیا کیونکہ کوئی خاص ضرورت محسوس نہیں کی گئی تھی۔

خلیفہ مملکت کے انتظامی امور میں خود مختار نہ تھا بلکہ الشوریٰ کے ذریعہ یا جدید اصلاح میں پارلیمنٹ کے ذریعہ اس کے اختیارات محدود کر دیئے گئے تھے۔ لیکن آج کل کی طرح مجلس کی پیچیدہ اور لمبی کارروائی تک نوبت نہیں آتی تھی۔ الشوریٰ کی سادی و مختصر صورت اور دوسرے اصولوں کی ہیئت و عمل اس وقت کی تمام ضروریات کا کفیل تھا۔ اس کی ایک یہ بھی وجہ تھی کہ اس دور کے مسلمان خدا کی عبادت کے مفہوم سے پوری طرح آگاہ تھے اور جانتے تھے کہ قانون کی لاٹھی سب کے لئے ایک ہی ہے خواہ کسی طبقے سے تعلق رکھتا ہو کسی رتبے کا ہو یا کسی رنگ کا ہو۔ انصاف سب کے لئے ہے۔ آزادی خیال اور آزادی تقریر و تنقید ہر ایک کو مساویانہ طور پر حاصل تھی چونکہ وہ اخلاقی اقدار کے پرستار تھے اور اس کے اصولوں پر سختی سے عمل کرتے تھے اس لئے دنیا کی حرص و ہوس سے دامن بچائے رکھتے تھے اور رشوت ستانی جیسی اخلاقی برائیاں جو ہوس دنیا کا نتیجہ ہوتی ہیں اور سوسائٹی کی جڑیں کھوکھلی کر دیتی ہیں اُن کے نزدیک نہ پھٹکتی تھیں۔

## ۷۔ اصولوں کی عمومیت و اختصار کی وجہ سے متوقع خطرے سے بچاؤ کی صورتیں

ہم نے سماجی زندگی کے متعلق اسلام کے سیاسی و معاشی و اخلاقی نظریات کی کچھ وضاحت کر دی ہے اگر وقت ہوتا اور صفحات اجازت دیتے تو ہم پوری وضاحت سے بتاتے کہ اسلامی مملکت کی تعمیر میں یہ انفرادی طور پر کیا کارہائے نمایاں سر انجام دیتے ہیں ایک دوسرے پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں اور ان کا اتحاد کن نتائج کا حامل ہوتا ہے لیکن یہاں یہ بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کی حقیقی قدر و قیمت کیا ہے اور ان اصولوں پر حاوی عالمگیریت کا معیار کن کن مستقل خطرات کو جنم دیتا ہے۔

اس کی حقیقی قدر و قیمت کا اندازہ اس سے ہو جائے گا کہ یہ نہ تو نئے حالات کے مطابق ڈھالنے کا مخصوص طریقہ کار پیش کرتا ہے اور نہ اسے ایسا مستقل اور اٹل بنا دیتا ہے کہ آنے والی نسلیں اس میں اپنے فہم و علم کے مطابق تبدیلی پیدا نہ کر سکیں۔ اور نئے حالات کے

مسائل سے نپٹ سکیں۔ اس طرح عام اور بنیادی اصول پیش کرنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ انسان حالات کے مطابق جو طریق ہائے کار مناسب سمجھیں اسی کے مطابق ان کو لاگو کردیں۔ ان اصولوں کی یہ تبدیل ہونے والی یا حرکی خاصیت یہ ثابت کرتی ہے کہ وہ ایسے الٰہی قوانین ہیں جو ہر زمانے اور ہر دور میں ہر جگہ قابل عمل ہیں۔

## ۸۔ اسلامی نظریۂ مملکت کے مذہبی تقاضوں کا مختصر جائزہ

ان اصولوں کی عمومیت کی وجہ سے اس لئے خطرہ لاحق ہوتا ہے کہ ان کے طریق عمل کی وضاحت نہیں کی گئی۔ یہ چیز اس وقت تو قابل برداشت تھی جبکہ ابھی ابتدائی خلفاء کا دور تھا یا ابتدائے اسلام کا زمانہ تھا لیکن بعد میں جب مملکت وسیع ہوئی اور کئی متضاد مفادات اسلامی زندگی میں داخل ہوگئے تو اس کی وضاحت کی ضرورت محسوس کی گئی کہ انہیں کس طریقے سے حالات کے مطابق ڈھالا جائے۔ مختصر سے اصول جن کے نہ تو طریق ہائے عمل پر روشنی ڈالی گئی ہو اور نہ خاص حالات کے مطابق کوئی تخصیص کی گئی ہو۔ نہ تو ان کے مقاصد کی وضاحت کی گئی ہو اور نہ نتائج بیان کئے گئے ہوں۔ ظاہر ہے کہ ایسے اصول عوام کو متاثر نہیں کرسکتے۔ اس لئے عوام کو گمراہ کرنا اور مملکت کے تصور کی اپنی اسلامی توضیح بتشریح پیش کرنا آسان ہوجاتا ہے اور اکثر ممالک میں اسلامی اصولوں کا ایسا ہی حشر ہوا ہے۔ اور عوام کی اس معاملہ میں کم فہمی اور عدم دلچسپی بدنیت رہنماؤں کے لئے ممد و معاون ثابت ہوئی اور انھوں نے دھوکے یا غلط تاویلات و توضیحات سے یا پھر طاقت سے جمہوری اصولوں کو خود مختاری، مطلق العنانی و شہنشاہیت میں تبدیل کردیا۔

اخلاقی و معاشی اصولوں کا بھی یہی حشر ہوا۔ مختلف طبقوں کو مدغم کرنے یا ختم کرنے کا اصول جو بیک وقت اخلاقی و معاشی حیثیت رکھتا تھا اس کو عملی جامہ نہ پہنایا گیا۔ عالمگیر اخوت اور حملہ آوروں کا بل کر مقابلہ کرنے کے لئے اصول جو سیاسی ہونے کے علاوہ اخلاقی بھی تھے ہمیشہ نظر انداز کئے جاتے رہے۔ نہ کوئی خاص انجمن یا مجلس ہی بنائی گئی جو ان بنیادی اصولوں کو صحیح طور پر عمل میں لاسکے اور ان کی وضاحت کرسکے۔ اسلامی تاریخ میں اس قسم کے رنج و فساد واقعات کا بیان مل جاتا ہے کہ جس وقت مسلمان عثمانی ترکوں کے تحت مشرقی یورپ کو تاراج کر رہے تھے اور وی آنا کے دروازے پر دستک دے رہے تھے اسی وقت مسلمانانِ اندلس کو وہاں سے دھکے دیکر نکالا جارہا تھا۔

## ۹۔ اسلامی نظریۂ مملکت سے متعلق چند مذہبی تقاضوں کا مختصر بیان

ہم اس مضمون کے مذہبی و غیر مادی حصے کو اسلامی نظریۂ مملکت کے بارے میں یہ کہہ کر ختم کرتے ہیں کہ یہ صحیح معنوں میں اس وقت عمل میں آسکتا ہے جبکہ مندرجہ ذیل باتوں کا خیال رکھا جائے۔

۱۔ اخلاقی، معاشی و سیاسی باہم متعلقہ اصولوں کا اتحاد قائم رہے۔

۲۔ اور ان بنیادی و مختصر اصولوں کی وضاحت کردی جائے کہ نئے مسائل کو کس طریق سے سلجھا سکتے ہیں اور انہیں حالات و زمانے کے مطابق کیسے ڈھالا جانا چاہیئے اور پھر یہ کہ اس عمل میں جس طرح نبیؐ نے قرآن و سنت کی رہنمائی قبول کی اسی طرح ہمیں ان کی روشنی میں کس طرح آگے بڑھنا چاہیئے۔

## ۱۰۔ اسلام کے مذہبی دستور کے جدید اسلامی آئین پر اثرات

یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ مردہ قوم نے انگڑائی لی ہے اور

مسلمان مندرجہ بالا سچائیوں کو پانے کے لئے کوشاں نظر آتے ہیں۔ مصر، شام اور پاکستان کی اسلامی مملکتوں کا آئین نئے آئینی رجحان کی غمازی کرتا ہے۔ ان مملکتوں کے قوانین تمام تو نہیں لیکن اکثر اسلام کے ان بنیادی اصولوں کی عکاسی کرتے ہیں۔ سیاسی معاشی و اخلاقی قوانین کا تعین صراحتاً واضح کر دیتا ہے کہ اسلام کو رہنما بنایا گیا ہے۔

یہ اسلام کے وہ بنیادی اور نمایاں اصول ہیں جو ہم نے مغربی اصولوں کے مقابلہ میں بیان کئے ہیں یہ بھی بیان کر دیا گیا ہے کہ مغربی مفکرین سیاست، مذہب و معاشیات کی وحدت کے بجائے ان کے الگ الگ انفرادی طریق کار کو پسند کرتے ہیں۔ اگرچہ سماجی تباہی و بربادی سے مجبور ہو کر فرانس (سنہ ۱۹۲۶ء) جرمنی (سنہ ۱۹۴۷ء) اور اٹلی (سنہ ۱۹۴۹ء) کے قوانین نے سماجی معاشی اصولوں کو ملا دیا ہے لیکن پھر بھی وہ اسلامی قوانین سے مختلف ہیں۔ اسلامی دستور میں احکام کی پابندی کا انحصار حکومت کی طاقت کے بجائے انسانی شعور و ضمیر پر ہے۔ مسلمان کا ضمیر الٰہی قوانین کا پابند ہے بلکہ یوں سمجھئے کہ نگران ہے۔ اراکین حکومت عوام کی اتنی وسیع روزانہ کی زندگی کو کیسے قابو میں رکھ سکتے ہیں (اس کے لئے مذہب کام کرتا ہے)

## ۱۱۔ مملکت کا مادی نظریہ

اب ہم مملکت کی تعمیر کے لئے ان نمایاں مادی عناصر کا تجزیہ کریں گے جن کا تذکرہ پہلے کیا جا چکا ہے مثلاً علاقہ جو جغرافیائی حدود رکھتا ہو۔ ایک قوم جو ان حدود میں رہتی ہو اور ایک حکومت جو اس علاقے میں صاحب اختیار ہو۔

اور اس کا بھی بیان آچکا ہے کہ اسلام ان تینوں مادی عناصر کو ان کے اتحاد ثلاثہ کی صورت ہی میں قبول کر سکتا ہے۔ چونکہ اسلام کو مملکت کے ڈھانچے پر اسلامی رنگ چڑھانا تھا اس لئے اس نے اخلاقی سیاسی و معاشی اتحاد ثلاثہ پر بھی زور دیا اور قومیت کے بارے میں اس کا عام نظریہ دوسروں کے نظریات سے زیادہ وسیع اور ان سے زیادہ انسانی اقدار کو لئے ہوئے ہے۔

## ۱۲۔ اسلامی نکتۂ نگاہ میں قومیت کے عناصر ترتیب

اسلام کے عالمگیر اخوت و مساوات کے اخلاقی اصول اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ مختلف مملکتوں کو قومیت کی بنیاد پر استوار کیا جائے اور صرف اختلاف قومیت کی وجہ سے دوسرے ملک کو تاخت و تاراج کیا جائے یا نسلی امتیازات کی آڑ میں دوسری نسلوں کو ختم کرنے کا منصوبہ بنایا جائے یا ایک ملک یا قوم ذاتی مفادات کے پیش نظر دوسری قوم یا ملک کو ہڑپ کر جائے۔

ان اصولوں نے انسان پر واضح کر دیا کہ خدا نے اسے تخلیق کیا اور زمین پر اپنا نائب مقرر کیا تو اس نے کسی ایسے امتیاز کو روا نہ رکھا چونکہ خدا کی مخلوق ہیں اس لئے سب ایک ہی رتبے کے مالک ہیں اس کی نگاہ میں کوئی برتر یا کمتر نہیں ہے۔

قرآن پاک میں آیا ہے کہ "ہم نے انسان کو واجب التکریم بنایا"۔ انسان سے یہاں مراد کوئی مخصوص علاقے کا انسان نہیں بلکہ بغیر تفریق قوم و علاقہ بیان کیا گیا ہے۔ اس اصول کا منطقی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ تمام دنیا کے انسان بھائی بھائی ہیں اور ان پر زمین پر خدا کے نائب ہونے کے فرائض اور ذمہ داریاں عاید کی گئی ہیں۔

قرآن میں اس مساوات کے متعلق کئی آیات مل جاتی ہیں۔ اور رسول اللہ کا بھی فرمان ہے کہ "دوسرے انسانوں سے نرمی برتو

اور رحم سے پیش آؤ تاکہ خدا کی رحمت تم پر ہو۔ اس میں تمام انسانوں سے ایسے سلوک کی ہدایت کی گئی ہے مسلمانوں کی تخصیص نہیں کی گئی پس اسلام کا مقصد اس دنیا میں آنے کا یہی ہے کہ عالمگیر اخوت کو رائج کرے اور مختلف قوموں میں یک جہتی اور وحدت پیدا کرے۔ مسلم قومیت سے یہ مراد نہیں ہے کہ وہ محدود حدود میں گھری ہوئی ہے اس میں اتنی تنگ نظری نہیں بلکہ فراخدلی سے ہر ملک و قوم کے ساتھ برابر کا سلوک کرتی ہے۔ وہ تعصب برتنے کے بجائے خدا کی زمین کے آخری کونے میں رہنے والے انسان سے بھی محبت کرتی اور خوش آمدید کہتی ہے۔

مختصراً اسلام عالمگیر قومیت کا مطلب کئی قومیتوں کا اتحاد لیتا ہے۔ جزئیات مل کر ایک عالمگیر وحدت کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ اور وہ کثرت میں وحدت کا جلوہ دیکھتا ہے اور مقامی قومیت اس لئے ہے تاکہ وہ آئینی حیثیت سے پابند ہو کر ایک گھر بنا کر رہیں اور اس کی مقامی و جغرافیائی ضروریات کے مطابق باہمی معاملات و مسائل کا تصفیہ کریں۔ اسلام مقامی قومیت کو صرف اسی نقطۂ نظر سے مملکت کی تعمیر میں ایک لازمی عنصر خیال کرتا ہے۔

## ۱۳۔ اسلامی نظریۂ قومیت کے نتائج

۱۔ غیر مسلم اقلیتوں کو مسلمان اکثریت کے ساتھ ساتھ ایک ملک کا باشندہ ہونے کی حیثیت سے مقامی قومیت کے حقوق مل جاتے ہیں۔ جب تک وہ اس ملک کے آئین کو تسلیم کرتی رہتی ہیں اور اس پر عمل پیرا رہتی ہیں۔ انہیں برابر کے حقوق ملتے رہتے ہیں[1]۔ ایک ہی آدم کی اولاد ایک ہی علاقے کے رہنے والے کی حیثیت سے انہیں مسلمانوں جیسے حقوق دیئے جاتے ہیں۔ اس بارے میں اسلام خواہ کوئی کسی مذہب یا نسل سے تعلق رکھتا ہو اس کے حقوق تلف نہیں کرتا۔ اسلام تغیرات زمانہ اور اس کے ارتقاء سے نہیں گھبراتا بلکہ اسے خوش آمدید کہتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ وہ ہر نئے حالات و مسائل سے ہم آہنگ و عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔ اسلام تبدیلیٔ مذہب کے لئے جبر و تشدد کو ناجائز قرار دیتا ہے اور منطقی دلائل کے بجائے صرف معجزات سے عوام کو اپنی طرف کھینچنے کے بھی خلاف ہے۔

۲۔ اسلام روایت پرستی و قومی تعصب کی جڑوں کو کاٹنے کے درپے رہتا ہے کیونکہ وہ مختلف اقوام میں تباہ کن مقابلے کو جنم دیتا ہے جس سے کہ ارتقائی رفتار سست پڑ جاتی ہے یہ عمل اس زمین کی مخلوق کے لئے کسی طرح بھی سودمند نہیں ہو سکتا۔ اس چیز کے قلع قمع کے لئے اسلام نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ خدا نے جب انہیں ملک عطا کیا ہے تو شکرانے کے طور پر اس کی عبادت کریں، خیرات دیں۔ المعروف کو رائج کریں۔ اور المنکر سے لوگوں کو روکیں۔ ایسے حکم کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مسلمان دوسری مملکتوں کو حرص بھری نگاہوں سے دیکھنے اور تعصب برتنے کے بجائے انہیں اپنا ہمسایہ سمجھتا ہے اور اس طرح سلطنت کے لالچ اور مذہبی تعصب کی بدولت جو جنگیں وجود میں آتی ہیں ان کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

اس کے برخلاف مغربی اقوام نے نسل و رنگ کے امتیاز کو اپنایا اور اس برتری کی آڑ میں دنیاوی حرص و ہوس کی تسکین کی اور کئی ملکوں کو غلام بنا کر لوٹا۔ پچھلی جنگوں کی بنیاد صرف یہی دنیاوی لالچ تھا جس نے کہ نوآبادیاتی اور شہنشاہی نظام کو جنم دیا اس قسم کی

---

[1] انہیں اندر مملکت میں برابر کے شہری ہونے کے حقوق کس طرح مل سکتے ہیں؟ (طلوعِ اسلام)

قومیت کو پروفیسر ارنلڈ ٹوئن بی (PROF. ARNALD TOYNBEE) مشہور تاریخ داں نے بہت بُرا خیال کیا۔ آپ نے ایک تقریر میں کہا کہ ہم صرف اسی وقت بچ سکتے ہیں اور سلامتی کی امید رکھ سکتے ہیں جب کہ دنیا میں ایک عالمگیر قومیت کا شعور بیدار ہو جائے اگر ایسا نہ ہوا تو یہ قومیت اس دنیا کو تباہی و بربادی کے عمیق ترین گڑھوں میں پھینک کر دم لے گی۔

۳۔ چونکہ اسلام عالمگیر اخوت اور پرامن تعلقات کا علمبردار ہے اس لئے اس کی اشد ضرورت ہے کہ کم از کم اسلامی ممالک جو ایک ہی عقیدہ اور تقریباً ایک ہی جیسا طرز زندگی رکھتے ہیں ایک دوسرے سے تعاون کریں اور ان اصولوں کو اپنانے کا عملی ثبوت پیش کریں۔ اگر اسلامی ممالک ان اصولوں کو اپنالیں تو ان کی مصنوعی حد بندیاں ختم ہو جائیں گی۔ اور ان کی خارجہ پالیسی ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہو جائے گی۔ ان کا باہمی تعاون صرف کانفرنسوں اور نشست و برخاست تک محدود ہو کر نہ رہ جائے بلکہ باقاعدہ تنظیم و لائحہ عمل بنا کر اس کی سختی سے پابندی کی جائے اور اسلام اور اسلامی مملکتوں کی بنیادیں مضبوط کی جائیں۔ جب تک ایسی تنظیم پہلے سے نہ کر لی جائے جو ہر دور اور ہر قومیت کے لئے موزوں ہو اس وقت تک اس کو عملی صورت دینے سے خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہو سکتے۔

**۱۴۔ حاصلِ کلام** مندرجہ بالا مضمون صرف ایک مختصر سا خاکہ ہے جو اسلامی مملکت کے مادی و غیر مادی نظریات کو پیش کرتا ہے یہ ظاہر ہے کہ اس کا تحقیقی جائزہ صرف اسی صورت میں لیا جا سکتا ہے جبکہ اس کی جزئیات کے بارے میں بھی کچھ بیان کیا جائے لیکن وقت کی کمی کے باعث ایسا کرنا ناممکن ہے۔ بہرحال ہمارے لئے یہ لازمی امر ہے کہ ہم اجتہاد سے وسیع پیمانے پر کام لیں اور قرآن و سنت کی کسوٹی کے تحت اور اسلامی اصولوں کی روشنی میں آئین مرتب کریں۔

---


# اسلامی نظام

اسلامی مملکت کے بنیادی اصول کیا ہیں؟ اور اسلامی نظام کیسے قائم ہو سکتا ہے اس کے جواب میں جناب پرویز اور علامہ اسلم جیراجپوری کے مقالات کا مجموعہ جنہوں نے فکر و نظر کے نئے راہیں کھول دی ہیں۔

۱۸۰ صفحات — قیمت دو روپے

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ کراچی

مذاکرۂ علمی اسلامی (لاہور)

# سائنس اور اسلام

از۔ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی (وائس چانسلر یونیورسٹی آف پشاور)

۱۔ یہ مختصر مضمون اس تصور کی بابت ہے جو اسلام نے سائنسی علوم کے بارے میں پیش کیا ہے۔ اس میں قرآن اور آنحضرت صلعم کی تعلیمات کا تجزیہ کرکے جدید سائنس کی اہم ترین خصوصیات سے ان کا تعلق بتانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ کوئی ایسا مضمون نہیں ہے جس میں تاریخ کی روشنی میں یہ بتایا جائے کہ مسلمانوں کا سائنس کی ترقی میں کیا حصہ ہے۔ بلکہ اس کا مقصد صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ وہ کیا تصورات تھے جو اسلام نے اپنے متبعین کو عطا کئے جن کی وجہ سے وہ علم کی تلاش میں ہمہ تن مشغول ہو گئے۔ اور انھوں نے اس کی ترقی میں حیرت ناک کارنامے انجام دیئے۔ ایسے مختصر مضمون میں یہی ممکن ہے کہ قرآن کی صرف چند آیات اور آنحضرت صلعم کے محض چند اقوال زریں نقل ہوں تاکہ نفس مطلب کو ثابت کیا جائے۔ اسی وجہ سے تفصیلی باتوں کو شامل کرنے سے بالقصد احتراز کیا گیا ہے۔

۲۔ سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ جدید سائنس کے ضروری خصائص کیا ہیں۔ تاکہ ان میں سے ہر ایک کے متعلق اسلام کا نظریہ معلوم کرنے میں آسانی ہو میرے خیال میں سائنس کی ضروری خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں۔

(الف) اول یہ کہ یہ امر مسلم ہے کہ علم اور علم کا حاصل کرنا ہر انسان کا بنیادی حق ہے۔ کم از کم نظری طور پر یہ بھی تسلیم کیا گیا ہے کہ ہر فرد بشر یہ حق رکھتا ہے کہ وہ جتنا چاہے علم حاصل کرے۔

(ب) دوسرے یہ کہ یہ بات بخوبی معروف ہے کہ سائنس مشتمل ہے تجربات، نظریات، مشاہدات اور انضباط اشیاء پر۔ سائنس کی بنیاد صرف تجربے پر ہی نہیں ہے۔ اور نہ یہ محض تعقل و تفکر کا نتیجہ ہے۔ یہ دراصل دونوں کی آمیزش کا نتیجہ ہوتا ہے۔

(ج) تیسری بات یہ کہ ساری دنیا تسلیم کرتی ہے کہ سائنس کا حیات انسانی میں بہت بڑا اور ضروری حصہ ہے۔ دراصل یہ صرف علم ہی کے باعث ہے کہ انسان اپنے آپ کو اشرف المخلوقات تصور کرتا ہے۔

اب میں یہ بیان کروں گا کہ ان تینوں اہم خصائص کی بابت اسلام کا تصور کیا ہے۔

۳۔ سب سے پہلی بات کو لیں۔ یعنی علم حاصل کرنے کا بنیادی عمومی حق۔ موجودہ زمانے میں جب کہ تعلیم عام اور لازمی ہے اور جبکہ انسان کے بنیادی حقوق ایک مسلمہ حقیقت بن چکے ہیں لوگ یہ بات بھول سکتے ہیں کہ انسانی تاریخ کے ایک بہت طویل دور میں علم حاصل کرنے پر معاشرے کے ایک مختصر سے طبقے کا اجارہ تھا۔ یہ طبقہ مذہبی رہنماؤں کا وہ گروہ تھا جس کو پادری اور کاہن جیسے مختلف ناموں سے

یاد کیا جاتا تھا۔ اس طبقہ کی خواہش تھی کہ عام لوگ غریب اور جاہل رہیں تاکہ وہ ان پر اپنی مرضی کے مطابق حکومت کر سکیں اور جس طرح چاہیں ان سے کام لے سکیں۔ یہ اصول بنا دیا گیا تھا کہ کوئی عام شخص علم حاصل نہیں کر سکتا۔ طرح طرح کی سزائیں دے کر اور عذاب اخروی سے ڈرا کر عوام کو علم حاصل کرنے سے باز رکھا جاتا تھا۔ مذہبی رہنما اپنی ان معلومات کو جو انھیں کشوف و خسوف یا دوسرے فطری عوامل کی بابت حاصل ہوتی تھیں بڑی چالاکی اور دلیری سے اس طرح کام میں لاتے تھے کہ غریب اور جاہل لوگوں پر ان کا اقتدار سلامت رہے۔

۴۔ اسلام نے مذہبی رہنماؤں کی اس مطلق العنانی کا یکسر خاتمہ کر دیا۔ اور ہر مسلمان پر یہ واجب قرار دیا کہ وہ علم حاصل کرے۔ آج شاید یہ بات ایسی غیر معمولی نظر نہ آئے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلام کا یہ اقدام جس نے علم کو ایک عوامی چیز بنا دیا اور جس کے نتیجے میں انسانی روح اور ذہن کو کامل آزادی حاصل ہوئی انسانی تاریخ کا ایسا اہم اور دور رس انقلاب تھا جو یورپ کے صنعتی انقلاب اور انقلاب فرانس سے بھی بدرجہا عظمت و اہمیت کا حامل ہے۔ اس طرح ببانگ دہل تاریخ عالم میں پہلی بار یہ اعلان کیا گیا کہ خالق اور مخلوق کے درمیان کسی درمیانی رابطے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہر فرد بشر کو یہ حق مساویانہ طور پر حاصل ہے کہ وہ خدا اور اس کی کائنات کو بلا واسطہ جان اور پہچان سکتا ہے۔ آنحضرت پر قرآن کی جو سب سے پہلی آیت نازل ہوئی اس میں آپ کو لکھنے پڑھنے کی تلقین کی گئی تھی۔

اقرأ باسم ربك الذی خلق۔ خلق الانسان من علق۔ اقرأ وربك الاكرم
الذی علم بالقلم۔ علم الانسان ما لم یعلم (۹۶۔۱۔۵)

پڑھنے لکھنے اور علم حاصل کرنے کی اہمیت اس آیت میں نہایت صاف اور موکد اور واضح طریقے سے ظاہر کی گئی ہے۔ چونکہ خدا کا حکم ماننا ہر مسلمان پر فرض ہے اس لئے آنحضرتؐ نے حکم دیا کہ علم اور علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان کا مقدس فریضہ ہے۔

طلب العلم فریضة علی کل مسلم ومسلمة (الحدیث)

نیز یہ کہ علم کا حاصل کرنا واجب ہے۔ خواہ انسان کو اس کی تلاش میں دور دراز علاقوں کا سفر اختیار کرنا پڑے

اطلبوا العلم ولو کان بالصین (الحدیث)

اس طرح ہر عام انسان نے خود پڑھنا اور خود سوچنا شروع کر دیا۔ اور یہیں سے ایک ایسے جمہوری معاشرے کی بنیاد پڑی جہاں ہر فرد کو ترقی کے مساوی مواقع حاصل تھے۔ پڑھنے لکھنے اور عام تعلیم کے متعلق اسلام کے اس نظریہ کا یہ اثر تھا کہ ساری اسلامی دنیا میں تلاش و جستجو کا شوق بہت تیزی سے پھیل گیا۔ اور بعد میں اس نے یورپ کو اس راہ پر ڈالا۔ اس طرح اسلام نے ہر انسان کو علم حاصل کرنے کی اجازت دی۔ اور اس کے لئے لوگوں میں ایک زبردست شوق و ذوق کا جذبہ پیدا کر دیا۔ یہی جذبہ آخر کار جدید سائنسی دور کا نقیب اور پیامی ثابت ہوا۔

۵۔ اب ہم سائنس کی دوسری خصوصیت کی طرف توجہ کرتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ اسلام کا سائنسی طریق کار کے متعلق کیا

نظریہ ہے۔ انسانی معاشرے کے ابتدائی دور میں انسان سطحی اور سرسری مشاہدے سے ہر شے کی بابت کوئی رائے قائم کر لیتا تھا۔ جوں جوں وقت گذرتا گیا اور شعور انسانی ترقی کرتا گیا انسان نے اپنے تجربات کو علم کی بنیاد بنانا شروع کیا۔

مگر ابھی اس کا علم پیش آمدہ واقعات کی ایک فہرست تھا اور بس۔ وہ ابھی نتائج اخذ کرنے اور پیش بینی کرنے کے مارج سے بہت دور تھا۔ اس کی معلومات بے ترتیب اور ناقص تھیں۔ استقراء و قیاس کا درجہ یونانی فلسفیوں کے عہد میں آیا۔ لیکن وہ اس معاملے میں حد درجے تجاوز کر گئے۔ انھوں نے تمام و کمال اہمیت تفکر و تعقل کو دی۔ اور مشاہدے اور تجارب کو مطلق نظر انداز کر دیا۔ انھوں نے خیال کیا کہ ایک فلسفی گھر میں بیٹھے بیٹھے محض غور و فکر کے ذریعے تمام کائنات کی بابت کلی و قطعی علم حاصل کر سکتا ہے۔

اگر مظاہر قدرت میں کوئی ایسا واقعہ ظہور میں آتا جو ان کے بنے ہوئے نظریات سے مختلف ہوتا تو وہ کہتے کہ فطرت سے کوئی غلطی سرزد ہوئی ہے۔ وہ یہ سوچ ہی نہ سکتے تھے کہ غلطی فلاسفر کے اپنے نظریات کی ہے۔ سقراط اور افلاطون نے حواس کے حسیات و مشاہدات کو استخفاف کی نظر سے دیکھا۔ کیونکہ ان کے خیال میں اس طرح سرسری رائے تو قائم کی جا سکتی ہے مگر حقیقی علم حاصل نہیں ہو سکتا۔

۲۔ اس کے برعکس قرآن نے مستقل طور پر عقل اور تجارب دونوں کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اور اس طرح سب سے پہلے یہ بات ثابت کی ہے کہ سائنس کی بنیاد تجارب اور نظریات دونوں پر ہے۔ قرآن کی بہت سی آیات میں جو جا بجا پھیلی ہوئی ہیں حقیقت کے مشاہدہ پذیر پہلو پر بہت زور دیا گیا ہے۔ میں ان میں سے صرف چند آیات نقل کرتا ہوں تا کہ مندرجہ بالا بیان پر کافی طور پر روشنی پڑ سکے۔

ان فی خلق السمٰوٰت والارض واختلاف الیل والنھار والفلک التی تجری فی البحر بما ینفع الناس وما انزل اللہ من السماء من ماء فاحیا بہ الارض بعد موتھا وبث فیھا من کل دابۃ وتصریف الریٰح والسحاب المسخر بین السماء و الارض لاٰیٰت لقوم یعقلون (۲ - ۱۶۴)

"یقیناً آسمان اور زمین کی تخلیق میں۔ اور دن اور رات کے پھیر میں اور ان جہازوں میں جو سمندر میں چلتے ہیں اور جن سے نوع انسانی کو فائدہ پہنچتا ہے اور بارش میں جو خدا آسمان سے نیچے بھیجتا ہے۔ جس سے وہ زمین کو موت کے بعد نئی زندگی عطا کرتا ہے اور جو اس نے ہر قسم کے جانور روئے زمین پر پھیلائے ہیں۔ اور ہواؤں کی تبدیلی میں اور بادلوں میں جو آسمانوں اور زمین کے مابین مسخر ہیں۔ ان سب میں ہدایت ہے۔ ان کے واسطے جو عقل سے بہرہ ور ہیں"۔

ایک دوسری آیت میں قرآن اعلان کرتا ہے۔

وھو الذی جعل لکم النجوم لتھتدوا بھا فی ظلمت البر والبحر۔ قد فصلنا الآیات لقوم یعلمون۔ (۶ — ۹۷)

"وہی ہے جس نے ستارے بنائے ہیں تمہارے لئے تاکہ تم ان سے خشکی اور تری کی تاریکیوں میں رہنمائی حاصل کرو۔ ہم نے آیات کو تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے ان لوگوں کے لئے جو علم رکھتے ہیں۔

قرآن بار بار سیاحت، مشاہدے اور تدبر پر زور دیتا ہے۔

انظروا ما فی السموت والارض

مشاہدہ کرو کہ آسمانوں میں اور زمین میں کیا کیا ہے

| | | |
|---|---|---|
| افلا ینظرون | افلا یتفکرون | افلا یتدبرون |
| کیا یہ نہیں دیکھتے؟ | کیا یہ نہیں غور کرتے؟ | کیا یہ تدبر نہیں کرتے؟ |

کا مضمون قرآن میں بار بار دہرایا گیا ہے۔ یہ آیت

"افلا ینظرون الی الابل کیف خلقت۔ والی السماء کیف رفعت۔ والی الجبال کیف نصبت۔ والی الارض کیف سطحت۔

ایک واضح حکم ہے حیوانات۔ فطرتِ حیوانات اور آسمانوں کی اور زمین کی طبعی کیفیات کے مشاہدہ کی بابت۔

۷۔ علامہ اقبال نے اپنے پہلے خطبہ میں اپنے اس نکتہ کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ وہاں سے ایک مختصر حوالہ یہاں بے محل نہ ہوگا۔ فرماتے ہیں۔

"لیکن قرآن کا یہ نظریہ خاص طور پر توجہ کا مستحق ہے کہ جس نے اسلام کے متبعین میں حقیقت نفس الامری کے احترام کا بیج بویا جس کی وجہ سے آخر کار وہ جدید سائنس کے موجد قرار پائے۔ ایک ایسے دور میں جب کہ تلاش حق کی راہ میں مشاہدات کو بیچ گردانا جاتا تھا تجرباتی روح کو بیدار کرنا بہت بڑی اہمیت کا حامل تھا۔"

۸۔ مغربی مؤرخ بھی موجودہ سائنسی طریق کار کو اب اسلامی دور کی پیداوار ماننے لگے ہیں۔ برفو نے اپنی کتاب "انسانیت کی تعمیر" میں اس کا اعتراف کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "راجر بیکن یا اس کے ہمنام کو ہرگز اس کا مستحق نہیں قرار دیا جا سکتا کہ ان میں سے کسی نے تجرباتی طریق کار سے دنیا کو روشناس کرایا۔ راجر بیکن نے صرف اتنا کیا تھا کہ اس نے اسلامی سائنس اور اس کے طریق کار کو یورپ تک پہنچایا تھا..... عربوں کا تجرباتی نظام عمل بیکن کے زمانے تک بخوبی اشاعت حاصل کر چکا تھا اور یورپ بھر میں معروف تھا۔" اس کے بعد وہ لکھتا ہے "گو یورپی ترقیات کا کوئی شعبہ بھی ایسا نہیں ہے جس میں اسلامی تمدن کے آثار قطعی طور پر نظر نہ آتے ہوں لیکن یہ نشانات اتنے زیادہ واضح اور نمایاں اور کہیں نہیں جتنے کہ قوت میں نظر آتے ہیں جو جدید دنیا کی سب سے امتیازی امر

دوامی خصوصیت اور موجودہ دور کی فتوحات میں سب سے بڑی طاقت شمار کی گئی ہے یعنی علومِ فطرت اور سائنسی روح" (ص ۱۹۱)

۹۔ قرآن کی بہت سی آیات سے جن میں سے چند اوپر نقل کی گئی ہیں اور متعدد مشرقی اور مغربی علماء کی تحریروں سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ موجودہ سائنس کی بنیاد اسلام کی ڈالی ہوئی ہے۔ تجسس کی نئی روح اور تجربات کے جدید طریقے، مشاہدات اور مساحت جن پر موجودہ سائنس کی بنیاد قائم ہے یہ سب ان افراد کے قائم کئے ہوئے ہیں جنہوں نے اسلامی تعلیمات کا اتباع کیا تھا۔

۱۰۔ آخر میں ہم سائنس کی تیسری خصوصیت پر نظر ڈالتے ہیں۔ یعنی انسانی معاملات میں اس کا حصہ اور اس کی اہمیت۔ اس امر میں اسلام کے اثر کا اندازہ اس وقت کیا جا سکیگا جب ہم اس کا مقابلہ ان حالات سے کریں جو طلوعِ اسلام کے وقت پھیلے ہوئے تھے۔

سب کو معلوم ہے کہ جتنے بھی بڑے مذاہب اسلام سے پہلے آئے ان سب نے اپنے متبعین کو یہ تعلیم دی کہ "دنیا اور معاملاتِ دنیا کو ترک کرو اور حیات بعد الموت کی فکر کرو"۔ دنیا کے مال و دولت کو نجات حاصل کرنے کی راہ میں ایک رکاوٹ تصور کیا جاتا تھا۔ ان مذاہب کے پیروؤں کو لاما۔ جوگی۔ یا راہب بننے کی تلقین کی جاتی تھی تاکہ وہ اپنی روح کی نجات کا سامان بہم پہنچا سکیں۔ چنانچہ لوگ اپنے گھر بار چھوڑ کر جنگلوں اور پہاڑوں میں جا بستے تھے۔ اور تارک الدنیا بن کر زندگی گزارتے تھے۔ اس ابتدائی طریق کار کے ہوتے ہوئے جس میں اس دنیا کو سراسر ترک کر دیا جاتا تھا لازمی طور پر اس کی کوئی گنجائش نہ تھی کہ کائنات کا علم حاصل کیا جائے۔

۱۱۔ اسلام نے یہ کہہ کر کہ لا رہبانیۃ فی الاسلام (اسلام میں جوگ۔ اور رہبانیت کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے) اس نقطۂ نظر کو سرتاسر تبدیل کر دیا۔ اسلام نے اس کے برعکس یہ تعلیم دی کہ کائنات اور مافیہا کو پوری طرح عالمِ انسانی کے مفادات کے لئے کام میں لانا چاہیئے۔ صرف یہی نہیں کہ انسان مادی ذرائع اور وسائل کی ظاہری ہیئتوں سے کام لے بلکہ یہ بھی کہ وہ فطرت کی تمام قوتوں کو فتح کرے اور ان کو مسخر کر کے اپنے کام میں لائے۔ قرآن نے واضح الفاظ میں کہا ہے کہ

وسخر لکم ما فی السموت والارض

"آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ خدا نے تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے"۔

اور یہ تسخیرِ فطرت صرف علم ہی کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔ ایک حدیثِ نبوی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلعم علم کو اپنا ہتھیار تصور فرماتے تھے۔

(العلم سلاحی) (الحدیث)

جن لوگوں کا خیال ہے کہ مشہور مقولہ "علم توانائی ہے" مغربی تصور کی پیداوار ہے انہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ تصور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اب سے مدتوں پہلے ساتویں صدی عیسوی کے اوائل میں پیش کیا تھا۔

ایک ایسے دور میں جبکہ ساری دنیا توہمات کے سمندر میں غرق تھی قرآن نے بڑی جرأت سے کہا کہ حکمت یا علم "خیر کثیر" ہے۔ اور صرف

یہی مسلمان اعلیٰ درجات کے مستحق ہیں جو علم و حکمت کے زیور سے آراستہ ہیں۔

یرفع اللہ الذین آمنوا و اوتوا العلم درجات

علم کی اہمیت پر اسلام نے اس قدر زور دیا ہے کہ آنحضرت صلعم ہمیشہ یہ دعا مانگا کرتے تھے کہ رب زدنی علماً (اے خدا مجھے اور زیادہ علم عطا فرما) قرآن نے مسلمانوں کو بار بار حکم دیا ہے کہ وہ اپنے حواس اور عقل کو پوری طرح کام میں لا کر علم حاصل کیا کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ مخلوقات عالم کا تو کیا ذکر ہے فرشتوں تک پر انسان کی برتری کی تشریح ان آیات میں کی گئی ہے جن میں صاف بتا دیا گیا ہے کہ انسانی عظمت کا راز اس میں پوشیدہ ہے کہ وہ اشیاء کی ماہیت و غایت کا کامل علم رکھتا ہے جو دوسری مخلوقات کو حاصل نہیں ہے۔ قرآن کہتا ہے:

واذ قال ربك للملئكة انى جاعل فى الارض خليفة۔ قالوا اتجعل فيها من يفسد فيها ويسفك الدماء ونحن نسبح بحمدك ونقدس لك۔ قال انى اعلم مالا تعلمون۔ وعلم آدم الاسماء كلها۔ ثم عرضهم على الملئكة فقال انبئونى باسماء هؤلاء ان كنتم صادقين۔ قالوا سبحنك لا علم لنا الا ما علمتنا انك انت العليم الحكيم۔ قال يا آدم انبئهم باسمائهم۔ فلما انبأهم باسمائهم قال الم اقل لكم انى اعلم غيب السموت والارض واعلم ما تبدون وما كنتم تكتمون (۲-۳۰-۳۳)

جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا میں زمین میں اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں۔ تو انھوں نے عرض کیا کیا تو ایسے کو خلیفہ بنائیگا جو اس میں فساد پھیلائے اور خونریزی کرے۔ درانحالیکہ ہم تیری حمد و ثنا کرتے اور تسبیح و تقدیس کرتے ہیں پروردگار نے فرمایا کہ میں وہ بھید جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے اور اس نے آدم کو تمام اسماء سکھلا دیئے پھر ان اسماء کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ اگر تم سچے ہو تو مجھے ان کے نام بتاؤ۔ فرشتوں نے کہا۔ پاک ہے تو اے رب۔ ہم کو تو سوائے اس کے جو تو نے ہم کو سکھایا ہے اور کچھ علم نہیں ہے۔ بیشک تو ہی علیم اور حکیم ہے تو پروردگار نے آدم سے کہا کہ ان کو ان اشیاء کے نام بتلاؤ۔ جب آدم نے ان کو تمام اسماء بتا دیئے تو خدا نے کہا کہ کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں آسمانوں کے اور زمین کے پوشیدہ احوال جانتا ہوں۔ اور میں وہ سب بھی جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے اور چھپاتے ہو۔

الغرض یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلام جدید سائنس کے تمام اساسی نظریات کی توثیق اور تائید ہی نہیں کرتا بلکہ دراصل اسلام ہی نے اس کی بنیاد ڈالی ہے اور اسے موجودہ رجحانات کی طرف موڑ کر اسے سیدھی راہ دکھائی ہے۔ بلکہ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ متمدن دنیا نے سائنس اور علم کے بارے میں جو رویہ اب اختیار کر رکھا ہے یہ سب اسلام کی ابتدائی تعلیم اور اسی تلقین ہی کا نتیجہ ہے۔ ان قیاسات کی اس بات سے بھی تائید ہوتی ہے کہ مسلمانوں نے شروع ہی سے تحصیل علم میں پورے پورے انہماک کا ثبوت دیا تھا اور ظہور اسلام کے بعد بہت تھوڑی ہی مدت میں مسلمان علوم و فنون کے بھی اسی طرح قائد اور پیشوا بن گئے تھے جس طرح انھوں نے سیاسیات میں قیادت حاصل کی تھی اور صدیوں لگاتار انھوں نے اس قیادت و برتری کو برقرار رکھا تھا۔

———×———

# اسلام میں ملکیتِ زمین کا مسئلہ

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی

اسلامی دنیا کے صحراؤں میں تیل کی دریافت اور اس کے استعمال سے پہلے اسلامی ممالک کی حیثیت بنیادی طور پر زرعی تھی آج بھی دنیا کے اکثر اسلامی ممالک زراعت ہی پر انحصار رکھتے ہیں۔ اس لئے اسلامی دنیا کے ہر بہی خواہ کے لئے یہ چیز بڑی اہم ہے کہ وہ کاشتکار کی حیثیت اور اس کے مالکانہ حقوق پر غور و خوض کرے۔ تقریباً سبھی اسلامی ممالک میں معاشرتی اور سیاسی مفکروں نے اس مسئلہ پر گہری توجہ دی ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں جو ترقی ہوئی وہ بہ حیثیت مجموعی معمولی سی ہے اور اطمینان بخش نہیں۔ ایسے ممالک میں جہاں کاشتکار آبادی میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہوں وہاں کاشتکاروں کی پسماندگی اور افلاس سماج کے لئے ایک ایسی لعنت بن جاتے ہیں کہ پھر ان ملکوں میں نہ خوش حالی نظر آتی ہے نہ آزادی اور نہ ترقی۔ چنانچہ ایسے ممالک میں مفاد پرست عناصر حکومت کے تمام کل پرزوں پر اس مضبوطی سے قبضہ جما لیتے ہیں کہ انہیں ان کی اس پوزیشن سے ہٹانے کے لئے سخت جد و جہد کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ عجیب بات ہے کہ ایسے مفاد پرست عناصر کی پشت پناہی بعض اوقات مذہبی حلقوں کی طرف سے کی جاتی ہے۔ اور یہ بات ہمارے موجودہ مذہبی فکر پر خواہ مخواہ اعتراض کا باعث بنتی ہے کیونکہ اسلام انفرادی یا طبقاتی استحصال کی حمایت نہیں کرتا (۱)۔ اگر ہمارے علماء نے اس بات کے سمجھنے میں تھوڑی سی بھی زحمت گوارا کی ہوتی کہ اسلام محنت کو پسند کرتا ہے اور ناانصافی کے خلاف خواہ وہ کسی شکل میں بھی کیوں نہ ہو نبرد آزما ہوتا ہے تو ایسی صورت میں ہمارے یہ علماء زرعی اصلاحات کے ہراول اور زوردار علمبردار ہوتے تاہم یہ ضروری نہیں کہ ہم زرعی اصلاحات کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر سے متعلق کسی قسم کی قیاس آرائی سے کام لیں۔ کیونکہ اسلام میں یہ بات بالکل سادہ اور صاف طور پر ظاہر کر دی گئی ہے۔

اسلام میں کاشت کار کو زمین کے مالک[۲] کی حیثیت دی گئی ہے۔ مسند امام احمدؒ میں ایک بالکل واضح حدیث ملتی ہے

---

۱ (ان حوالوں کو مقالہ کے آخر میں حواشی کے تحت دیکھئے) ۲ مالک اس معنی میں نہیں کہ وہ اس زمین کے ساتھ جو جی میں آئے سلوک کرے اسے صرف حقِ استفاع حاصل ہے اور اگر وہ اطمینان بخش طریق پر اس کی کاشت نہ کرے تو اس سے زمین واپس لی جا سکتی ہے۔ (طلوعِ اسلام)

جسے امام بخاریؒ نے بھی بیان کیا ہے۔ اس حدیث میں واشگاف لفظوں میں کہا گیا ہے کہ وہ شخص جو بنجر زمین کو قابلِ کاشت بناتا ہے، وہ اس کا مالک ہے۔ بشرطیکہ اس زمین کا پہلے کوئی مالک موجود نہ ہو۔ (۲) بعض فقہاء نے یہ طے کیا ہے کہ ایسی غیر مزروعہ اور بنجر زمین پر حقِ ملکیت قائم کرنے کے لئے امام کی اجازت لینا ضروری ہے جس پر پہلے سے کسی کا قبضہ نہ ہو (۳) اسلامی فقیہوں نے اپنے ان احکامات کی بنیاد زیادہ تر اسی حدیث پر رکھی ہے۔ ان سب میں مشہور ترین ہستی امام ابو یوسفؒ کی ہے جنھوں نے اپنی تصنیف کتب الخراج میں یہ لکھا ہے کہ ہر وہ شخص اس زمین کا مالک ہے جو اس زمین کا خراج ادا کرتا ہے۔ (۴) اسی طرح یحییٰ بن آدم القرشی نے ایک اور کتاب تالیف کی۔ اس کتاب کا نام بھی کتاب الخراج ہی ہے۔ اس کتاب میں خراج اور عشر سے متعلق قدیم ترین روایات کو جمع کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں ایک الگ باب ایسے مسائل سے متعلق ہے جو خراج کی زمین کی خرید و فروخت سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس میں ایک اور باب غیر مزروعہ اور بنجر زمین کو زیرِ کاشت لانے سے متعلق بھی ہے اور جیسا اس مقالے کے شروع سے ظاہر ہو چکا ہوگا غیر مزروعہ اور بنجر زمین کو زیرِ کاشت لانے کا مسئلہ بہت مشہور و معروف مسئلہ ہے۔ اس نقطۂ نظر میں جو بنیادی نظریہ کارفرما ہے وہ یہ ہے کہ انسانی محنت ہی سے دولت پیدا ہوتی ہے (۵) اسلامی فقہ کے بارے میں مشہور کتاب "الہدایہ" میں کہا گیا ہے کہ اگر خراجی زمین کا مالک مسلمان ہو جائے تو بھی اسے خراج ہی ادا کرنا ہوگا (۶) یہاں بھی اور بہت سی کتابوں کی طرح "مالک زمین" کی اصطلاح کا استعمال اس معنی میں ہوا ہے کہ زمین کا مالک وہی ہے جو خراج ادا کرتا ہو۔ ایسے لوگوں کے بارے میں جو غیر مزروعہ زمین زیرِ کاشت لائیں خواہ وہ مسلمان ہوں یا ذمی اس قانون کا اطلاق دونوں پر ہوتا ہے، خواہ وہ خراج ادا کرتے ہوں یا عشر۔ حقیقت تو یہ ہے کہ کاشتکار کا حقِ ملکیت تو اسلام میں اس قدر واضح طور پر مسلّم ہے کہ اس مسئلہ کو زیرِ بحث لانا بھی بعض اوقات فضول سا دکھائی دیتا ہے۔

تاہم اس سلسلے میں اس صورت میں اختلافات بھی نمودار ہوئے جب مسلمان فاتحین نے مفتوحہ ممالک کے باشندوں پر بعض خاص طریقوں کا نفاذ کیا (۷) بعض اوقات مسلمان فاتحین اور مفتوحین میں زمین کے تصرف کے بارے میں بعض سمجھوتے طے پا جاتے۔ اور کسی ایسے سمجھوتے کے وجود میں آنے پر ایسی زمین کو صلحی زمین کہا کرتے تھے۔ بعض فاتحین نے پرانے مالکوں کے حقوق ملکیت کو ختم کر کے زمین کی سرکاری ملکیت قائم کی۔ اس قسم کی زمین کو "ارض المملکۃ" کہا جاتا تھا۔ ارض المملکۃ اور خراجی زمین کی حیثیت کو امام ماوردی نے جو عباسی عہدِ خلافت کے مشہور ماہر قانون سیاست داں اور مصنف ہیں، واضح طور پر بیان کیا ہے (۸) یہ تو ہر ایک بخوبی جانتا ہے کہ امام ماوردی کا نقطۂ نظر اپنے زمانے کے حالات اور ماحول سے گہرے طور پر متاثر ہے۔ چنانچہ انھوں نے دو قسم کی خراجی زمینوں کا ذکر کیا ہے۔ اول وہ خراجی زمینیں ہیں جنھیں مسلمانوں نے بزورِ جنگ حاصل کیا ہو۔ ایسی زمینوں پر حکومت کی ملکیت قائم ہو گئی اور یہ طے پایا کہ اس زمین کی کاشت کرنے والے محض مزارع ہوں گے جنھیں ان کی محنت کے صلے کے طور پر پیداوار کا ایک حصہ ملے گا۔ دوسری قسم کی زمینیں وہ ہیں جن پر مفتوحہ آبادی کے حقِ ملکیت کو چھیڑا نہیں گیا۔ اس ضمن میں آنے والی زمینوں پر کاشت کار کے حقوقِ ملکیت برقرار رہے۔ امام ماوردی کے اس قسم کی زمینوں کے بارے

بعض اہم امتیازات کو بھی واضح کیا۔ چنانچہ ایسی زمین جس پر حکومت کی ملکیت ہو اسے کاشت کار نہ بیچ سکتا ہے نہ اسے منتقل کر سکتا ہے لیکن جن زمینوں کا مالک کاشت کار ہو، اسے یہ حقوق حاصل ہوتے ہیں۔

یہ نقطۂ نظر آج کے عہد کے نظریۂ ملکیت سے ملتا جلتا ہے چنانچہ آسٹن نے ملکیت کی تعریف یہ کی ہے: "ایک خاص چیز کا مطلقاً حق استعمال، بلا کسی پابندی کے اس پر تصرف اور غیر محدود مدت کے لئے قبضہ"۔ اسی طرح جان ڈبلیو سلیمان نے لکھا ہے کہ "کسی مادی شے کے بارے میں ہم حق ملکیت کی تعریف یوں کر سکتے ہیں کہ اس شے کو استعمال کرنے کا مستقل حق ہو اور اسے دوسرے میں دینے یا لینے کا حق بھی ہو"۔ (۱۰) اسی کتاب کے حاشیہ میں اس تعریف پر یہ اضافہ کیا گیا ہے کہ "حق انتقال و تصرف ایک ایسا بنیادی عنصر ہے جو حق ملکیت میں شامل ہوتا ہے لیکن اس کو حق ملکیت کی تعریف میں شامل کرنا یا اس تعریف کا جزو سمجھنا لازمی نہیں"۔ امام ماوردی نے ان زمینوں کے بارے میں جن پر مسلمانوں کی فتوحات کے وقت کاشت کاروں کے حق ملکیت کو برقرار رہنے دیا گیا تھا یہ وضاحت کی ہے کہ کاشت کار کو اپنی زمین پر ہر قسم کے مالکانہ حقوق حاصل ہوتے تھے۔ ایسے حالات میں ملکیت کا مسئلہ پیدا ہی نہیں ہوتا۔ کیونکہ زمین پر کاشتکار کے حقوق و مفاد کی حیثیت مستقل تھی اور اسے اس کی زمین سے بے دخل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ حکومت کے خلاف بغاوت کے جرم میں زمین کو چھینا جا سکتا تھا۔ اس حقیقت سے بعض مغربی مصنفین کو غلط فہمی ہوئی اور انھوں نے زمین پر کاشتکار کے حقوق ملکیت کے خلاف استدلال کیا ہے۔ (۱۱) لیکن یہ غلط ہے کیونکہ ہر قسم کی ملکیت یا جائداد کو کسی قانون کے ذریعے سے یا بغاوت کے دوران میں یا لڑائی کی حالت میں آج بھی بعض مملکتوں میں چھینا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ چیز ان مالکانہ حقوق سے متصادم نہیں ہوتی جو جائداد کے ضبط ہونے سے پہلے کسی کو حاصل ہوں۔ بلکہ جائداد کو ضبط کرنے کا مفہوم تو یہ ہے کہ مالکوں کے حقوق ملکیت کو ختم کیا جا رہا ہے اور ان کے بجائے حکومت خود یا اس کے نمائندے مالکانہ حقوق حاصل کر رہے ہیں۔ کیونکہ اگر مالکانہ حقوق کا وجود ہی نہ ہو تو ان سے کسی کو محروم کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جہاں تک برصغیر پاکستان و ہند میں مسلمانوں کے عہد حکومت کا تعلق ہے اس کے بارے میں میں نے ایک الگ مقالے میں بحث کی ہے اور یہ مقالہ جرنل آف انڈین ہسٹری ۱۹۴۲ء میں چھپ چکا ہے۔ (۱۲) لہٰذا یہاں اس مقالے کے استدلال اور حقائق کو دہرانا فضول دکھائی دیتا ہے۔ مسلمانوں کے برصغیر پاک و ہند پر عہد حکومت کے پورے زمانے میں وہ تمام لوگ جو خراج یا عشر ادا کرتے تھے، ان کے مالکانہ حقوق برقرار رہے۔ یہ نتیجہ مسلمانوں کے عہد حکومت سے متعلق تاریخوں، تصنیفات اور دستور العملوں اور بعض دستاویزوں پر مبنی شواہد سے اخذ کیا گیا ہے اور اس کی آئین اکبری اور عالمگیری اول کے دو مشہور زمانوں سے تصدیق ہوتی ہے (۱۳) میری رائے میں اس بات پر شبہ تک نہیں کیا جا سکتا کہ کاشت کار کے حقوق ملکیت مسلم تھے۔ عالمگیر اول کے زمانوں میں نہ صرف یہ کہ اصول کا بیان ہے بلکہ اس حالت میں بھی پیداوار کے برقرار رکھنے کے طریقوں کا ذکر ہے جبکہ زمین کے مالک کو پیداوار کے ذرائع

---

سلہ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے قرآن کی رو سے زمین پر اس قسم کا حق ملکیت کسی کا بھی نہیں ہو سکتا وہ ضرورتمندوں کے لئے کھلی رہتی ہے۔ (طلوع اسلام)

خود دیسرنہ ہوں۔ ایسی صورت میں بھی کاشتکار کے مالکانہ حقوق میں مداخلت نہیں کی جاتی تھی بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ جو طریقے اختیار کئے جاتے تھے ان سے کاشتکار کے مالکانہ حقوق کا تحفظ ہوتا تھا اور کاشتکاری کے لئے خود اس کے پاس ذرائع کی عدم موجودگی میں بھی اس کے لئے آمدنی کا ذریعہ پیدا کر دیا جاتا تھا۔ (۱۴)

اگرچہ اس برصغیر میں ادارہ ارض المملکۃ کا وجود نہیں ملتا لیکن اس کے باوجود اس پر بحث کرنے کی سخت ضرورت ہے کیونکہ یہ بہت سے اسلامی ملکوں میں اور بالخصوص سلطنتِ عثمانیہ کے بعض علاقوں میں قائم رہا۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ اس نظام میں کاشتکار کو زمین پر ملکیت کا حق نہیں ہوتا تھا اور نہ وہ زمین کو منتقل ہی کر سکتا تھا اور نہ اسے بیع ہی کر سکتا تھا اس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ کہ جہاں کاشتکار کے حق ملکیت کو تسلیم کیا جاتا تھا وہاں یہ حقوق بھی اسے حاصل تھے۔ لیکن ارض المملکت کے نظام میں مزارع کو یہ حقوق حاصل نہ تھے مگر ملکیت کے نقطۂ نظر سے اس بنیادی حقیقت کو مدنظر رکھنا ضروری ہے کہ ایسے ملکوں میں براہِ راست زمین سرکاری ملکیت ہوتی تھی۔ یعنی سرکار کے علاوہ زمین کا کوئی دوسرا مالک نہ ہوتا تھا۔ ملکیت کے مسئلے میں پیچیدگیاں اسی وقت پیدا ہوتی ہیں جب سرکار اور کاشتکاروں کے مابین درمیانی حیثیت رکھنے والا ایک ایسا گروہ پیدا ہو جاتا ہے جو زمین سے مزارعوں کو بیدخل بھی کر سکے اور ان کا تقرر بھی کر سکے۔ کاشتکار کو اپنی آئینی حیثیت اور اس کے دقائق کی چنداں پروا نہیں ہوتی جب تک اسے اپنی محنت کا مناسب صلہ ملتا ہے اور زمین پر اس کا قبضہ مستقل ہو۔ تاکہ وہ ذریعۂ معاش حاصل کرنے یا زمین کے کاشت کرنے کے سلسلے میں کسی فرد کی خواہشات کا تابع نہ ہو۔ ایسی زمینوں پر جو سرکاری ملکیت میں ہوں بحکم کرتے وقت کاشتکار کی حیثیت نسبتاً بہتر ہوتی ہے۔ اگرچہ وہ اس صورت میں بھی زمین کا مالک نہیں ہوتا اس بہتر پوزیشن کی وجہ یہ ہے کہ بالعموم حکومت کو اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی کہ وہ مزارعوں کو خواہ مخواہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتی رہے۔ بلکہ ایسی زمین پر ایک طرح سے ان مزارعوں کا حق قائم ہو جاتا ہے جو پہلے سے آباد ہوں۔ بلکہ جب کاشتکار کا حکومت سے براہِ راست تعلق ہوتا ہے تو اسے درمیانی حیثیت رکھنے والے گروہ کے ظلم و تشدد اور جبر کا شکار بھی نہیں ہونا پڑتا۔ علاوہ ان کی حالت بہتر ہوتی ہے۔ یہ درست ہے کہ اگر کاشتکار کے حق ملکیت کو تسلیم کر لیا جائے تو وہ اپنے آپ کو زیادہ محفوظ سمجھتا ہے۔ تاہم اگر زمین سرکاری ملکیت ہو تو بھی درمیانہ گروہ اسے اپنے مطالبات سے پریشان کرنے کے لئے موجود نہیں رہتا۔ کسان کی خوشحالی کا راز اسی میں ہے کہ اسے درمیانہ گروہ کے حقوق و اختیارات سے نجات حاصل رہے۔

اسلامی دنیا میں کاشتکاروں کی بدحالی کی وجہ یہی درمیانہ گروہ ہے۔ اگر اسلام کے نزدیک حق ملکیت یا تو کاشتکار کو حاصل ہے یا بعض حالات میں حکومت کو۔[1] تو پھر آج اسلامی دنیا کے بہت سے حصوں میں کاشتکار کو درمیانی گروہ کے رحم و کرم پر چھوڑ دیئے جانے کی وجہ کیا ہے۔ جو اس کی محنت سے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہو۔ اگرچہ اس سلسلے میں اسلامی دنیا کے بہت

---

[1] زمین ہر حال میں اسلامی نظام کی تحویل میں رہتی ہے (طلوع اسلام)

سے حصوں میں مختلف تاریخی واقعات اپنا اپنا کام کرتے رہے ہیں لیکن ان کے نتائج ایک ہی سے برآمد ہوئے ہیں۔ برصغیر میں برطانیہ نے اپنے ابتدائی دور حکومت میں جاگیرداری نظام کے ان تصورات کو رواج دیا اور انھیں زرعی انتظامیہ اور زمین کے حق ملکیت کے سلسلہ میں نافذ کیا جو ان کے اپنے ملک میں اب تک کسی نہ کسی شکل میں باقی تھے۔ ابتدائی یورپی سیاح اور منتظمین اس بنیادی اصول کو سمجھنے سے قاصر رہے کہ ہندوستان میں اسلامی حکومت جاگیردارانہ نہیں تھی۔ بلکہ درحقیقت وہ ایک طرح کی نوکرشاہی تھی جس میں بعض ملازموں اور خدمت گزاروں کو لگان جمع کرنے کے سلسلہ میں تنخواہیں دی جاتی تھیں۔ لیکن ایسے خدمت گزاروں کو ان علاقوں پر جہاں سے وہ لگان وصول کرتے تھے کسی قسم کے بھی مستقل حقوق حاصل نہیں تھے (۱۱) یہ فقط لگان وصول کرنے کا ایک سہل طریقہ تھا حکومت کسی کی طرف اپنے مالکانہ حقوق عارضی یا مستقل طور پر منتقل نہیں کرتی تھی۔ یہ لگان جمع کرنے والے زمین کی پیداوار میں حکومت کا حصہ جنس کی صورت میں بطور لگان اکٹھا کرتے تھے اور کوئی ایسا شخص جو اس سلسلہ میں حکومت کی نمائندگی کرتا تھا وہ صرف اس وقت تک کے لئے لگان اکٹھا کرتا تھا جب تک کہ کوئی خاص علاقہ اس کے سپرد رہتا۔ اور صرف حکومت کے لئے جنس کی صورت میں غلہ اکٹھا کرنا ہی ملازموں کے ذریعے نہیں ہوتا تھا بلکہ ریونیو کے اور شعبوں کی وصولی بھی انہی لگان وصول کرنے والوں کے یا اور نئے ملازموں کے ذریعے ہوتی تھی۔ (۱۲) اس قسم کی تحصیل زر واجب الوصول کی مقدار میں قابل ادائیگی تنخواہ کے مطابق کمی بیشی کردی جاتی تھی۔ اور جب کسی ایسے حاکم کا تبادلہ ایک علاقہ سے دوسرے میں ہوتا تو سہولت کے پیش نظر اس کے رقبہ تحصیل میں بھی تبدیلی کردی جاتی۔ اس سے ظاہر ہے کہ جہاں تک سرکاری احکام کا تعلق تھا وہ یورپ کے جاگیردار امراء سے مختلف تھے لیکن جب برطانیہ نے بنگال پر قبضہ جمایا تو انھوں نے وہاں زمینداروں کا ایک نیا طبقہ پیدا کردیا۔ اور پھر اس کے بعد کاشتکاروں کے حقوق کا تحفظ کئے بغیر ایسے زمینداروں کو بندوبست دوامی کے ماتحت مقررہ شرح پر لگان ادا کرنے کے عوض مستقل حقوق عطا کر دیئے (۱۷) یہ اقدامات کچھ تو برطانیہ نے لاعلمی کے باعث کئے کیونکہ وہ برصغیر کی زرعی انتظامیت سے ناواقف تھے اور کچھ اس لئے بھی کہ وہ شعوری طور پر ایک مفاد پرست گروہ پیدا کرنا چاہتے تھے۔ (۱۸) لیکن جب انگریز مقامی روایتوں سے کچھ واقف ہونے لگے اور انھیں کچھ تجربہ بھی ہوا تو انھوں نے اپنے طریق کار کو کچھ بدلنا شروع کیا۔ برصغیر میں آج جو حالت دکھائی دیتی ہے وہ بڑی حد تک برطانیہ کی پیدا کردہ ہے۔ بعض علاقوں میں شروع ہی سے برطانوی حکومت کا عمل نسبتاً بہتر اور حالات سے واقفیت پر مبنی تھی۔ تقسیم ملک سے پہلے بعض علاقوں میں ایسے اقدامات بھی کئے گئے جو کاشتکار کے حق ملکیت کے تحفظ کے سلسلہ میں تھے تاہم ملک کا جو حصہ پاکستان کو ملا۔ اس میں ایسے اقدامات ابھی نہیں کئے گئے تھے۔ لہٰذا پورے برصغیر میں پاکستان وہ حصہ زمین ہے جہاں نہایت پسماندہ اور نامنصفانہ حقوق ملکیت برقرار ہیں۔ مشرقی پاکستان میں تو صورت حال کو بہتر بنانے کے لئے بڑی حد تک مزروعہ زمینوں پر درمیانہ گروہ کے حقوق کو حکومت نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ پھر بھی کاشتکار کی حالت ابھی زیادہ اطمینان بخش نہیں۔ مگر شاید اس مسئلہ پر اس وقت توجہ دی جائے گی جب حکومت اس پہلے اقدام کو پایۂ تکمیل تک پہنچا چکے گی۔

مغربی پاکستان میں صورت حال انتہائی غیر تسلی بخش ہے یہ خیال کیا گیا تھا کہ اس تمام علاقہ کو ایک صوبائی وحدت

بنانے پر جاگیرداروں کے مفادات پر کچھ چوٹ پڑے گی اور ان کی حیثیت کمزور ہو گی۔ لیکن ابھی تک یہ توقعات پوری نہیں ہوئیں اور کاشت کار کی حالت ناگفتہ بہ ہی ہے۔ میاں ممتاز دولتانہ نے پنجاب میں جو زرعی اصلاحات نافذ کرنے کی کوشش کی تھی اُن سے کوئی دور رس نتائج پیدا نہیں ہو سکتے تھے۔ مگر اس کے باوجود ان پر بھی صحیح معنی میں عمل نہ ہوا۔ علاوہ بریں وہ کچھ اچھی طرح سوچی اور سمجھی ہوئی اصطلاحات نہیں تھیں اور ان کے عمل درآمد میں جو دشواریاں پیش آئیں۔ انھیں ابتدائی مراحل پر غور و فکر سے دور کیا جا سکتا تھا۔ سابق صوبہ سندھ کی صورت حال تو بدترین ہے اور کاشتکار "ہاری" کی حالت نہ صرف پاکستان بلکہ اسلام کے دامن پر بدنما دھبے کی حیثیت رکھتی ہے اور بھی بہت سے اسلامی ملکوں میں ایسے ہی حالات پائے جاتے ہیں۔ یہ سوال تعجب خیز ہے کہ ایسے ملکوں میں جہاں کسی غیر ملکی طاقت نے دخنہ اندازی نہیں کی اور روایات کا تسلسل برقرار رہا وہاں کیوں غیر اسلامی روایات اور قوانین کے ساتھ قائم کئے ہوئے زرعی نظام کی صورت مسخ ہو گئی؟ اس قسم کے حالات پیش آنے کی بہت سی وجوہات ہیں[1]

اگر ہم برصغیر پر اسلامی عہد حکومت کے حالات کی طرف نگاہ اٹھائیں تو ہم یہ دیکھیں گے کہ درمیانہ گروہ کے ظہور کے ساتھ ہی اس زرعی نظام میں پیدا ہو چکے تھے۔ ایسا کاشتکار جو خراج ادا کرتا ہو اور جو زمین کا مالک ہو وہ اپنی مرضی سے اپنی زمین کاشت کرنے میں دوسروں سے بحیثیت مزدور مدد حاصل کر سکتا ہے۔ ابتدائی عہد میں جب زمین کی فراوانی تھی اور تھوڑی سی محنت سے زمین کو زیر کاشت لایا جا سکتا تھا۔ تو زرعی مزدوروں کا حصول بہت مشکل تھا۔ لیکن جب زمین پر دباؤ اور بوجھ بڑھا اور روزگار کے دوسرے ذرائع ختم ہونے لگے تو پھر زمین کی قدر و قیمت بھی بڑھی اور اس کے ساتھ ساتھ زمین سے محروم زرعی مزدوروں کا طبقہ بھی پیدا ہو گیا۔ ابتدائی ایام میں اس قسم کا طبقہ موجود تھا۔ لیکن آبادی کے بڑھنے اور زمین پر بوجھ کے زیادہ ہونے کے باعث یہ طبقہ وسیع ہوتا چلا گیا۔ اور تجارت اور کاروبار پر مغرب کے قبضے سے اسلامی ملکوں میں بدحالی پھیل گئی۔ اس بدحالی میں یورپ کے صنعتی انقلاب اور طریق زراعت کی ترقی نے بہت اضافہ کر دیا۔ حالانکہ ان حالات کے باعث مشرق کے ذرائع پیداوار فرسودہ ہو گئے اور مشرق مغرب سے مقابلے کا نااہل ہو گیا۔ تجارت تو پہلے ہی تباہ ہوئی تھی اب صنعت کو بھی زوال ہوا۔ ادھر تو حکومت کے وسائل انحطاط پذیر ہوئے اور ادھر روزگار کے ذرائع بند ہو گئے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ زمین پر بوجھ ناقابل برداشت حد تک بڑھ گیا اور چونکہ سائنس کے میدان میں کوئی ترقی نہ ہوئی اس لئے فی ایکڑ پیداوار بھی نہ بڑھ سکی۔ دوسری طرف بعض ملکوں میں آبی وسائل میں چونکہ بہت کم ترقی ہوئی اور مزید زمین کو زیر کاشت نہ لایا گیا لہٰذا پیداوار میں کمی بڑھتی ہی چلی گئی۔ بہت سے گھرانے اپنی معاش کے حصول کے قابل نہ رہے اور جہاں آبادی میں خاصہ اضافہ ہوا وہاں زمین پر اور بھی بوجھ

---

[1] بنیادی وجہ ایک ہی تھی۔ اور وہ یہ کہ ان ممالک میں ملوکیت اور اس کے ساتھ وابستہ مفاد پرست گروہ نے قرآن کی جگہ انسانوں کی خود ساختہ شریعت کو نافذ کیا۔ یہ گروہ آج بھی اسی پر مُصر ہے۔ (طلوع اسلام)

زیادہ ہوا۔ اس طرح زمین بکنے لگی۔ چنانچہ وہ لوگ جن کے پاس پیسہ جمع کرنے کے دوسرے ذرائع تھے۔ انھوں نے اس پیسے سے زرعی زمین کو خریدنا شروع کیا۔ اس لئے ہوا کہ پیسہ لگانے کے متبادل ذرائع موجود نہ تھے۔ چنانچہ چند ہاتھوں میں زمین کے وافر خطوں کے جمع ہونے کا عمل شروع ہوا۔ ادھر کاشتکار کی حیثیت ایسے زرعی مزدور یا ایسے مزارع کی ہو کر رہ گئی جسے کسی وقت بھی بے دخل کیا جا سکے۔ چونکہ ایسے مزدوروں کو تنخواہ پر ملازم رکھنے میں کچھ کاروباری خطرات درپیش تھے۔ نیز چونکہ دیہی اقتصادیات میں سکے کا چلن عام نہیں تھا، اس لئے جاگیرداروں کا ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا جو زرعی مزدوروں کو پیداوار کا ایک حصے کے کر کام پر لگانے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ زرعی مزدور اب وقتی مزدور نہ رہے جن کو جب چاہے ہٹا دو اور جب چاہے لگا لو، بلکہ ان کی حیثیت پیداوار کے ساجھی مزارعوں کی ہو گئی۔

قرون وسطیٰ میں جب کہ اقتصادی بدحالی ابھی نمایاں شکل میں عام نہیں ہوئی تھی۔ اسلامی ممالک کے زرعی ملکوں میں درمیانی گروہ کی ملکیتِ زمین کے جراثیم کچھ اور شکلوں میں بھی موجود تھے۔ مثال کے طور پر برصغیر ہند میں مسلمان فاتحوں کو کچھ ایسے چھوٹے چھوٹے رئیسوں سے پالا پڑا۔ جن کا مختلف النوع قانونی اقتدار مقامی حلقوں پر قائم تھا (۱۹) فاتحین ان سب کو بیک وقت ختم نہیں کر سکتے تھے اور ان میں سے بعض تو کبھی بھی ختم نہ ہوئے۔ مثال کے طور پر باجگذار ریاستوں سے اسی قسم کا سلوک روا رکھا جا سکتا تھا۔ جو ان کے قبولِ اطاعت کے وقت معاہدے کے تحت طے پاتا تھا اس قسم کے معاہدوں میں مسلمان فاتحین کو کچھ ایسی مراعات ان لوگوں کو دینی پڑتیں جو انھیں مسلم فتوحات سے پہلے حاصل ہوتی تھیں۔ ان میں سے بعض کو باجگذار رئیس مطلق اپنے علاقے میں فقط اس شرط پر تسلیم کر لیا گیا کہ وہ اسلامی سلطنت کے اقتدار اعلیٰ میں مداخلت نہیں کریں گے (۲۰) ایسے راجاؤں کے ہاں ان کے اپنے طرز کے قوانین اور زرعی نظام موجود تھے اور چونکہ ان کے اور کاشتکار کے درمیان بہت سے درمیانہ طبقہ بھی موجود تھے۔ اس لئے وہ دستور کے مطابق جیسے تھے ویسے ہی رہے (۲۱) ان چھوٹے چھوٹے رئیسوں کے تحت جو علاقے ہوتے ان میں وہ عوام کے قائد بھی مانے گئے کیونکہ عوام خاندانی اور قبائلی اثرات سے ان کا وفاداری کے ساتھ کہنا مانتے تھے (۲۲) اس کے علاوہ یہ لوگ مقامی رسم و رواج اور پیداوار کی کیفیت سے پورے پورے ماہر بھی ہوتے تھے اور اس لئے بعض مجموعی فرائض کو انجام دینے کے لئے حکومت کی طرف سے انھیں اختیارات بھی دیئے جاتے تھے (۲۳) اگر وہ اپنے فرائض کو ادا کرنے میں کوتاہی سے کام لیتے تو انھیں سزائیں بھی دی جاتیں (۲۴) تاہم یہ لوگ بہت کچھ اختیار رکھتے تھے اور بدامنی اور مرکزی حکومت میں کمزوری آجانے کے باعث ایسے ایسے رعایتی حقوق حاصل کر لیتے تھے جن کے زمانہ امن میں حکومت ان کے چھین لینے کے لئے فکرمند رہتی (۲۵) ان میں ایک چیز یہ بھی تھی کہ انھیں کاشتکار کو لوٹنے کی آزادی حاصل رہے۔ ان لوگوں کی ایک عام عادت یہ تھی کہ وہ کاشتکاروں میں وہ رقوم تقسیم کر دیتے تھے جو انھیں حکومت کو ادا کرنی چاہیئے تھیں (۲۶) لیکن جس وقت حکومت انتظامیہ مضبوط تر اور مستعد رہتی تو اس قسم کی بدعنوانیوں سے انھیں روکا جاتا تھا۔ اٹھارویں صدی میں جب ایک منظم حکومت کی جگہ انتشار اور ابتری نے لے لی تھی تو یہ بدعنوانیاں نہ صرف یہ کہ زندہ ہو گئیں بلکہ ہر مقامی سردار نے

اپنی طاقت کو مضبوط تر بنا لیا۔ منجملہ ان کے کہ رئیسوں اور قائدوں نے کچھ ایسے اختیارات حاصل کر لئے جو قانونی طور پر انہیں حاصل نہ ہو سکتے تھے۔ بنا بریں برصغیر میں درمیانہ گروہ کے نمودار ہونے کی وجہ بڑی حد تک مرکزی حکومت کا انحطاط اور برطانیہ کی جانب سے ہندوستان کے زرعی نظام کو غلط طور پر سمجھنا، اس حادثہ کا اسلام کے نظریۂ ملکیت اور اصولِ حکومت سے کوئی واسطہ نہیں۔ دیگر مسلم ممالک میں یہ حادثہ ملک گیر تجارت اور صنعت کی بدحالی کے باعث پیدا ہونے والے اقتصادی بحران کی وجہ سے پیدا ہوا۔ اسلام ایک ایسے زرعی نظام کا طرفدار نہیں ہے جس میں مزارعین اپنے روزگار کے لئے زمیندار یا جاگیردار کے رحم و کرم پر ہوں اور پھر ایسے جاگیردار جو بعض صورتوں میں ان مزارعوں کو ابتدائی شہری حقوق تک دینے کے لئے تیار نہ ہوں۔

نامنصفانہ زرعی نظام قوموں اور ان کی سیاسیات کو جو صدمہ پہنچاتا ہے، اس کے بارے میں جتنا بھی کہیں مبالغہ نہ ہوگا کسی ملک میں قانون جس شے کی اجازت دیتا ہو ضروری نہیں ہے کہ وہ منصفانہ بھی ہو۔ کیونکہ جس طرح قانون منصفانہ ہوتے ہیں، اسی طرح نامنصفانہ بھی ہو سکتے ہیں۔ بہرحال اکثر تو یہی ہوتا ہے کہ قوانین کسی قوم میں برسر اقتدار گروہ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اور یہ گروہ مزدور کو دبا کر نہ صرف انھیں نقصان پہنچاتا ہے بلکہ پوری قوم کو لے ڈوبتا ہے۔ اسلامی ملکوں میں اکثر یہ ہوا ہے کہ جاگیرداروں نے زرعی اصلاحات کی کوششوں کو ناکام بنا دیا ہے۔ اقتصادی نظام کے حلقۂ عمل میں یہ بات ظاہر اور ثابت ہو چکی ہے کہ کسی ملک میں ایک ایسے لیڈر طبقہ کا پیدا ہو جانا اور پھر اس کا برقرار رہنا جو قوم کی کوئی سودمند خدمات سرانجام نہ دیتا ہو، بجز خطرناک ہونے کے اور کچھ نہیں۔ یہ ایک قسم کے موذی لیڈر ہیں جو اقتصادیات کے لئے بھی ویسے ہی تباہ کن ہوتے ہیں۔ جیسے کسی اور زندہ نظام کے لئے۔ جہاں تک کسان کا تعلق ہے اُسے جب تک اپنی ملکیت کے مستقل تحفظ پر بھروسہ نہ ہو[1] اس وقت تک وہ پوری محنت سے کام نہیں کرے گا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ زرعی پیداوار بڑھنے کے بجائے متواتر گھٹتی چلی جائے گی۔ بڑے بڑے جاگیرداروں کو اتنی بھاری آمدنی ہو جاتی ہے کہ انھیں پیداوار کو بہتر بنانے سے کوئی دلچسپی ہی نہیں ہوتی۔ محض نظریاتی سطح پر تو یہ دلیل پیش کی جا سکتی ہے کہ پیداوار میں اضافہ جاگیردار اور مزارعہ دونوں کے لئے یکساں طور پر مفید ہے۔ لیکن یہ بھی ہوتا ہے جب جاگیردار بھی روشن دماغ ہو اور مزارع بھی۔ لیکن یہ روشن دماغی ہی وہ چیز ہے۔ جو ایسے ماحول میں سب سے زیادہ ناپید ہوتی ہے۔ روشن دماغی۔ تقاضا۔ مفادات میں اشتراک[2] شریک کا احترام ہوتا ہے۔ مگر یہ چیز اسی صورت میں ممکن ہے جب یہ رشتہ انصاف پر مبنی ہو۔ چنانچہ سندھ اور پنجاب کے بعض حصوں میں پیداوار کے گرنے کی وجہ یہ ہے کہ نہایت بے رحمی سے مزارعوں کا حق دبایا جاتا ہے۔ ہم اپنی آنکھوں سے گرتی ہوئی پیداوار کو دیکھ رہے ہیں۔ چونکہ زمین سے مفت آمدنی کا چسکا پڑ گیا ہے۔ جس میں کچھ بھی محنت نہیں کرنی پڑتی اس لئے زمین کے حصوں پر چھینا جھپٹی ہو رہی ہے۔ محض اس لئے کہ زمین کو جھپٹ لینے کے شوقین لوگ ایک دوسرے سے اپنے اپنے حصے کے بارے میں متفق نہیں

---

[1] اس کا پورا پورا تحفظ (قرآن کی رو سے) اسلامی نظام کے ذمے ہوتا ہے (طلوع اسلام)

ہو سکتے۔ آب پاشی کے بعض منصوبوں کی تکمیل کے باوجود زمینوں کی الاٹ منٹ کا کام رکا پڑا ہے۔ زمین کو ٹیکس ادا کرنے والے شہریوں کے پیسے سے ترقی دی جاتی ہے۔ لیکن ٹیکس ادا کرنے والے کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا کہ حفاظت در گردہوں کی ہوس حصولِ زمین کو تسکین ہی نہیں پاتی۔ جن ملکوں میں آبادی کی اکثریت مفلس زراعت پیشہ لوگوں پر منحصر ہو ان کی عام قوتِ خرید کم ہوتی ہے۔ چند ہاتھوں میں ملک کے محدود ذرائع پیداوار کے مجتمع ہو جانے کے باعث صنعتی طور پر ترقی یافتہ ملکوں سے درآمد کئے ہوئے قیمتی سامان کی منڈی تو پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن اس سے وسیع بنیادوں پر قائم ہونے والی گھریلو صنعت کو کچھ مدد نہیں ملتی۔ اگر ملک کی آبادی زیادہ ہو تو ناقص زرعی نظام اور پیداوار کی طرف سے جاگیردار اور مزارع دونوں کی عدم توجہی غلے کی قلت پر منتج ہوتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قابلِ قدر زرِ مبادلہ غلے کی درآمد پر صرف ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ضرورت سے کم خوراک ملتی ہے بلکہ فاقوں تک نوبت پہنچتی ہے۔ انسانی محنت کا زیاں ہوتا ہے کیونکہ ذرائع پیداوار سائنسی ترقی سے مطابقت نہیں رکھتے۔ اور نیم بیروزگاری کی حالت پیدا ہو جاتی ہے جو کھلی بے روزگاری سے بھی بدتر ہوتی ہے۔ کیونکہ اول تو اس کا پتہ نہیں چلتا دوسرے اس سے اس حد تک محرومی کا احساس بیدار نہیں ہوتا جو نئے ذرائع کی تلاش میں مددگار ثابت ہو۔

عام آبادی اور خوشحال طبقوں کی معاشرت میں اس قدر تفاوت پیدا ہو جاتا ہے کہ یہ باور کرنے میں کچھ دقت ہی پیش آتی ہے کہ وہ ایک ہی قوم یا ایک ہی نوعِ انسانی سے تعلق رکھتے ہیں۔ انسانیت کی تذلیل ہوتی ہے۔ اور انسان جانور کی سطح پر آگرتا ہے۔ اسلام نے اخوت المسلمین اور نوعِ انسانی کی عزت و احترام کا جو سبق دیا تھا اسے فخر و غرور کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے اور یوں اسلامی بھائی چارے کا جامہ پارہ پارہ ہو جاتا ہے۔

امورِ سیاست میں اس تفاوت کے باعث جو بدعنوانیاں پیدا ہوتی ہیں۔ ان سے انصاف کی عمارت زمین پر آگرتی ہے اور ہر طرف بدکرداری کا دور دورہ ہوتا ہے۔ دولت والے چند لوگ سرکاری ملازمین کو فرض شناسی سے غافل کر دیتے ہیں اور ملک کی انتظامیہ میں رشوت، خویش پروری، جانب داری، کنبہ پروری اور ناانصافی پھلتی پھولتی ہے۔ کیونکہ چند دولتمند لوگوں کو خوش کرنے کے لئے حکام ہر قسم کے جرم کر گزرتے ہیں اور کام اور استعداد کار کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ پھر ایسی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے کہ بغیر اثر و رسوخ کے وسیلے کے کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ صنعت کار طبقہ اور دوسرے طبقے استعداد کار اور وقت پر کام کی ضرورت کو سمجھتے ہیں۔ لیکن ایک جاگیردار ان چیزوں کی اہمیت نہیں جانتا۔ کیونکہ اس کے طریقہ ہائے کار شین کی استعداد کار سے اتنے زیادہ دور ہوتے ہیں کہ وہ استعداد کار کی ضرورت کو سمجھنے سے قاصر رہتا ہے۔ پھر اس کا رویہ اور طرزِ حیات اصولوں سے کچھ اس قدر ہٹا ہوا ہوتا ہے، کہ وہ سمجھ ہی نہیں سکتا کہ انتظامیہ کو کچھ قواعد و ضوابط کے ماتحت چلنا چاہیئے۔ لہٰذا وہ قواعد و ضوابط کو اپنے اثر و رسوخ سے نظر انداز کرتے ہوئے لاقانونیت پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈکٹیٹرشپ کھلے طور پر یا مخفی انداز میں انہی جگہوں پر پیدا ہوتی ہے جہاں جاگیرداروں کو من مانی کرنے کی کھلی آزادی ہوتی ہے۔

صنعتی سرمایہ کے وسائل بڑے وسیع ہوتے ہیں[1] اور ان وسائل سے وہ انتظامیہ اور حکومت کو بے اصولی کے راستے پر چلا سکتا ہے اور چلاتا بھی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس کا طریق کار زیادہ پُرفریب و سیاست آمیز ہوتا ہے۔ اور اس کے معیار جاگیرداری کی سطح تک نہیں گرنے پاتے۔ یہ بھی ہے کہ سرمایہ دار کم از کم امن و امان کو اس حد تک برقرار رکھنا چاہتا ہے جس حد تک جاگیردار نہیں رکھتا۔ جاگیردار سیاسیات میں جو بے اصولی پیدا کرتا ہے۔ اس کی بدترین شکل یہ ہے کہ وہ انتخابات کو اپنی مرضی کے مطابق کرا لیتا ہے۔ اس کا اپنے مزارعوں پر اقتدار اس قدر زیادہ ہوتا ہے کہ وہ انہیں دھمکی، دھونس اور دھاندلی کے ذریعے ہر بات منوا سکتا ہے اور طاقتور ہونے کی وجہ سے مقامی حکام کو دبا کر ان سے کام لیتا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ اصول و عقائد پر چلنے والے کسی بھی سیاسی کارکن کے لئے یہ ناممکن ہو جاتا ہے کہ وہ انتخاب میں کامیاب ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اثر اور طاقت کے ذریعے جاگیردار اکثر منتخب ہو جاتے ہیں۔ جس کا لابدی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انھیں رائے عامہ کا کچھ بھی احترام نہیں رہتا۔ جس قسم کی پالیسی وہ چاہیں اختیار کر سکتے ہیں۔ خواہ وہ ملک سے غداری ہی کیوں نہ کریں۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنے حلقوں سے دوبارہ منتخب ہو جاتے ہیں۔ اور سازش اور جوابی سازش کا کھیل بغیر کسی جواب دہی کے خوف کے کھیلتے رہتے ہیں۔ چنانچہ جمہوریت ایک کھیل بن جاتی ہے اور حکومت کا استحکام ختم ہو جاتا ہے۔ راتوں رات وہ اپنی پالیسیوں اور اصولوں کو بدل دیتے ہیں اور حکومتوں کی تشکیل کرتے ہیں یا انہیں توڑتے ہیں اور یہ سب کچھ اصولوں کی خاطر نہیں بلکہ اپنے آپ کو برسر اقتدار رکھنے کی خاطر کیا جاتا ہے اور اقتدار سے وہ اس لئے چمٹے رہنا چاہتے ہیں کہ اپنے خود غرضانہ اور قابل نفرت مقاصد کو پورا کرتے رہیں۔ پاکستان کی بعض صوبائی اسمبلیوں کی تاریخ ان باتوں کی شہادت پیش کرتی ہے۔ جس قدر کسی اسمبلی میں جاگیرداروں کا زیادہ قبضہ ہوتا ہے، اسی قدر اس کا ریکارڈ بھی زیادہ خراب ہوتا ہے۔ خود مرکزی حکومت میں پہلے وزیراعظم کے برملا قتل کے بعد سے اسی قسم کے رجحانات کارفرما ہیں۔ ان رجحانات سے پردہ اس وقت اٹھا جب خواجہ ناظم الدین کی حکومت معزول کر دی گئی۔ ایک اور مسلم ملک میں سیاسی زندگی کی بدعنوانیوں کی بیخ کنی کے لئے بادشاہ کو تخت سے اتارنے اور انقلاب برپا کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ایک اور ملک میں یہ حالت ہے کہ زمین کی ملکیت کا نظام کچھ ایسا ہے کہ حکومت خواہ کتنی ہی غیر مقبول کیوں نہ ہو اس کا دوبارہ برسر اقتدار آنا یقینی ہے کیونکہ دیہاتی علاقوں میں مقامی لیڈروں کو بہت قلیل عرصے کے لئے زرخیز زمین پٹہ پر دی جاتی ہے۔ لہٰذا اگر ایسے لیڈروں کو زمینوں پر قبضہ رکھنا مقصود ہو تو لامحالہ انھیں اپنا ووٹ اسی کو دینا پڑے گا جس کے لئے انہیں ہدایت کی گئی۔ یہ چیزیں صحت مندانہ سیاسی پالیسیوں کی علامت نہیں۔ اگرچہ ایسی پالیسیوں میں اور بھی بہت سے نقائص موجود ہیں۔ لیکن دراصل یہ زمین کی ملکیت کا نظام ہے جو ملک میں پسماندگی اور دھاندلی کا باعث ہے۔ یہ ایک ایسا مرض ہے جو اسلامی ملکوں کے لئے بربادی

---

[1] جو خرابیاں زمینداری اور جاگیرداری کی ہیں۔ اسی قسم کی خرابیاں صنعتی سرمایہ داری کے اس نظام کی بھی ہیں جس کی رو سے سرمایہ دار کو بے حد و نہایت "دولت کا مالک قرار دیدیا جاتا ہے۔ (طلوع اسلام)

کا سبب ہے۔

ان تمام مذکورہ باتوں کے مان لینے کے بعد یہ سوال رہ جاتا ہے کہ آخر اس کا علاج کیا ہے؟ اس بات میں کسی قسم کے شک کی گنجائش ہی نہیں ہے کہ مرض کا مؤثر علاج "درمیانے گردہ" کا خاتمہ کر دینا ہے۔ لیکن اس راہ کے اختیار کرنے میں کچھ دشواریاں بھی ہیں۔ سب سے بڑی رکاوٹ تو جاگیرداروں کی طاقت ہے۔ اس خود غرض طبقے کا طرزِ عمل ہی بعض ملکوں میں خونی انقلاب اور بغاوت کا باعث بنا۔ یہ علاج بڑا انتہا پسندانہ ہے۔ اور اس سے کچھ ایسی قوتیں بروئے کار آجاتی ہیں جن پر قابو پانا مشکل ہوتا ہے۔ اس کے ذریعے آمریت کا قیام عمل میں آتا ہے جو بعض اوقات پہلے سے بھی زیادہ یا اسی حد تک بے رحمی سے عوام کا کچومر نکال دیتا ہے۔ اس کے علاوہ صحیح یا غلط تاریخی طور پر بعض ایسے حقوق پیدا ہو چکے ہیں جن کی نوعیت انتقادی ہے۔ ایسے حقوق کو مناسب معاوضے کے بغیر ختم نہیں کیا جا سکتا اور ان کے بارے میں جلد بازی ہی سے کام لیا جا سکتا ہے۔ اگر ذاتی جائداد یا ملکیت کو انتہا پسندانہ طریقے سے چھین لیا جاتا ہے تو اس سے ملک میں عدم اعتماد بھی پیدا ہوتا ہے اور بعض اور دشواریاں بھی جنم لیتی ہیں۔ مسلمانانِ عالم جب ذاتی ملکیت کے حق کے احترام کا سوال اٹھاتے ہیں تو وہ کوئی غلط بات نہیں کہتے۔ جاگیرداروں سے ان کے حقوق لئے جانے تو چاہئیں لیکن ان کی قیمت کون ادا کرے گا۔ اور وہ قیمت کہاں سے آئے گی۔ اگر حکومت مناسب معاوضہ ادا کرتی ہے تو پھر اس صورت میں ٹیکس ادا کرنے والوں کو یہ قیمت ادا کرنی پڑیگی سوال یہ ہے کہ کیا ایسا کرنے سے ٹیکس ادا کرنے والوں کو مناسب فائدہ بھی پہنچے گا۔ مالیاتی نقطۂ نظر سے فیصلہ کرتے ہوئے اس چیز کا جانا اس بنا پر مبہم ہو جاتا ہے کہ ایسا کرنے سے ٹیکس ادا کرنے والوں کو بہت سے بالواسطہ فوائد حاصل ہوں گے لیکن اگر اس چیز سے کوئی براہِ راست فائدہ نہ پہنچے تو ایسی صورت میں ٹیکس ادا کرنے والوں کو اپنے لگائے ہوئے پیسے سے منافع حاصل کرنے کے لئے بہت دیر تک انتظار کرنا پڑے گا۔ پھر اس صورت میں بھی منافع شاید نہ مل سکے۔ اگر کاشتکار کی حالت میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہو۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ ممکن نہیں کہ کوئی ایسا لائحہ عمل اختیار کیا جائے جو مناسب بھی ہو اور قابلِ عمل بھی۔

اس قسم کے انتظام کی ضرورت اس لئے پیدا ہوتی ہے کہ غالباً قانونِ مزارعت جیسے کم تر قوانین سے حسب دلخواہ نتائج پیدا نہیں ہو سکتے کیونکہ ایسے قوانین جاگیرداروں کی مداخلت سے بے اثر ہو کر رہ جاتے ہیں۔ پھر اس کے ساتھ ہی یہ بنیادی اعتراض بھی قائم رہتا ہے کہ کاشتکار کا معیارِ زندگی اس حد تک بلند نہیں ہوتا کہ وہ زیادہ ترقی یافتہ ذرائع سے مستفید ہو سکے۔ لہٰذا کاشتکاروں کو یہ ہدایت کرنی چاہیئے کہ وہ جاگیردار یا زمیندار کے حقوق حاصل کریں اور اس عمل کو کامیاب بنانے کے لئے حکومت کو ایک دیانت دار دلال کی حیثیت اختیار کرنی چاہیئے۔ حکومت کو سب سے پہلے زمین کی مناسب قیمت مقرر کرنی چاہیئے اور اس قیمت کو سالانہ قسطوں کی شکل دینا چاہیئے۔ مثلاً قیمت کی ادائیگی کی مدت بیس سال تک ہونی چاہیئے۔ یہ چیز جاگیرداروں کے لئے اتنا وقت ضرور مہیا کر دے گی کہ وہ نئے نظام کے لئے اپنے آپ کو تیار کر لیں ادھر

کاشتکار کو چاہیئے کہ وہ باقاعدہ طور پر سالانہ لگان کے ساتھ ان قسطوں کو ادا کرے۔ یہ قسطیں اس انداز سے مقرر ہونی چاہئیں کہ کوئی بھی قسط نقد قیمت کے لحاظ سے اس مقدار سے نہ بڑھے جو زمیندار پیداوار میں سے اپنے حصہ کی حیثیت سے وصول کرتا ہے۔ اس صورت میں کاشتکار پر بوجھ نہیں پڑے گا کیونکہ اسے اتنی قیمت ادا کرنی ہوگی جتنی کہ وہ پہلے کر رہا ہے۔ اس مدت میں بھی جب کہ وہ قسطیں ادا کر رہا ہوگا وہ پہلے سے نسبتہً بہتر حالت میں ہوگا۔ کیونکہ اس کا قبضہ محفوظ ہوگا اور وہ اپنے آپ کو زمین کا مالک سمجھنا شروع کر دے گا۔ قوم کو بھی اس صورت میں فائدہ ہوگا۔ کیونکہ کاشتکار زمین اور پیداوار کو بہتر بنانے کی زیادہ کوشش کرے گا۔ بہت تھوڑی دیر میں پیداوار بہتر ہو جائے گی اور لگاتار اس میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ حکومت کو جاگیردار کو یہ ضمانت دینا چاہیئے کہ اسے اس کی زمین کی منصفانہ قیمت ملے گی۔ پھر اس کے ساتھ ہی ساتھ انشورنس کی ایسی اسکیم جاری کی جانی چاہیئے کہ جب فصل خراب پیدا ہو اور کاشتکار ناگزیر اور اپنی قدرت سے باہر حالات کی بنا پر قسطوں کو ادا نہ کر سکے تو حکومت کاشتکار سے وصول کردہ قیمت کی تدریجاً کم تر مقدار ہر سال جاگیردار کو نقدی کی صورت میں دے اور باقی مقدار کو ایسی صنعتوں کے حصوں اور تمسکات کی صورت میں ادا کرے جو مستحکم ہوں۔ تاکہ ابتدائی مشکلات پر قابو پانے کے بعد جاگیردار ملک کی ترقی میں حصہ لے سکے۔ اور صنعتی پیداوار کے ثمر سے بہرہ اندوز ہو سکے۔ کسانوں سے وصول ہونے والی کل سالانہ رقم بعض علاقوں کے موجودہ لگان کی رقم سے کہیں زیادہ ہوگی۔ اس رقم کو مفید اور تعمیری منصوبوں میں لگایا جا سکیگا اور اول درمیانہ درجے کے گروہ کے زمین سے متعلق حقوق کو ختم کرنا مجموعی طور پر فائدہ مند ہوگا۔[۱]

جاگیرداری کو ختم کرنا ہی ایک ایسا کام نہیں جو ضروری ہے بلکہ اس قسم کے سوالات بھی درپیش ہیں کہ ایک شخص یا ایک کنبے کو بیک وقت کس زمین پر قابض ہونا چاہیئے۔ یہ اس لئے ضروری ہے کہ اگر ہم جاگیرداری کی برائیوں کو ایک نئی شکل میں ابھرنے سے روکنا چاہتے ہیں تو اس کا بھی انتظام ہو کہ پیسے والے لوگ زمین خریدنے نہ پائیں۔ اس کے علاوہ چھوٹے چھوٹے قطعہ ہائے زمین کو امداد باہمی کی انجمنوں اور قانون سازی کے ذریعے مجتمع کیا جا سکتا ہے لیکن ان مسائل کا براہ راست زمین کے ملکیتی حق سے کوئی تعلق نہیں ہے اس لئے میں ان پر کسی قسم کی رائے زنی سے اجتناب کرتا ہوں۔[۲]

یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ کیا عوامی مفاد کے لئے جبراً ملکیتی حقوق کو مالک کی مرضی کے بغیر چھین لینے کی اسلام میں اجازت ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام ملکیت کے ایسے غیر محدود نظریے کو تسلیم نہیں کرتا جو کسی فرد سے ناانصافی پر مبنی ہو اور جو عوامی بہتری کے خلاف ہو۔ بلکہ ملکیت کے غلط استعمال سے اگر معمولی سا نقصان بھی پیدا ہو تو اسلام اس کی بھی اجازت نہیں دیتا۔ قرون وسطیٰ میں حسبہ (محتسب) کا شعبہ اس بات پر پوری توجہ رکھتا تھا اور نہ صرف یہ کہ وہ ناجائز استعمال کا تدارک کرتا تھا بلکہ ایسے لوگوں کو سزائیں بھی دیتا تھا جو اپنی بداعمالیوں پر اصرار کریں (۲۷) تاہم ان ملکوں میں جہاں زمین ارض المملکت تھی (یا

---

۱؎ کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک؟ (طلوع اسلام) ۲؎ ان دشواریوں کا حل قرآن کے نظام اراضی میں ہے جس کی رو سے زمین ملت کی اجتماعی تحویل میں رہتی ہے۔ سوال صرف زمین کے مناسب انتظام کا ہے نہ کہ ملکیت کا۔ (طلوع اسلام)

ایسے قانونی مسائل پیدا نہیں ہوئے تھے۔ کیونکہ ملکیت کا جھگڑا موجود ہی نہیں تھا۔ برصغیر ہند و پاکستان میں انگریزوں نے اس نظریہ کی تردید کی کہ زمین کی ملکیت کا حق حکومت کو حاصل ہے (۲۸) اس تبدیلی کو لوگوں نے آسانی سے قبول کر لیا کیونکہ اس میں ہمیں کسی قسم کے احتجاج کی مثال نہیں ملتی۔ اس لئے حکومت کی تبدیلی اور مسلمانوں کے ہاتھ سے طاقت کے چلے جانے کے باعث قدیم تر نظریے کو اب درست نہیں قرار دیا جا سکتا کیونکہ حکومت بجا طور پر یہ کہہ سکتی ہے کہ وہ زمین پر قبضہ جمانا نہیں چاہتی بلکہ کچھ ایسے حقوق حاصل کرنا چاہتی ہے جو اس کی پالیسیوں کی وجہ سے پیدا ہو گئے ہیں اور جنہیں قانون کے ذریعے بدلا نہیں جا سکتا (۲۹) لہٰذا حکومت پر الزام عائد نہیں ہوگا کہ وہ مالکوں کی مرضی کے بغیر زمینوں پر قبضہ کرنا چاہتی ہے بلکہ وہ تو درمیانہ گروہ کے حقوق کو حاصل کرے گی اور مناسب معاوضہ دے کر ایک ایسی چیز کو واپس لے گی۔ جو اس نے خود عطا کی تھی۔ تاہم یہ سب کچھ ایک عقیدت ہے کیونکہ کوئی حکومت حقوق ملکیت کو اس قدر مضبوط اور ناقابل شکست نہیں سمجھتی کہ مناسب معاوضے کو جسے کسی آزاد حکم نے طے کیا ہو ادا کرے وہ ان حقوق کو حاصل نہ کر سکے۔ میرے خیال میں ملکیت کا یہ تصور اسلام کی روح کے منافی نہیں ہے۔ ایک اسلامی حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ ایسے حقوق کو ختم کرے یا انھیں چھین لے جو پوری قوم کے لئے نقصان دہ ہوں[1] کسی ایک مہذب نظام آئین میں جائداد اسی حد تک محفوظ ہے کہ اسے مناسب معاوضے کے بغیر چھینا نہیں جا سکتا۔ اسلامی قوانین اس سلسلے میں استثنیات کی حیثیت نہیں رکھتے۔ فقیہوں نے اس بات کو تسلیم کیا ہے۔ مثال کے طور پر اگر فوج جہاد پر جا رہی ہو تو اس کے راستے میں کھیتوں کی کھڑی فصلیں اس کو گزرنے سے نہیں روک سکتیں اور انھیں تباہ یا ضائع کر دیا جائے گا۔ اس کے لئے جو شرط لازمی ہے وہ یہ ہے کہ زمین کے مالک کو مناسب اور منصفانہ معاوضہ دیا جائے یہ نہیں ہو سکتا کہ فوج آگے بڑھنے سے رک جائے صرف اس لئے کہ مالک اپنے حقوق ملکیت کے قلعے میں اس قدر محفوظ ہے کہ وہ ایک جائز اور صحیح نصب العین کے لئے لڑنے والی فوجوں کو آگے بڑھنے سے روک سکتا ہے (۳۰) یہ درست ہے کہ ملکیتی حقوق کو صرف اسی وقت چھیڑنا چاہیئے کہ جب ایسا کرنا مفاد عامہ کے لئے ضروری ہو۔ لہٰذا درمیانی گروہ کے حقوق کو چھین لینے کے لئے کوئی قانونی رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ایک اسلامی حکومت پر یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ وہ اس قسم کے حقوق حاصل کرے۔

# حواشی

۱۔ کراچی کے ایک مسلمان عالم کی طرف سے ایک پمفلٹ شائع ہوا تھا جس میں یہ کہا گیا تھا کہ شریعت کی رو سے جاگیرداروں کے حقوق ختم نہیں کئے جا سکتے۔ اسلامی آئین کی اس ترجمانی پر کچھ سنجیدہ توجہ نہیں کی گئی۔ بلکہ بڑی سختی سے اس پر نکتہ چینی کی گئی جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان عوام کے جذبات اس بارے میں بالکل صحیح ہیں۔

---

[1] بالکل (طلوع اسلام)

۲۔ اس روایت کو محدثین کے نزدیک مستند سمجھا جاتا ہے اور اسے بہت سے مصنفوں نے زمین کے ملکیتی حقوق، خراج اور عشر کے سلسلہ میں استعمال کیا ہے۔

۳۔ یہاں ابوالفضل کی آئین اکبری حصہ دوم کے ۱۸۷۳ء کے کلکتہ ایڈیشن کے صفحہ ۲۹۳ کا ذکر ہے اور اسی موضوع پر کچھ اور دوسری کتابوں کا۔

۴۔ کتاب الخراج مصنفہ امام ابو یوسف مطبوعہ قاہرہ ۱۳۰۲ھ صفحہ ۳۵۔ ۳۸۔

۵۔ قاہرہ ۱۳۴۷ھ۔

۶۔ اردو ترجمہ نور الہدایہ ۱۳۱۰ھ مطبوعہ کانپور صفحہ ۳۵۳۔

۷۔ آئین اکبری صفحہ ۲۹۴۔ تاہم اس اصطلاح کا استعمال بالعموم نبی نجران اور بنو تغلب کی زمینوں کے بارے میں کیا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جن شرائط پر ان سے معاملے ہوا وہ آئندہ کے لئے مقررہ بن سکتی ہیں۔

۸۔ اردو ترجمہ احکام السلطانیہ مطبوعہ حیدر آباد ۱۹۳۱ء صفحہ ۲۴۲

۹۔ آسٹن حصہ دوم صفحہ ۷۹۰

۱۰۔ قانون مصنفہ جان ڈیلیو، دوسرا ایڈیشن مطبوعہ ۱۹۰۷ء صفحہ ۳۹۵

۱۱۔ اس سوال پر سلاطین دہلی کا نظام حکومت مصنفہ قریشی، مطبوعہ لاہور ۱۹۴۴ء میں صفحہ ۲۰۵۔ ۲۰۶ پر زیادہ تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

۱۲۔ جنرل آف انڈین ہسٹری دسمبر ۱۹۴۲ء میں ہندوستان پر مسلمانوں کے دور حکومت میں زرعی زمین کی ملکیت کے عنوان پر صفحہ ۲۳۶۔ ۲۲۵ تک مقالہ ملاحظہ ہو۔

۱۳۔ آئین اکبری میں زرعی پیداوار پر ریاست کے مطالبے کو RENT قرار نہیں دیا گیا۔ بلکہ اسے ٹیکس کہا گیا ہے یا حق حکومت بعوض حفاظت سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ یہ ایک ایسا ٹیکس ہے جو حکومت ان خدمات کے عوض وصول کرتی ہے جو وہ سرانجام دیتی ہے۔ اس کا بیان کئی صفحے پر ہے۔ مثلاً: ۲۹۰، ۲۹۳، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹۔ عالمگیر اول کا فرمان 'مراۃ احمدی' گیک ورڈ اورنٹیل سیریز صفحہ ۲۶۸ تا ۲۷۸ میں دوبارہ چھاپا گیا۔

۱۴۔ کتاب مذکور صفحہ ۲۶۹

۱۵۔ منصب داری کے نظام کے بارے میں 'نظام سلطنت دہلی' کے صفحات ۱۲۲۔ ۱۲۷ ملاحظہ ہوں۔ اس کے علاوہ مورلینڈ کی کتاب 'مسلم انڈیا کا زرعی نظام' مطبوعہ کیمبرج ۱۹۲۹ء صفحہ ۵۶۔

۱۶۔ مغلوں کے ماتحت جہت اور سیر جہت جو غیر زرعی ٹیکس ہیں۔ انھیں جمع کرنے کے فرائض پر اکثر امور کیا جاتا تھا۔

۱۷۔ بنگال کا ۱۷۹۳ء کا مشہور بندوبست دوامی۔ تھارٹن کی تاریخ انگریزی ہندوستان حصہ دوم، مطبوعہ لندن

۱۸۴۲ء حصہ دوم کے صفحہ ۲۴۔ ۲۶ پر تھارٹن لکھتا ہے "موروثی کاشت کاروں کے حقوق قربان کر دیئے گئے"۔

۱۸۔ ایضاً۔ تھارٹن لکھتا ہے "یہ یقینی امر ہے کہ لارڈ کارنوالس کا بندوبست دوامی انتہائی بے خبری اور ناواقفیت کے تحت مرتب کیا گیا"۔ اس مسئلہ پر زیادہ مفصل بحث کے لئے ہاؤس آف کامنز کی کمیٹی رپورٹ کا ریونیو کے بارے میں ضمیمہ ملاحظہ ہو۔ جو ۱۸۳۲ء میں مارکوئیس آف ہیسٹنگز نے ترتیب دیا۔

۱۹۔ اس سوال پر تفصیلی بحث دیکھئے۔ "سلاطین دہلی کا نظام حکومت" صفحہ ۲۱۱۔ ۲۱۰۔

۲۰۔ ایضاً۔ صفحہ ۱۱۹۔ ۱۹۶۔

۲۱۔ صفحہ۔ ۲۱۰

۲۲۔ مثال کے طور پر راجپوت سردار۔

۲۳۔ سلاطین دہلی کا نظام حکومت صفحہ ۱۲۰۔

۲۴۔ ایضاً۔ صفحہ ۲۱۵

۲۵۔ ایضاً صفحہ ۱۲۰

۲۶۔ تاریخ فیروز شاہی مصنفہ ضیاء الدین برنی مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۲ء صفحہ ۲۸۸۔

۲۷۔ ضیاء الدین محمد ابن محمد القرشی جو ابن الاخوۃ کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی تصنیف معالم القربۃ فی احکام الحسبہ مطبوعہ لندن ۱۹۳۸ء میں حسبہ پر بہت اچھی بحث ملتی ہے۔ اس سلسلہ میں احکام السلطانیہ صفحہ ۲۴۷ وغیرہ بھی ملاحظہ ہو۔

۲۸۔ ابتدائی چیزیں تھارٹن کے ہاں صفحہ ۵۲۴ پر ملتی ہیں جن میں وہ کہتا ہے "حکومت کو زمین کا اصلی مالک قرار دینے میں کوئی برائی نہیں ہے"۔ پھر اس کے بعد یہ نظریہ اس قدر عام ہو گیا کہ ولسنٹ سمتھ نے بڑے وثوق سے یہ دعویٰ کیا کہ ہندوستان کے اصلی قانون میں زرعی زمین کو بادشاہ کی ملکیت سمجھا جاتا تھا۔ ارلی ہسٹری آف انڈیا ۱۹۲۴ء ایڈیشن صفحہ ۱۳۸۔ یہ نظریہ کچھ اس طرح جڑ پکڑ گیا کہ عالمگیر اول کے فرمان پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک مبصر یہ بھی نہ سمجھ سکا کہ کاشتکار زمین کا مالک بھی ہو سکتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔ سٹڈیز ان مغل انڈیا۔ مصنفہ جے این سرکار صفحہ ۱۷۲۔

اسی طرح اسلامی ہند کے زرعی نظام کے صفحہ ۱۳۹۔ ۱۴۰ پر مورلینڈ نے بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا۔ ان مصنفوں نے نہ صرف یہ کہ مسلمان مصنفوں کی تحریروں کے شواہد کو نظر انداز کر دیا بلکہ اپنے ابتدائی زمانہ کے برطانوی مصنفوں کی تحریروں سے بھی چشم پوشی کی۔ میں یہاں صرف دو کا ذکر کرتا ہوں۔ ہیسٹنگز کی رپورٹ جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے اس میں "مالک کاشتکاروں" کا ذکر کرتا ہے۔ اسی طرح سر تھامس منرو نے بھی کنسلیشن آف دی گورنمنٹ آف مدراس ۳۱ دسمبر ۱۸۲۴ء میں یہ لکھا ہے: "ہم نے بیشتر حالتوں میں اصل مالکوں اور قابض رعیتوں کو ان کے مالکانہ حقوق سے محروم کر دیا ہے اور ان حقوق کو زمینداروں یا زمنی جاگیرداروں کو عطا کر دیا"۔

۲۹۔ ابتدائی تحریروں میں کسانوں کے قانونی تحفظ کا ذکر ملتا ہے۔ سر ایڈورڈ کول برک نے جولائی سنہ ۱۸۲۰ء میں بنگال کنسلٹیشنز میں یہ ذکر کیا۔ حکومت نے فی الواقع ایسے قانون بنانے کے اختیارات محفوظ رکھے جو مزارعین کے حق میں ہوں۔ بعد میں زمین کی سرکاری ملکیت کے نظریے نے جاگیرداروں کے مالکانہ حقوق کو نامعقول بنایا۔ چنانچہ جاگیردار حکومت اور کاشتکاروں کے مابین "درمیانی گروہ" کی حیثیت اختیار کر گئے جن کے لئے واضح فرائض متعین تھے اور قانون کے ذریعے آئندہ جن فرائض میں ردّ و بدل کی گنجائش تھی۔ بندوبست دوامی کے بعد حکومت نے مستقل نوعیت کا کوئی اور معاہدہ نہ کیا۔

۳۰۔ معاوضے ادا کرنے کی مثالیں اتنی زیادہ ہیں کہ ان کا ذکر بھی فضول ہے لیکن فقیہوں نے کہیں بھی یہ نہیں لکھا کہ فوجوں کو اس خطرے کے پیش نظر نقل و حرکت نہیں کرنی چاہیئے کہ اس سے کسی مالک کی فصلوں کو نقصان پہنچتا ہے۔

---

**طلوع اسلام۔**

یہ مقالہ درحقیقت اس مسئلہ کے تاریخی پس منظر کو پیش کرتا ہے۔ قرآن کی رو سے زمین پر ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ زمین رزق پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ اس لئے اُسے نظام اسلامی (ملت) کی اجتماعی تحویل میں رکھا جاتا ہے جو اس کے مناسب انتظام کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اس سے تمام مشکلات کا حل ہو جاتا ہے۔

---


# نظامِ ربوبیّت

از:۔ پرویز

نوعِ انسانی کا سب سے اہم اور مشکل سوال اس کا معاشی مسئلہ ہے۔ اس مسئلہ کا حل عقلِ انسانی نے کیا سوچا! اور قرآن نے اس کا کیا حل بتایا ہے۔

دورِ حاضر کی عظیم کتاب۔ بڑا سائز۔ ضخامت ۴۰۰ صفحات

قیمت مجلد چھ روپے   غیر مجلد چار روپے

ناظم ادارہ طلوع اسلام

مذاکرۂ عالم اسلامی (لاہور)

# جمہوریت اور شریعتِ اسلامیہ

از ڈاکٹر کوئلر ینگ۔ (پروفیسر پرنسٹن یونیورسٹی۔ امریکہ)

میری یہ تقریر جمہوریت اور شرع اسلامی کے اصطلاحی تعلق باہمی پر کچھ زیادہ روشنی نہ ڈال سکے گی۔ کیونکہ گذشتہ چند ماہ سے میرا وقت اپنا وقت نہیں رہا۔ اور میں ادھر ادھر گھومتا رہا ہوں۔ پس بجائے خود کچھ بیان کرنے کے تحقیق اور جستجو ہی میرا مقصود متصور ہونا چاہیئے۔ البتہ میں چاہتا ہوں کہ اس مسئلہ کو ٹھیک ٹھیک طور پر متعین کر دوں اور مشورتاً کچھ معروضات پیش کروں تاکہ دوسرے فاضل و قابل افراد اس پر متوجہ ہو کر اس مسئلہ کے تاریخی پہلوؤں پر روشنی ڈالیں اور اس کا کوئی حل سوچنے پر مائل ہو سکیں۔

ایسی مجلس کے سامنے یہ تبلانا کہ شریعت سے کیا مراد ہے بالکل غیر ضروری ہے لیکن جمہوریت کی بات اور ہے۔ اس مسئلہ کے تعلق سے کچھ نہ کچھ کہنا ہی ہوگا کہ اس کا کیا مفہوم ہے۔ اس اصطلاح کے عام سوشیل مفہوم اور اس کے خاص سیاسی مضمرات میں جو فرق ہے، اس کو واضح کرنے پر میں زیادہ زور دوں گا۔

یہ ایک مانی ہوئی حقیقت ہے کہ از روئے اسلام امت کے افراد کی حیثیت سے تمام انسان یکساں اور مساوی ہیں یہ امت نسل یا رشتہ داری کی وجہ سے نہیں بلکہ خدا کی توحید اور اس کے برگزیدہ پیغمبر محمدؐ کی رسالت پر ایمان رکھنے کی بنا پر ایک مضبوط شیرازہ میں منسلک ہے۔ معاشرہ میں تو افراد کے مراتب و مناصب جدا جدا ہوتے ہیں۔ لیکن خدائے تعالےٰ کے حضور میں بلا لحاظ رنگ و نسل و مقام سب مساوی ہیں۔ اسلام میں شرف و تکریم کا واحد معیار ارتقاء اور پاکبازی ہے۔ ہر زمانے کے معاشرے میں افراد کی حیثیتیں اور رتبے مختلف رہا کئے ہیں اور یہ اصول مساوات بھی مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہوتا رہا ہے۔ لیکن یہ بنیادی عقیدہ مسلمانوں میں کبھی نظر انداز نہیں ہوا۔ اور اسلامی معاشرے کی ایک ممتاز خصوصیت بن چکا ہے۔

اس بحث کے تعلق سے جمہوریت کی اصطلاح کے متعلق ہمارا منشا صرف اس کا عام سوشیل مفہوم بیان کر دینا نہیں بلکہ ساتھ ساتھ اس کے مخصوص سیاسی پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالنا ہے اور بتلانا ہے کہ وہ کون سے ادارے یا اداروں کے گروہ ہیں جو عوام الناس کی مرفہ الحالی کے ضامن ہیں اور ایک عمدہ معاشرتی تنظیم کے وسائل بہم پہنچاتے ہیں۔ مختصراً میں یہ عرض کروں گا

کہ اس بحث کے تعلق سے جمہوریت کے معاشرتی پہلو کی بہ نسبت اس کے مدنی (CIVIC) پہلو ہی پر زیادہ زور دینے کی ضرورت ہے۔

چند اہم معروضات اس بحث میں اساسی حیثیت رکھتے ہیں۔ اولاً یہ کہ حریت جمہوریت کا جوہر خالص ہے۔ وہ آزادی جس کو تشکل کرنے۔ محفوظ رکھنے اور ترقی دینے کے لئے جمہوری سیاسی ادارے وضع کئے جاتے ہیں صرف ایسے معاشرہ میں پیدا ہوتی پلتی اور پروان چڑھتی ہے جس میں قانون کا دور دورہ اور حکمرانی ہو۔ نیز یہ کہ اساسی تصور اور قانون کے تفوق و برتری کا ایقان ہی بنیادی طور پر اطلانتک کے بحر متوسط کے کناروں پر بسنے والے ممالک کی تہذیبوں کو اسلامی تہذیب سے قریب لاتا ہے۔ اور یہ بھی کہ ان مختلف تہذیبوں کے لئے یہ لازم اور ضروری نہیں اور نہ ہونا چاہیئے کہ ایک ہی نوعیت کے سیاسی اداروں اور سرچشموں سے اپنی حکومت خود اختیاری کی تشنگی کو سیراب کریں اور انھیں انسان کی سیاسی آزادی کے حصول کا ذریعہ بنائیں۔ آخراً یہ کہ دنیا میں مکمل جمہوری آزادی کے حصول کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ان میں ثقافتی تعاون و تعامل۔ ایک دوسرے کا لحاظ۔ اور ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے سکون و اطمینان کا وقت بھی ملے۔ خاص اس مذاکرہ کے تعلق سے میں اپنے اس قلبی ایقان پر بھی زور دوں گا کہ اسلامی معاشرہ میں جمہوری سیاسی اداروں کے فروغ اور ترقی کے لئے شریعت کے ان امکانات پر بھی اچھی طرح غور کرنے کی ضرورت ہے جن کا اب تک کماحقہٗ احساس نہیں ہوا۔ نظری اور نصب العینی حیثیت سے دیکھا جائے تو ایک اسلامی معاشرہ میں شریعت اقتدار اعلیٰ کی مالک ہے۔ اور ایک اسلامی مملکت کی حکومت (ہیئت اجرائیہ) کے لئے ضروری ہے کہ وہ شریعت کے قوانین و احکام کے مطابق عمل پیرا ہو۔ لیکن یہ امر واقعہ ہے اور تاریخ اس کی شاہد ہے (اور اکثر علماء اس کے معترف) کہ یہ اخلاقی فریضہ اور ذمہ داری جسے تمام مسلمان اصولاً درست اور ضروری تسلیم کرتے ہیں، عملاً کبھی اس طرح بروئے کار نہیں آئے کہ انھوں نے ایک تمدنی اقتدار کی شکل اختیار کر لی ہو اور اس سے ایسے سیاسی ادارے وجود میں آگئے ہوں جو سوشل جمہوریت کے اخلاقی اصولوں کے ترجمان قرار پا گئے ہوں۔ اس کی وجوہات گوناگوں ہیں جن کی تفاصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ جمہوری اصول اسلامیہ کے روبکار لانے کے لئے جن اسباب و تدابیر کی ضرورت تھی۔ یہ ان کے راستے میں بڑی رکاوٹ ثابت ہوئے ہیں۔ سارے مسلمان آس لگائے ہوئے ان ذرائع و تدابیر کا انتظار کر رہے ہیں۔ لیکن یہ بھی ایک عجیب حقیقت ہے کہ اگرچہ ان اصولوں کو سیاست میں متشکل ہونے میں چنداں کامیابی نہیں ہوئی لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اپنی ساری تاریخ میں مسلمان اس پر شدت سے جمے رہے ہیں اور یہ چیز کسی حد تک حکمرانوں کی مطلق العنانی اور ظلم و استبداد کی روک تھام میں کارگر اور مفید ثابت ہوئی ہے۔ یہ خود شریعت کے اصول کی حقیقت پسندی اور صداقت کی دلیل ہے۔ اور اس اعتبار سے قابل عظمت و احترام پروفیسر گب نے "نظم و دستور اسلامی" پر جو مقالہ سپرد قلم کیا ہے۔ اس کے خاتمہ پر انھوں نے اس کا ایک اچھا خلاصہ پیش کیا ہے۔ اس سلسلہ میں دوانی کی "اخلاق جلالی" کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:۔

"اسلامی فکر سیاسی کی اس نئی توضیح کا اگر ابو یوسف کی اس یادداشت کے ساتھ مقابلہ کیا جائے، جو انھوں نے ہارون

الرشید کے سامنے پیش کی تھی تو ہمیں یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ مسلمان مفکرین نے اپنے اس نصب العین کو کبھی نظر انداز ہونے نہیں دیا اور بڑی ثابت قدمی سے اس پر جمے رہے ہیں۔ خلافت اپنا قدیمی اقتدار کھو کر مردہ ہو گئی۔ جنگجو فاتحین مسلمانوں کے سروں پر مسلط ہو گئے۔ صدر اول کی اخوت و معاشرتی مساوات کی جگہ طبقاتی نظام نے لے لی۔ تاہم ان ساری بدحالیوں میں بھی مسلمانوں کے اصول حکمرانی میں کوئی تغیر نہ ہوا۔ ان ہی اصول پر آگے چل کر بادشاہان مغول و سلاطین عثمانیہ اپنی حکومتیں تشکیل کرتے رہے حتیٰ کہ ان قوموں کی داخلی کمزوریوں کی وجہ سے ایسے جدید معاشرتی و سیاسی تصورات نے ان کی زندگی میں راہ پالی جن کی بنیاد اس فلسفہ پر تھی جو اسلام کی سرزمین میں بالکل اجنبی پودے کی حیثیت رکھتا تھا۔

جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں اس مذاکرہ کی اور اس سے پیشتر والے پرنسٹن کے مذاکرہ کی غرض و غایت یہ ہے کہ اس خارج سے در آمد ہونے والے اجنبی فلسفہ سیاست اور اسلام کے موجودہ تعلق باہمی کو اچھی طرح سے سمجھ لیا جائے اور اس پر غور کیا جائے کہ کن شرائط پر ان دونوں میں تعاون ہو سکتا ہے۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اگر اچھی طرح دیکھ اور سمجھ لیا جائے تو یہ نیا فلسفہ حکمرانی اتنا اجنبی بھی نہیں جتنا کہ بادی النظر میں دکھائی دیتا ہے[1]۔ نیز یہ کہ ایسے کئی عملی گوشے تعاون کے ہیں جہاں مشرق و مغرب دونوں کو باہم ملنے کے بعد اختلاف و عداوت کی نہیں بلکہ اتحاد و تعاون عمل کی صورتیں دکھائی دیں گی۔ حتیٰ کہ عمیق ترین سطح فکر پر بھی ان دونوں میں کوئی تصادم نہ ہو گا۔ اسی نقطہ نظر اور مسئلہ زیر بحث کے تعلق سے میں ایک دو باتیں مشورۃً عرض کروں گا۔

پہلے معروضہ کی تمہید کے طور پر گذشتہ موسم گرما میں امریکن بار ایسوسی ایشن کے لندن کے اجلاس میں لارڈ کلیمور نے جو ایڈریس پڑھا تھا اس کے چند جملے سنانا چاہتا ہوں۔ انگریزی بولنے والی قوموں میں حریت و جمہوریت کی جو عمومی اساس ہے اور امریکہ و انگلستان دونوں میں) جو کامن لا (عوامی قانون) کی اتنی پابندی کی جاتی ہے۔ اس کی بنا پر اس جلسہ میں "قانون کی برتری" کا اصول سارے مباحث پر چھایا ہوا تھا۔ ان کے فلسفہ سیاست کی اساس "قوانین فطرت" پر ہے۔ اس پر زور دیتے ہوئے لارڈ کلیمور نے کہا کہ یہ فلسفہ ہمارے اصول قانون کی تہ میں اس مضبوطی سے جما ہوا ہے کہ اوپری سطح پر صرف کہیں کہیں اس کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ بایں ہمہ وہ دوسرے تمام قوانین سے اعلیٰ و برتر ہے۔ کیونکہ بنی نوع انسان سے محض انسان ہونے کی حیثیت سے اس کا سروکار ہے اور وہ منشائے خداوندی انسان کی اعلیٰ ترین عقل و دانش کا مظہر ہے یہ قانون فطری ان معنوں میں نہیں کہ اس کا تعلق انسان کی ایسی حالت سے ہے جو تہذیب و تمدن کے ابتدائی مراحل میں ہوتی ہے بلکہ بیشتر ان معنوں میں کہ وہ انسان کی پوری اور مکمل عمرانی ترقیات کے لئے ہر طرح سازگار ہے اور ایسی جماعتوں کی تشکیل و تنظیم کرتا ہے جو عقل و خرد کی آبیاری سے پرورش پا کر پروان چڑھتی ہیں۔

---

[1] یہ صحیح نہیں (طلوع اسلام)

پس میرا مشورہ یہ ہوگا کہ مسلم مقننین و ماہرین شرع بھی "قدرتی قانون"[1] کے ورثہ کی جس میں ہم سب برابر کے سہیم و شریک ہیں، قدر و قیمت سمجھیں۔ اسی کی بنیاد پر ہم اپنے اپنے ماحول اور اس کے مقتضیات کے لحاظ سے ایک دوسرے کے ساتھ ایسا اشتراک عمل و تعاون پیدا کریں جس کے دور رس نتائج کا اب تک صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا ہے۔ میں آپ کو یہ بھی یاد دلانا چاہتا ہوں کہ قانون کی برتری کا یہ شعور ہم سب کے لئے مشترک اور عمومی ہے اور قدیم عراقی تہذیب جو حمورابی کے قدیم ضابطۂ قوانین میں صورت پذیر ہوئی تھی، اس کا سرچشمہ ہے۔ یہی موسوی تورات کی بھی اساس تھی[2] جس سے مسیحیت اور اسلام گو مختلف راستوں سے بھی لیکن یکساں خوشہ چیں ہیں۔ اسی سرچشمہ نے یونانی قوانین اور رومن لا کو بھی سیراب کیا ہے اور اگرچہ مغربی ملکوں میں اس کا ظہور ایک مختلف شکل میں ہوا ہے لیکن سامی اقوام کے قوانین بھی خواہ یہودیوں کے ہوں یا مسیحیوں کے اور عربوں کے، اسی سے یکساں طور پر فیض یاب ہوئے ہیں۔ دقت محنت و جانفشانی کا یہ ورثہ یا عمومی ماحصل ان اختلافات کی بہ نسبت جو عصر حاضر کی مختلف تہذیبوں کے پیدا کردہ ہیں، بدرجہا زیادہ قابل لحاظ ہے۔ اصل یہ ہے کہ جس طرح برف کے تودے (ICE-BERG) کا بہت تھوڑا حصہ سطح آب سے اوپر نظر آتا ہے اسی طرح ہم اس قدر مشترک کا بہت تھوڑا سا حصہ اپنے سامنے دیکھ سکتے ہیں۔

علاوہ ازیں میرے خیال میں اگر اس کا ٹھیک تعین ہو جائے کہ شریعت کے کون کون سے عناصر ہیں جن میں "قانون فطرت" مضمر ہے تو شریعت اور جمہوریت کے تعلق باہمی کو سمجھنا زیادہ آسان ہو جائے گا۔ مسلمان حضرت محمدؐ کے رسول خدا ہونے اور ان کے لائے ہوئے قرآن کو بہ حیثیت ایک پیغام مافوق الفطرت (وحی) اور منشائے رب العزت ہونے کی وجہ سے قابل عظمت و احترام سمجھتے ہیں۔ حاشا میری غرض اس عقیدہ کو ٹھیس لگانا نہیں۔ لیکن یہ ایک بالکل منطقی نتیجہ ہے کہ جب منشائے خداوندی نے اپنے آپ کو ایک محیط کل انداز سے منکشف کیا ہے تو اس کا انکشاف قانون فطرت اور نظم کائنات میں بھی ہونا چاہیئے[3] اس اعتبار سے یہ ساری بنی نوع انسان کا ورثہ ہو گا۔ لہٰذا اس دعوے کی بنیاد کہ اسلام ساری دنیا کے لئے ہے (اور اس نظریہ کا اعتراف بھی ممکن ہے) اسی عقیدہ پر ہونی چاہیئے۔ مسلمانوں کے لئے یقیناً "قدرتی قانون" کا یہ عنصر زیادہ واضح اور زیادہ مقدس ہے، کیونکہ اس کا مظاہرہ ایک مافوق الفطرت ہدایت یعنی وحی کی صورت میں متشکل ہوا ہے لیکن اس سے اس امکان کی نفی لازم نہیں آتی کہ شریعت کا یہ حصہ قانون قدرتی سے ہم آہنگ ہونے کی وجہ سے صرف مسلمانوں

---

[1] "قوانین فطرت" (NATURAL LAWS) ایک مجرد اصطلاح ہے جس کا متعین مفہوم علمائے مغرب کے ذہن میں کچھ نہیں۔ مسلمانوں کے نزدیک یہ قوانین وحی کی رو سے ملتے ہیں اور اب صرف قرآن کے اندر محفوظ ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا مغرب کی غیر مسلم اقوام اس تصور کو صحیح تسلیم کرتی ہیں یا نہیں۔ (طلوع اسلام)

[2] مسلمانوں کے نزدیک موسوی قوانین (تورات) کی اساس حمورابی قوانین نہیں تھے بلکہ وہ وحی خداوندی کی رو سے ملے تھے۔ (طلوع اسلام)

[3] لیکن اس کا علم اور تعین وحی کی رو سے ہو سکتا ہے اور یہی وہ فرق ہے جو مسلمانوں کو دیگر علمائے فطرت سے متمیز کرتا ہے۔ (طلوع اسلام)

کا نہیں بلکہ سارے بنی نوعِ انسانی کا عمومی ورثہ متصور ہو۔

یہ حقیقت نفس الامری کہ اسکی بنیاد قانون قدرت ہے اور وہ اسی کی مظہر ہے شریعت اسلامی دوسرے لوگوں کے ساتھ خواہ وہ دیگر امور میں کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں تعاون، اور جمہوریتؒ اور اس کے اداروں کی حمایت کرسکتی ہے۔ گو نظریاتی جواز تعاون واشتراک کے طور پر نہیں عملی سطح پر ایسے لوگوں سے اتحاد واشتراکِ عمل ہو سکتا ہے چنانچہ اقوام متحدہ کے توی منشور کے حقوق انسانی کے قبول کرلئے جانے کی یہی بنیاد رہی ہے۔ ایک قومی کمیشن نے جس کے اراکین مختلف مذاہب اور مختلف آئیڈیالوجی کے حامل تھے۔ ان عمومی حقوق پر اتفاق کرلیا اور شرط صرف یہ عاید کی کہ ان سے یہ نہ پوچھا جائے کہ کن وجوہ سے انہوں نے اسے قبول ومنظور کیا ہے۔ ایک ایسے جمہوریتی منشور سے بحث کرتے ہوئے جسے مان لینے پر ہم سب کو آمادہ ہونا چاہیئے۔ مشہور فلسفی جیکس مراٹین رقمطراز ہے:۔

"بس یہی وجہ ہے کہ ایسے لوگ بھی جن کے مذہبی و مابعد الطبیعاتی انداز نظر ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتے ایک نقطہ پر متحد ہو سکتے ہیں۔ یہ اتحاد، ایک عقیدہ کے پیرو ہونے کی بنا پر نہیں بلکہ غرض وغایت کی وحدت اور عمل میں مماثلت ومشابہت کی بنا پر ہوا کرتا ہے۔ اس طرح سب ایک غیر مذہبی یقین میں شریک ہو جاتے ہیں بشرطیکہ عقل ودانش، حق وصداقت اور شرف انسانیت کا۔ آزادی اور اخوت وہمدردی کا اور اخلاق حسنہ کی قدر وعظمت کا انھیں یکساں لحاظ ہو مگر یہ ضروری نہیں کہ اس احترام کی وجہ بھی ایک ہی ہو"

جمہوریتی منشور اور عوام کے حق حکومت خود اختیاری کی نظریاتی بنیاد کے متعلق ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے مابین اختلاف ہو۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان دونوں کا وحی سے انکار کرنے والے عقل پرستوں (RATIONALISTS) اور پاس انسانیت رکھنے والے (HUMANISTS) سے اختلاف ہو۔ لیکن محض اس وجہ سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہم معاشرتی اور سیاسی اداروں میں اس امر پر زور نہ دیں کہ وہ لوگوں کے حق خود اختیاری کو تسلیم کریں۔ جبکہ ہم اس حق کے صحیح ہونے پر باہمدگر متفق ہوں۔ اس نصب العین کے حصول کے لئے شریعت تو اپنے ماننے والوں سے اس سے بھی زیادہ مطالبہ کرے گی۔ لیکن ابھی شاید ہی کسی مملکت میں نظر خواہ اقتدار اور برتری حاصل ہو سکتی ہو۔ حتیٰ کہ ان ممالک میں بھی جہاں زیادہ تر خوش وو فادار مسلمان بستے ہیں، تا آنکہ اس میں سب سے پہلے دنیاوی اور انسانی سطح پر حکومت خود اختیاری کا اصول بنیادی طور پر تسلیم نہ کرلیا جائے۔ کسی ایک ممالک کے تمام قوانین کو اپنے نظام سے ہم آہنگ کرنے کے لئے اگرچہ شریعت نے بہت کچھ کہا ہے لیکن یہ اب تک کسی ایک ملک میں بھی سیاسی غلبہ واقتدار حاصل نہیں کر سکی۔ یہ حقیقت خود مسلم اقوام کو اس کا تجربہ کرنے پر مائل کرنے کے لئے کافی ہے اس کے لئے شریعت کو اپنے اصولوں میں کسی قسم کی مفاہمت کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ یہ اس تجربہ سے ان کا مقصد پورا کرسکے گی۔

---

لہ سیکولر جمہوریت کی جس کی رو سے تمام انسانوں کو واجب التکریم تسلیم کیا جانا چاہیئے۔ نہ کہ سیاسی جمہوریت کی جس کی رو سے اگر اکثریت یا ہاتھ یہ فیصلہ کردیں کہ خدا نہیں ہے تو انہیں اس کو یہ فیصلہ منظور کرنا پڑتا ہے۔ (طلوعِ اسلام)

اس مقام پر اس تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں کہ جمہوریت کے منشور میں جس کی تشکیل و تکمیل میں مسلم مقننین علماء رہنما اور مدبرین کا تعاون حاصل کیا جا سکتا ہے کن کن امور کو شامل کرنا چاہیئے اور کن نقاط پر ان حضرات کی توجہ مرکوز نہیں ہونی چاہیئے۔ البتہ یہ بتلایا جا سکتا ہے کہ ایسی عمومی کوششیں کن سمتوں میں ہونی چاہیئے۔ اس سلسلہ میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پروفیسر مرائیتن کی تصنیف موسومہ "انسان اور مملکت" کی کچھ مزید عبارت نقل کر دی جائے۔ وہ کہتا ہے کہ

ایسے منشور میں مثلاً یہ امور داخل ہونے چاہئیں۔

انسان کے ذاتی حقوق و ذمہ داریاں۔ سیاسی حقوق اور آزادیاں۔ معاشرتی حقوق اور آزادیاں۔ اور ذمہ داریاں۔ خاندانی گروہوں کے اراکین کے حقوق اور آزادیاں اور ثانی الذکر کی ذمہ داریاں اسٹیٹ کے تعلق سے۔ جماعتوں اور اسٹیٹ کے باہمی حقوق اور ذمہ داریاں۔ عوام پر عوام کے ہاتھوں حکمرانی عوام کے فائدہ کے لئے۔ ایک سیاسی و معاشرتی جمہوریت کی حکومت کے فرائض منصبی۔ مصنفانہ قوانین اور دستور مملکت سے جو عوام کی آزادی کا ضامن ہوتا ہے۔ وفاداری کی اخلاقی ذمہ داری ناگہانی انقلابات سیاسی کی ایک ایسے معاشرہ میں جو فی الحقیقت آزاد ہو اور جہاں قانون کے تحت حکومت کی جاتی ہو کلی ممانعت کیونکہ دستور میں تبدیلی اور اس کا ارتقاء کثرت آراء ہی سے ہونا چاہیئے۔ انسانی مساوات۔ حکومت اور افراد کے مابین اور ایک دوسرے کے حقوق کا تحفظ۔ معاشرتی یگانگت اور مواخات کا تخیل۔ مذہبی آزادی اور رواداری۔ مختلف مذاہب و مکاتب فکر و خیال کے مابین ایک دوسرے کا تحفظ۔ مدنی وفاداری و حب وطن۔ وطن کے ورثہ اور تاریخ کی عظمت کا احساس اور ان مختلف روایات کا سمجھنا جو اتحاد و یگانگت میں شیرازہ کا کام دیتی ہیں۔ ایک مہذب سوسائٹی میں مفاد عامہ کے لئے با تعلق حکومت ہر شخص کی ذمہ داری۔ اور اس سے واقف ہونے کی ضرورت کہ بنی آدم اعضائے یک دیگر اند اور سارے انسان ایک ہی جماعت کے ارکان ہیں۔"

میرا خیال تھا ہے کہ اگر مسلم راہ نما اپنی توجہات اور مساعی کو اس امر پر مرکوز کر دیں کہ انہیں اپنے مروجہ ضوابط قانون پر (جن کا بیشتر یورپ سے مستعار لیا ہوا اور بلا غور و فکر اپنایا ہوا ہے) نظر ثانی کرنی ہے۔ اور اس نظر ثانی میں ان مقتضیات کو ملحوظ رکھنا ہے جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے تو اس سے آئندہ اسلامی شان کی عمارت اٹھانے کے لئے ایک وسیع اور مستحکم بنیاد مہیا ہو جائے گی۔ اس میں شریعت کے مخصوص اور نمایاں خد و خال بھی جھلکتے ہوں گے اور یہ سب قرآن کی تعلیم کے مطابق ہوگا۔ جیسا کہ سورۂ شوریٰ بالخصوص آیت نمبر (۳۸) سے واضح ہے جس میں کہا گیا ہے کہ والذین استجابوا لربھم واقاموا الصلوٰۃ وامرھم شوریٰ بینھم اور جو لوگ اپنے رب کی دعوت پر لبیک کہتے ہیں اور نظام صلوٰۃ کو قائم کرتے ہیں اور اپنے معاملات کو باہمی مشاورت سے طے کرتے ہیں۔

شریعت اور جمہوریت کے تعلق سے میرا ایک اور مشورہ بھی ہے مگر میں اس کی تفصیل میں نہ جا سکوں گا۔ اور صرف چند اشاروں پر اکتفا کروں گا۔ یہ جمہوریت کی پوری تکمیل و ترشح اور اپنے وسیع معنوں میں احساس ذمہ داری پیدا کرنے کی تدابیر اور

ذرائع سے متعلق ہے۔ ہو سکتا ہے کہ میرا یہ مشورہ مسلمانوں کو محض "شاعرانہ تخیل" دکھائی دے لیکن میں اس کا جواب یہ دے سکوں گا کہ تاریخ میں اس کے بکثرت نظائر موجود ہیں۔ اس سے میری مراد حق اجتہاد کے جمہوری استعمال سے ہے تاکہ شریعت کو ٹھیک طور پر سمجھ کر جمہوری اداروں کے قیام و ترقی سے صحیح معنوں میں اسلامی معاشرہ وجود میں آجائے۔

پرنسٹن کے مذاکرہ میں اجتہاد پر سب نے اور خصوصاً اہل سنت نے بہت زور دیا تھا اس سے میں بہت متاثر ہوا۔ اس پر عمل پیرا ہونے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ حق اجتہاد کے دروازوں کو مسدود کر دینے کے قدامت پسندانہ عقائد خواہ کچھ ہی رہے ہوں آج کل کے مسلمانوں کا یہ فرض ہے کہ وہ موجودہ صدی کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے اس حق کا وسیع استعمال شروع کریں۔ بنا بریں میرا ایک صاف اور سیدھا سوال ہے کہ کیوں نہ اس قدیم اور قابل عظمت اسلامی حق کے استعمال کی ہمت افزائی کی جائے اور کیوں اسے صرف علماء تک محدود کر دیا جائے اور کیوں نہ تمام افراد کے لئے حق اجتہاد کھلا ہے۔ اس سے تعلیم میں ترقی کی نئی راہیں کھلیں گی۔ جس میں قرآن اور شریعت کو مرکزی مقام حاصل ہو جائے گا۔[1] سارے اسلامی معاشرے میں زندگی کی ایک لہر دوڑ جائے گی۔ ساتھ ساتھ اس جدوجہد میں ایسے لوگ بھی تیار ہو جائیں گے جن میں حقوق جمہوری کے صحیح استعمال کا سلیقہ ہوگا اور اس کی ذمہ داریاں بھی باحسن الوجوہ پورا کر سکیں گے۔

اس معروضہ کو اگر میں تفصیل سے بیان کرنا چاہوں تو اس کے لئے ایک اور مقالہ کی ضرورت ہوگی۔ میں آپ کے حسن سماعت سے کافی فائدہ اٹھا چکا ہوں اور اس پر مزید بار ڈالنا مناسب نہیں خیال کرتا۔

---

[1] حیرت گذری کہ مقالہ انگریزی زبان میں تھا اور حضرات علماء کرام اسے سمجھ ہی نہ سکے ورنہ اگر انھیں معلوم ہو جاتا کہ یہ ملحد قرآن کا ذکر کرتا اور علماء کی اجارہ داری کو ختم کرنے کا مشورہ دیتا ہے تو اس بیچارے کے پیچھے بھی پنجے جھاڑ کر پڑ جاتے۔ (طلوع اسلام)


# ضرورت ملازمت

ایک میٹرک پاس ۳۲ سالہ سابقہ فوجی کو جسے کلرکی (بمعہ ٹائپنگ۔ اکاؤنٹنگ۔ جنرل کارسپانڈنس) کا نو سالہ تجربہ ہو۔ مناسب تنخواہ پر ملازمت درکار ہے۔

محمد عمر معرفت ایس۔ کے چوہدری N/181 سمن آباد ——— لاہور

مذاکرہ عالم اسلامی لاہور

# اسلامی خود اعتمادی پر ایک غیر مسلم کا تبصرہ

از ڈاکٹر بریٹولڈ اسپولر (ہیمبرگ یونیورسٹی۔ جرمنی)

بانیٔ اسلام حضرت محمدؐ نے جب ۶۳۲ء میں انتقال فرمایا تو آپ جزیرہ نمائے عرب کے بیشتر حصہ پر سیاسی تسلط حاصل کر چکے تھے اور اس خطہ کی آبادی کا ایک کثیر حصہ انہیں خدا کا رسول اور ایک جدید مذہب کا بانی تسلیم کر چکا تھا اور ایسے ماننے والوں کی تعداد روز بروز بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ اسی طرح آپؐ کو اپنی حیات ہی میں ایسی کامیابی حاصل ہو گئی جو اور کسی عالمی مذہب کے بانی کے حصہ میں نہ آئی تھی۔ گوتم بدھ عمر طبعی کو پہنچنے کے بعد فوت ہوئے لیکن انہیں کوئی سیاسی اقتدار نصیب نہ ہوا۔ حضرت عیسیٰ مصلوب ہوئے[1]۔ اور مانی ایران کے ایک قید خانہ میں بحالت اسیری فوت ہوا۔ البتہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ذات میں یہ دونوں باتیں جمع نظر آتی ہیں۔ وہ اپنی قوم کے سیاسی قائد بھی تھے اور پیغمبر بھی۔ لیکن دین موسوی کا ایسے مذاہب میں شمار ہی نہیں کیا جا سکتا جنہیں کوئی عالمگیر حیثیت حاصل ہوئی ہو اور مختلف اقوام اس کی حلقہ بگوشی ہوئی ہوں۔ بودھی، عیسوی اور مانی مذاہب اور حالات ایسی حکومتوں کے تحت زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے جو یا تو مذہب کی بالکل پروا نہیں کرتی یا انہیں مخالفانہ نظروں سے دیکھتی تھیں۔ نتیجتہً انہیں بار بار ایسی حکومتوں سے سمجھوتہ کرنا پڑا اور اپنے زمانہ کی مدنی زندگی کو بھی اختیار و قبول کرنا پڑا۔ اس سلسلہ میں (مثال کے طور پر) رومن سلطنت کے دستور کے قواعد شجہ مذہبی کی جو تیسری یا چوتھی صدی عیسوی میں مرتب و مدون ہوئے تھے یاد دہانی ہو گی۔ یہی قواعد آج کی مسیحیت میں بھی نافذ العمل ہیں۔ بودھ مت اور مسیحیت کو دنیا کے بڑے بڑے حصوں میں پھلنے پھولنے کا موقع اسی وقت مل سکا جب کسی بڑے بادشاہ نے اپنی ساری رعایا کے ساتھ ان نئے مذاہب کو قبول کر کے ان کی سرپرستی کی۔ اس سلسلہ میں مسیحیت کے تعلق سے چارلس اعظم (پاکباز) اور فرقہ پراٹسٹنٹ (انگلش چرچ) کے تعلق سے ہنری ہشتم کی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ غرض جہاں تک میرا مطالعہ ساتھ دیتا ہے مجھے کوئی ایسی مثال نہیں ملتی جس میں کسی پوری کی پوری قوم نے خود مسیحیت کو قبول کیا ہو۔ یہ اور بات ہے کہ بعض اقوام کے حکمراں مسیحی ہو گئے اور انہوں نے بزور قانون و اقتدار ساری رعایا

---

[1] مقالہ نگار عیسائی ہے۔ (طلوع اسلام)

کو کر کچھن بنا لیا۔ یہی کام فاتح حکمراں یا نو آبادیوں کے فرمانرواؤں سے بھی اسی طرح انجام پا سکتا تھا۔ بدھ مت کے فروغ کا بھی یہی حال ہے اور ایسی مثالیں تبت اور لنکا کی تاریخ سے مل سکتی ہیں۔ اس کے برخلاف چین و جاپان میں جہاں کسی فرمان روا نے وقت نے بدھ مت کی سرپرستی نہیں کی یا سے قبول کرنے کے لئے فرامین صادر نہیں کئے۔ یہ ملک کے واحد مذہب ہونے کی حیثیت حاصل نہ کر سکا جیسی کہ مشرقی ایشیا کے بعض دوسرے خطوں میں پائی جاتی ہے۔ مانوی مذہب کا خاتمہ بھی بالآخر اسی باعث ہوا کہ وہ کسی عظیم و مقتدر خانوادہ سلاطین کی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہوا گو اسے مشرقی وسط ایشیا کی چند روزہ ایغور ترین سلطنت کی سرپرستی حاصل رہی تھی۔ (۷۶۲ء تا ۸۴۰ء) اور یہ ناگزیر بھی تھا کیونکہ جو مذاہب اس طرح شروع ہوں۔ تم ہیں انھیں کار پردازان تبلیغ کے ہاتھوں بچتے بچتے دو چار پشتیں لگ ہی جاتی ہیں۔

اسلام کی حالت ان مذاہب سے بالکل مختلف رہی ہے۔ اسے تو ابتدائی ایام میں عظیم صدمات سے دوچار ہونا پڑا۔ پے درپے تین جانشینان پیغمبر (خلفا) یعنی حضرت عمرؓ و عثمانؓ و علیؓ شہید کئے گئے۔ اسلام کامیابی سے ان عظیم صدمات کو برداشت کر گیا۔ عالمگیر مذاہب کی تاریخ میں ایسی کامیابی کی کہیں اور مثال نہیں ملتی۔ اس نے اپنے بانیؐ کی حیات میں ہی ایک آزاد سیاسی مملکت کی شکل اختیار کر لی تھی جس میں اسلامی اصولوں کے مطابق حکومت ہوا کرتی تھی۔ اس نئی ریاست میں ابتدا ہی سے اس نے اپنی تعلیمات اور آئیڈیالوجی کو کامیابی سے متشکل کر لیا اور اُن سیاسی اداروں کو بھی جو نو مفتوح علاقوں میں اس کے سامنے آئے، اس نے اپنے سیاسی نصب العین کے مطابق ڈھال لیا۔ اس طرح ایک ایسی مذہبی حکومت عالم وجود میں آئی جس میں امیر المسلمین کے فرائض و اختیارات دینی و دنیوی ہر دو امور پر حاوی تھے۔ وہ سیاسی سربراہ کار بھی تھے اور مقتدا و پیشوایان دین بھی۔ مذہبی تشریحات کی امامت کے ساتھ ساتھ فتوے دینا اور قانون بنانا بھی ان ہی کا کام تھا۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ اسلام میں بجز ان صورتوں کے جبکہ مسلمان اغیار (اعداء) کے خلاف جنگ میں شہید ہوئے یا فرقہ وارانہ عصبیت کا شکار ہوئے (جیسا کہ سولہویں صدی میں ایران میں ہوا) اس کی مثال نہیں ملتی کہ مسلمانوں کو کسی حکومت وقت نے موت کی سزا دی ہو یا انھیں غیر مذہب والوں نے مذہبی جنون کے زیر اثر ہلاک کر ڈالا ہو۔

علاوہ بریں دو امور اور بھی ہیں جن کا تذکرہ ضروری ہے۔ اول یہ کہ جب کوئی حکومت مذہبی بنیادوں پر قائم ہو تو چونکہ اس کی اساس مقدس احکام مذہبی پر مبنی ہوتی ہے۔ اس سے بغاوت کرنے والے عام طور پر لوگوں کی نظروں میں اور خاص کر نمائندگان حکومت کے نزدیک دین کے باغی قرار دیئے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں جو تین بڑے فرقے سنی، شیعہ اور خارجی پیدا ہوگئے تو اس اختلاف کی بنیاد ہدایت خداوندی کی تعبیر کے اختلاف پر رکھی گئی۔ اسی نکتہ سے دوسرا نکتہ اسلام میں ایک مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ اسلامی ریاست کو از سر نو متشکل کر کے حقیقی معنوں میں مملکت اسلامی بنایا جا سکتا ہے چنانچہ حضرت محمدؐ کے چند ہی برسوں بعد جن مذہبی اختلافات کی بنا پر امت تین فرقوں میں بٹ گئی (گو خوارج زیادہ دن قائم نہ رہے) دینی اختلافات اسلام کے سیاسی نظریہ کی بنیاد قرار پا گئے۔

۶۵۸ء یعنی رحلت حضرت محمدؐ کے (۲۶) سال بعد سے۔ اسلام میں کوئی اہم فرقہ بندی یا اختلاف نہیں ہوا۔ اور یہ وہ ممتاز خصوصیت ہے جس سے دوسرے عالمگیر مذاہب محروم رہے۔ حتیٰ کہ جب اسلام متعدد فرقوں اور جماعتوں میں بٹ گیا۔ تب بھی حکومت وقت کے خلاف بغاوت یا تو اصولی اختلاف عقاید مذہبی کے باعث ہوئی یا بیرونی ممالک کے اثرات کے تحت۔ اور حکومت وقت کو مطعون کرنے یا اس کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے کا جواز اسی صورت میں مہیا ہو سکتا تھا جب یہ ثابت کیا جاتا کہ اس کے معتقدات دین کے خلاف ہو چکے ہیں۔ لیکن اسلامی تاریخ میں ایسے واقعات کم ہوئے ہیں اور ان کے اثرات بھی دیر تک نہیں رہے۔

ایک اور قابل ذکر خصوصیت اسلام کی اہل کتاب کے ساتھ اس کا برتاؤ ہے چند خاص شرائط کے تحت قرآن یہ حکم دیتا ہے کہ ان مذاہب کے ساتھ پوری رواداری برتی جائے اور ان کے پیروؤں کو اپنے اندرونی معاملات مذہبی اور تنظیمی امور میں پوری آزادی رہے۔ اگرچہ اہل کتاب پر ظلم و استبداد کی بھی شاذ مثالیں نظر آتی ہیں لیکن جس پابندی اور خلوص کے ساتھ اس حکم قرآنی کی تعمیل کی گئی ہے وہ حیرت خیز ہے اور یہ اسی لئے ممکن ہو سکا ہے کہ اسلام اپنے استحکام اور بقا کے لئے ان کی جانب سے کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتا اور نہ اُسے ان کی مسابقت کا خوف ہے۔ حضرت محمدؐ کے بعد خود اسلام میں یا اس کے باہر کوئی اور بانی مذہب ایسا پیدا نہیں ہوا جس نے کامیابی کے ساتھ یہ دعوے کیا ہو کہ اس کا دین اسلام سے بہتر ہے یا اس کی تکمیل کرتا ہے اور وہ ایک نئے عالمگیر مذہب کا بانی ہے۔ اس لئے اسلام کا یہ دعوے کہ وہ دین مکمل اور خدا کا آخری پیغام ہے خود اس کی ترقی اور تاریخ سے ثابت ہے۔

مسلمانوں کا یہ عقیدہ کہ اسلام خدا کا دیا ہوا آخری اور قطعی پیغام ہے اس قدر مضبوط اور راسخ تھا کہ آغاز نبوت کے بعد ایک سو سال کے قلیل عرصہ میں جب وہ وادی سندھ سے لے کر ہسپانیہ تک سارے ممالک کو زیر نگیں لے آئے تھے انہیں اپنے مذہب کو خیر باد کہنے کا خیال تک بھی نہ آیا۔ حالانکہ انہیں ان فتوحات کے دوران میں ایسی ایسی تہذیبوں اور ثقافتوں سے واسطہ پڑا جو ان کی (عربوں کی) اپنی تہذیب و ثقافت سے کہیں زیادہ بہتر تھیں۔ کس قدر مختلف رہا ہے جرمن اور سلافی اقوام کا طرز عمل حضرت عیسیٰ کے تین چار سو سال بعد! ان کے ہاں اپنی قدیم الہامی کتابیں نہ تھیں لہٰذا انہوں نے اپنے ہمسایوں اور محکوموں کے مذاہب کو نہایت آسانی سے اختیار کر لیا۔

شروع شروع میں مسلمان عربوں نے اپنے سچے دین کی (جیسا کہ اپنے مذہب کے متعلق ان کا ایمان ہے) فوقیت و امتیاز میں اور سیاسی غلبہ و اقتدار میں جو انہیں حاصل ہوا کسی اور کو سہیم و شریک بنانے کا کوئی رجحان نہیں ظاہر کیا لیکن اُن غیر عرب جماعتوں کی مسلسل اور پیہم کوششوں کی بدولت جو از خود اسلام سے بخلوص دل متاثر ہوئیں اور جنہیں ایک قلیل عرصہ کے لئے خلیفہ وقت یعنی عمر ثانی کی سرپرستی و حمایت بھی حاصل رہی۔ شامی، عراقی، قبطی اور ایرانی اسلام سے مشرف ہوئے۔ بالآخر ممالک شرقی میں خاندان بنو امیہ کی خلافت بھی اسی لئے ختم ہو گئی تاکہ اسلامی ریاست کا تصور بہ حیثیت ایک مذہبی حکومت کے جیسا کہ اسلام

واقعہ ہے مستحکم اور برقرار رہے۔ ہوسکتا ہے کہ ان نئی اقوام کا اسلام کو اختیار کر لینے کا جذبہ محرکہ ہمیشہ دینی نوعیت کا نہ ہو لیکن عمرانی مساوات اور مرفہ الحالی کے حصول کی خواہش جو تبدیلِ مذہب کے نتیجہ میں حاصل ہوتی تھی اس کی محرک ضرور ہوتی تھی۔ اس طرح رفتہ رفتہ اسلام میں بہت سا نیا خون شریک ہو گیا۔ ان نومسلموں کے تبدیلِ مذہب کے اغراض خواہ کچھ ہی رہے ہوں، ان کے لڑکوں اور پوتوں نے اسلام کی صحیح تعلیم و تربیت کی بدولت بہت کار نمایاں کئے اور صحیح معنوں میں امت مسلمہ کا جزو بن گئے حتیٰ کہ بنی عباس کے عہد میں عربوں کی نسلی برتری اور تفوق کا احساس بالکل مٹ گیا اور ہندوستانی مسلمانوں میں ذات پات کی تمیز بھی باقی نہیں رہی۔ بالآخر سب مسلمان بلحاظ رنگ و نسل بھائی بھائی ہو گئے۔ یہ جذبۂ اخوت دوسرے (مثلاً مسیحیت) کی بہ نسبت اسلام میں کہیں فراواں تھا۔

ایرانیوں کے مسلمان ہو جانے سے اسلام کو ایک خاص اور اہم فائدہ حاصل ہوا۔ یہ اپنے ساتھ اسلام میں ایک گہرا مذہبی تصور لائے جس کے طفیل تصوف کے رازہائے سربستہ منکشف ہوئے[1]۔ اس کامیابی میں عراقیوں اور شامیوں کا بھی اتنا ہی گراں قدر حصہ ہے۔ اس کے علاوہ اہل ایران نے اسلامی الٰہیات کی ترتیب و تدوین میں بھی جو کام کیا ہے جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ لیکن یہ بھولنا نہ چاہیئے کہ اہل ایران ایک نہایت قدیم اور دیرینہ تہذیب و تمدن کے مالک تھے۔ اور یہ دراصل ان ہی کی کوششوں کا اثر ہے جو اسلام تہذیب و تمدن کے اعتبار سے اس زمانہ کی یورپین ثقافت پر بھی ہر لحاظ سے بازی لے گیا۔ مگر ایرانیوں میں اپنی اصلی تہذیب و تمدن کا کچھ ایسا احساس تھا کہ (دیگر اقوام کے برعکس) انہوں نے عربی زبان کو اپنانے کے لئے کسی خاص ذوق و شوق کا اظہار نہیں کیا[2]۔ اور خلافت کی جو نزاعات ہوئیں ان میں اپنی حمایت کے عوض اپنی تہذیب اور اپنی زبان کو بھی تسلیم کرا لیا (اگرچہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس رابطہ سے فارسی زبان پر عربی زبان کا اچھا خاصا اثر پڑ گیا)۔ اسلام کی یہ رواداری کہ وہ نومسلم اقوام سے ان کی اپنی قومی خصوصیات کے ترک کرنے کا مطالبہ نہیں کرتا خود اس کی ترقی میں بڑی حد تک ممد و معاون رہی ہے۔ اور وہ حقیقی معنوں میں ایک عالمگیر مذہب ثابت ہو گیا۔ اسی طرح ترکی، ہندی، انڈونیشی، بربر وغیرہ دوسری بہت سی قومیں حلقۂ اسلام میں داخل ہونے کے لئے تیار ہو گئیں۔

سنہ ۱۱۱۱ء میں اسلام کی بین الاقوامی ترقی اپنے خاتمہ تک جا پہنچی۔ جبکہ امام غزالی (جو ایرانی نژاد تھے) کی تصنیفات و تعلیم کے ذریعہ تصوف پر خاص توجہ دی گئی اور مقبول عام مروجہ طرائق مذہبی (مثلاً ترتیب۔ میلاد وغیرہ) جو اس اثنا میں پھیل گئے تھے اختیار کر لیا گیا۔ اسی طرح اسلام میں انسانیت نوازی، اخوت و رابطۂ باہمی کی ایک عمیق لہر دوڑ گئی جس سے

---

[1] یہ فائدہ نہیں بلکہ اسلام کو اس سے سب سے بڑا نقصان پہنچا۔ لیکن اس نقصان کا اندازہ ایک غیر مسلم نہیں لگا سکتا۔ غیر مسلم تو ایک طرف خود مسلمان جن کی نگاہ اس دین پر نہیں جو قرآن میں دیا گیا ہے اس نقصان کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ اندازہ لگانا تو ایک طرف وہ بھی اسے (مقالہ نگار کی طرح) اسلام کا بہت بڑا فائدہ قرار دیتے ہیں۔

[2] عوام نے تو نہیں کیا لیکن عہد عباسیہ کے بڑے بڑے مصنف ایرانی تھے جنہوں نے عربی زبان میں سب کچھ لکھا۔

اس مذہب کا روح وانفرادیتِ انسانی سے گہرا تعلق ہوگیا اور یہ ایک ایسا مذہب ہوگیا جو سارے انسانی تقاضوں کی تکمیل کرتا ہے[1]۔ اس مذہب میں نہ رسومات ہیں نہ بت پرستی نہ پیشہ ور مقتدایانِ مذہب ہیں اور نہ کوئی ایسا دینی راہنما جو گناہ اور معصیت سے مبرا ہو۔ یہاں کوئی مجلس بھی مسیحیت کی طرح چرچ کونسل کی طرح نہیں جو اختلافات و نزاعات کا تصفیہ کرے۔ بریں ہمہ یہ قابلِ ذکر خصوصیت ہے کہ بانوے فی صدی مسلمان اسلام کے ایک ہی فرقہ اہل سنت سے متعلق ہیں اور بقیہ دوسرے مذاہب فقہ کے پیرو۔ ان ہی میں سے ایک فرقہ اثنا عشری ہے جس کے عقائد کو شاہانِ صفویہ ایران نے سولہویں صدی میں فروغ دیا۔ سارے ایرانی اور اکثر آذربائیجانی اسی سے تعلق رکھتے ہیں اور اب تو ان ممالک میں شیعیت کو قومی مذہب کا درجہ حاصل ہوگیا ہے۔ ۹۲ فی صد والے گروہ اہل سنت میں بھی گو مذاہب فقہ مختلف ہیں لیکن ان میں کوئی اختلاف نہیں۔ یہ ایک دوسرے کو مانتے اور اس کا لحاظ رکھتے ہیں۔ فرقہ اہل سنت کی یہ خصوصیت اور ہمہ گیریت دنیا کے کسی اور مذہب میں نہیں پائی جاتی۔ گو کہیں کہیں مثلاً بنگال[2] یا تیمور کے عہد میں لوگوں کو بہ جبر مسلمان بنا لینے کی بھی مثالیں مل جاتی ہیں، لیکن بہ حیثیت مجموعی اسلام اپنی رواداری اور ہمہ گیریت کی بدولت اس قابل ہوگیا کہ بہت سی اقوام جو پہلے مسیحی یا مانوی تھیں یا بدھ مت اور ہندو مذہب کی پیرو، جوق در جوق حلقہ بگوشِ اسلام ہوگئیں۔ کس قدر حیرت انگیز ہے یہ حقیقت کہ کوئی قوم جس نے ایک بار اسلام قبول کر لیا پھر اس سے برگشتہ اور مرتد نہیں ہوئی! شاذ و نادر ہی ایسا ہوا ہے کہ یہاں یا وہاں مسلمانوں کو اپنا مذہب چھوڑ کر دوسرا مذہب قبول کرنا پڑا ہے جیسے تاتاریوں کو روس میں، اور اندلسی مسلمانوں کو اسپین میں مسیحیوں کی فتح کے بعد۔ لیکن ایسے حالات زیادہ دیرپا اور موثر نہ تھے۔ پندرھویں صدی کے بعد سے بہت سی مسلم اقوام کو غیر مسلم مسیحی سلطنتوں، حتیٰ کہ نوآبادیاتی مستبد حکمرانوں کے تحت محکومی کی زندگی بھی بسر کرنی پڑی ہے لیکن انہوں نے اپنے مذہب کو نہیں چھوڑا اور انہوں نے وہ پامردی و استقامت دکھائی ہے جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس کے برعکس بلقان کے عیسائیوں کو دیکھئے کہ سلاطین ترکیہ کے زیرِ تسلط آنے کے بعد وہ از خود جوق در جوق داخلِ اسلام ہو گئے۔ اور البانیہ کا تو بیشتر حصہ مسلمان ہوگیا۔ اسلام کے اس وسیع اور ہمہ گیر اثر سے دنیا کا کوئی بڑا مذہب بچ نہیں سکا ہے۔ اس کے برعکس اسلام کو دیگر مذاہب کے ہاتھوں اس قسم کا کوئی "صدمہ" نہیں اٹھانا پڑا اور اس کے ماننے والے کبھی مرتد اور برگشتہ نہیں ہوئے۔ الغرض پیغمبر اسلام کا یہ دعویٰ کہ وہ تمام انسانیت کے لئے مکمل دین اور خدا کا آخری پیغام لائے ہیں، اب تک اپنی جگہ پر قائم ہے اور کسی نئے عالمی مذہب کے شیوع سے شرمندہ تردید نہیں ہوا۔ تاریخ خود اس دعوے کی کامیابی پر شاہد اور اس دعوے پر مہرِ تصدیق ثبت کر رہی ہے۔

---

[1] مقالہ نگار کا کہنا ہے کہ تصوف کے اثر سے ایک بین الاقوامی سیاسی اور معاشرتی تحریک کی بجائے انفرادی اور پرائیوٹ مذہب بن گیا۔ یہ ٹھیک ہے لیکن اس پر اتنا اضافہ اور کر لینا چاہیے کہ اس طرح اسلام ایک اور ہی مذہب بن گیا۔ وہ دین نہ رہا جسے خدا نے نبی اکرمؐ کو دیا تھا۔ (طلوع اسلام)

[2] کولوکیم میں ایک نمائندے نے اس کی پرزور تردید کی تھی۔ (طلوع اسلام)

ان حقائق کی بنا پر یہ آسانی سے سمجھ میں آجائے گا کہ اپنے دین کے بارے میں مسلمانوں کے قلوب کیوں اس قدر فخر و ناز سے معمور ہیں اور وہ کیوں اس شدت سے اپنے مذہب پر جمے رہتے ہیں؟ یہی وجہ تھی کہ اسلام ۱۲۵۸ء میں خلافت عباسیہ کی شکست و ریخت اور ۱۹۲۲ء و ۱۹۲۴ء میں سلطنت ترکیہ کا زوال اور الغائے خلافت کے صدمے بآسانی برداشت کر گیا۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مسلمانوں کا اتحاد و اتفاق جو صدیوں پہلے مرتب ہوا تھا انھیں اس قابل بنائے ہوئے ہے[1] کہ وہ بڑے سے بڑے سیاسی صدمے آسانی سے جھیل لیتے ہیں اور ان کے قدم نہیں ڈگمگاتے۔

اس طرح مسلمانوں میں جو خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے اُس سے حالیہ زمانوں میں اشاعت اسلام کے دروازے اور کھل گئے ہیں ایشیا میں تو خیر اسکی کچھ ایسی زیادہ اشاعت نہیں ہو رہی جہاں دوسرے متحکم عالمگیر مذاہب سے اس کے ڈانڈے مل گئے ہیں اور سوویٹ روس یا چین میں مزید توسیع کے امکانات محدود ہو گئے ہیں۔ لیکن براعظم افریقہ کے باشندوں میں اسکی توسیع و اشاعت کے بیشتر مواقع حاصل ہیں اور وہاں تیزی سے پھیل رہا ہے۔ جیسا کہ حال ہی میں مردم شماری کے اعداد بتا رہے ہیں وہاں گذشتہ چند سالوں کے عرصہ میں نومسلموں کی تعداد لاکھوں تک جا پہنچی ہے اور جب دنیا کی پرانی مسلم اقوام کی روز بروز بڑھتی ہوئی آبادی کو بھی پیش نظر رکھا جائے مسلمانوں کی تعداد میں ادھر کئی ملین نفوس کا اضافہ ہو گیا ہے۔ ان حالات میں اسلام کو کسی منظم تبلیغی مشن کی ضرورت ہی نہیں[2] اپنے حدود مملکت کے کنارول پر تاجروں اور سوداگروں کے ذریعہ اسلام کی خود بخود اشاعت ہو جاتی ہے۔ اور چونکہ ان خطوں میں زیادہ تر سنی مسلمان آباد ہیں اس لئے لازماً اضافہ بھی اسی فرقہ کی تعداد میں ہوتا ہے۔ بیعت کے لئے قبول مذہب کے وقت جو پچھلے گناہوں کے اعتراف و اقبال کی شرط کی دشواری ہے وہ یہاں مطلقاً نہیں مسلمان ہمسایوں کو دیکھ کر ہی اُن کا مذہب بآسانی قبول کر لیا جاتا ہے۔ ان وجوہات کی بنا پر اسلام اپنی آئیڈیالوجی کے پیش نظر ایک ایسی مضبوط ہستی ہے جسے عیسائیت کی تبلیغی کوششوں اور کمیونسٹوں کی تحریک سے کچھ بھی کھٹکا نہیں۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے غیر مسلموں کو ماضی کی طرح مستقبل میں بھی سابقہ پڑے گا اس لئے انھیں اس حقیقت کا اندازہ لگا لینا چاہیئے۔ اب ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ مسلمانوں اور دوسرے مذاہب کے پیروؤں کے مابین ایک دوسرے کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا کی جائے تاکہ ایک آزاد ماحول کی دنیا میں ہر ایک کے لئے مساوی حقوق تسلیم کئے جا سکیں۔ اور یہ بھی ضروری ہے کہ غیر مسلموں کے سامنے حقیقی اسلام کو پیش کر کے یہ بتایا جائے کہ مسلمانوں میں اس قدر خود اعتمادی کیوں ہے اور کیوں وہ اپنے دین اور ثقافت پر اس استقلال کے ساتھ قائم ہیں اور یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جس سے انھیں کوئی محروم نہیں کر سکتا۔

---

[1] اے کاش! یہ کہیں حقیقت ہوتی!! (طلوع اسلام)

[2] یہ غلط ہے۔ تبلیغ کی ضرورت سے ہم کبھی مستغنی نہیں ہو سکتے۔ لیکن اب تبلیغ مشنریوں کے ذریعے نہیں ہو سکتی۔ اب اس کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ کسی ایک خطۂ زمین میں خالص قرآنی نظام کو متشکل کر کے دنیا کو دکھایا جائے کہ اس نظام کے نتائج کیا ہیں۔ یہی طریق تھا جس سے رسول اللہ کے زمانہ میں اسلام پھیلا تھا اور اسی سے اب پھیل سکتا ہے۔ طلوع اسلام کے پیش نظر یہی مقصد ہے۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

مذاکرۂ عالم اسلامی (لاہور)

# جواں سال ترکوں کے سیاسی افکار

از ڈاکٹر برنارڈ لیوس (یونیورسٹی آف لندن۔ امریکہ)

سلطنت عثمانیہ میں اٹھارھویں صدی کے اختتام ہی سے آئین پسندانہ اور لبرل خیالات سرایت کرنے لگے تھے۔ یوں تو صادق رفعت پاشا (سنہ ۱۸۰۷ء۔ سنہ ۱۸۵۶ء) کی تحریروں میں بھی اس قسم کے افکار کی مبہم جھلکیاں مل جاتی ہیں، اور انھوں نے مصطفیٰ رشید پاشا اور سلطان عبدالمجید کی نافذ کردہ اصلاحات پر کسی قدر روشنی ڈالا تھا۔ پھر اس سلسلے میں اصلاح پسند وزیر اعظم بیرقدار مصطفیٰ پاشا نے سنہ ۱۸۰۸ء میں امیروں کی اسمبلی کا اجلاس استنبول میں اس لئے منعقد کیا کہ اس کی اصلاحات کے پروگرام کی توثیق ہو سکے، اس کے بعد سنہ ۱۸۲۹ء میں مصر میں محمد علی پاشا نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ اور ۱۵۶ اراکین پر مشتمل ایک مشاورتی کونسل قائم کی جس کا اجلاس سال میں صرف ایک بار چند روز کے لئے ہوتا۔ اس کے علاوہ سنہ ۱۸۴۵ء میں خود سلطان عبدالمجید نے ایک اسمبلی قائم کی جس میں ولایات کے بعض سرکردہ اشخاص شامل کئے۔ لیکن یہ تجربہ بھی کامیاب نہ ہوا۔ اس کے بعد سنہ ۱۸۶۱ء میں تونس کے بے نے سب سے پہلے کسی اسلامی ملک میں مغربی طرز کے آئین کا نفاذ کیا۔ اگرچہ بے نے انتظامیہ کے اختیارات کو اپنے لئے محفوظ رکھا مگر قانون سازی کے اختیارات میں اس نے ایک نامزد کونسل کو بھی شریک کر لیا اور بالآخر سنہ ۱۸۶۶ء میں مصر کے خدیو اسماعیل نے پہلی بار ایک منتخب اسمبلی کے قیام کا تجربہ کیا۔

سنہ ۱۸۶۰ء کے لگ بھگ پہلی دفعہ حکومت کے اعمال و افعال پر آزادانہ نکتہ چینی کی گئی اور آئینی اصلاحات کا ایک پروگرام بھی سامنے آیا۔ یہ افکار سب سے پہلے ابراہیم شناسی، نامق کمال اور ان کے دوستوں کے حلقے میں ملتے ہیں اور ان کا اظہار اس عہد کے اخباروں اور رسالوں میں نظر آتا ہے۔ آزادی پسندوں کا یہ گروہ جسے "جواں سال ترکوں" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے سنہ ۱۸۶۷ء میں جلاوطن کر دیا گیا۔ اور سنہ ۱۸۷۱ء تک واپس نہ آسکا۔

اس گروہ کی اہم ترین شخصیتوں میں سے ایک ضیاء پاشا تھے (سنہ ۱۸۲۵ء۔ سنہ ۱۸۸۰ء) یہ شخص کسی اعتبار سے مغربیت کا غیر مشروط حامی نہ تھا اور اس کو کئی پہلوؤں سے ترکی کے لئے مضرت رساں سمجھتا تھا۔ اپنے ایک مضمون میں وہ لکھتا ہے کہ "اگر ۱۰۰۰ھ سے ۱۲۵۵ھ تک (سنہ ۱۵۹۲ء۔ سنہ ۱۸۳۹ء) سلطنت انحطاط کی راہ پر دو گھوڑوں والی بگھی کی رفتار سے چلی ہے تو ۱۲۵۵ھ سے ۱۲۸۵ھ تک (سنہ ۱۸۳۹ء۔ سنہ ۱۸۶۹ء) ریل گاڑی کی سرعت سے آگے بڑھی ہے۔" ضیاء پاشا کو پارلیمانی حکومت کی افادیت اور

ضرورت کے بارے میں کوئی شبہ نہیں تھا۔

اس سلسلہ میں اس کے افکار اس کی ان دو کتابوں میں ملتے ہیں جو اس نے جلاوطنی کے زمانے میں لکھیں۔ ان کتابوں میں سے ایک کا عنوان ہے "خواب"۔ جو ضیاء نے ہیمپ سٹیڈ ہیتھ کی ایک بنچ پر سوئے ہوئے دیکھا تھا۔ ضیاء نے اس خواب کی تفصیل جس طریقے سے لکھی ہے اس سے سترھویں صدی کے ترک شاعر نیسی کے خیالی مکالمات اور اسی نوع کی دوسری تصنیفات کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ اس خواب میں ضیاء سلطان عبدالعزیز سے ہم کلام ہوتا ہے اور اسے ملک کے حال تباہ سے خبردار کرتا ہے۔ اس پر سلطان ضیاء پر یہ الزام لگاتا ہے کہ وہ قومی اسمبلی کی تشکیل کی سفارش کر کے اس کے اقتدار کو صدمہ پہنچا رہا ہے۔ جس پر ضیاء یہ جواب دیتا ہے کہ اس قسم کی اسمبلی کے وجود میں آجانے پر ترکی دنیا کی مہذب حکومتوں کی صف میں کھڑا ہو سکے گا اور سلطان کے قانونی اختیارات کو بھی کوئی ٹھیس نہ پہنچے گی۔ پھر یہ بھی دیکھنے کی ضرورت ہے کہ برعظم یورپ میں دوسری حکومتوں کی حالت کیا ہے؟ کیا روس کے سوا کسی اور جگہ مطلق العنان حکومت کا وجود بھی ہے؟ اور کیا خود روس کی حکومت رفتہ رفتہ دوسری مغربی حکومتوں کے نقش قدم پر نہیں چل رہی ہے؟ پھر کیا فرانس، آسٹریا، اٹلی، پروشیا کے شہنشاہوں اور خود ملکہ انگلستان کی قوت اور شاہانہ اقتدار میں زار روس کے مقابلہ میں کوئی کمی آگئی ہے؟ پھر جب ہماری حکومت بھی یورپی حکومتوں کے کنبے کی ایک رکن سمجھی جاتی ہے تو کیا ہمارے لئے یہ ممکن ہے کہ ہم دنیا سے کوئی الگ طریق کار اختیار کریں؟

ضیاء کے اس "خواب" میں سلطان ان باتوں سے مطمئن نظر نہیں آتا۔ اور کہتا ہے کہ ان تمام دوسری حکومتوں میں سے ہر ایک حکومت میں ایک ہی قوم بستی ہے اس کے برعکس میری حکومت میں مختلف المذاہب لوگ بستے ہیں اور چونکہ ہر گروہ اپنے مفاد کے حصول کی کوشش کرے گا۔ لہٰذا قومی اسمبلی کشمکش کا ایک اکھاڑا بن کے رہ جائے گی اس سے انتشار پھیلے گا اور اختلافات ابھریں گے۔ ضیاء سلطان کے اس اعتراض سے اتفاق کرتے ہوئے کہتا ہے۔ "ہاں حضور والا اگر ہمارے ملک میں بننے والی قومی اسمبلی ابتدا ہی سے اس قسم کے اختیارات کی حامل ہو جو فرانس اور انگلستان کی پارلیمنٹوں کو حاصل ہیں تو پھر آپ کا یہ ارشاد بجا ہوگا۔ لیکن میری مراد کچھ اور ہے۔ انہی اسباب کی بنا پر سلطنت عثمانیہ میں قائم ہونے والی قومی اسمبلی کو شروع شروع میں محدود اختیارات حاصل ہونے چاہئیں اور پھر جب کسی قسم کا خطرہ باقی نہ رہے تو ان اختیارات کو توسیع دی جا سکتی ہے۔ ضیاء کا یہ خواب اس وقت ختم ہوتا ہے جب ایک پہرے دار اسے جگا دیتا ہے۔

جلاوطنی کے زمانے میں ضیاء نے ایک اور مضمون لکھا جس میں رسول مقبول صلعم سے منسوب اس حدیث کو موضوع بتایا گیا ہے۔ "میری امت میں اختلاف رائے اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے"۔ اس ارشاد کو جسے قبل ازیں شریعت مطہرہ کے مختلف مذاہب کے اختلافات کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے پیش کیا جاتا تھا۔ ضیاء نے نئے معنی دیئے اور اسے اسمبلی کو وجود میں لانے کے لئے بطور حجت پیش کیا۔ کیونکہ اس کے نزدیک اسمبلی میں مختلف خیالات کے تصادم اور آویزش سے حقیقت نمایاں ہوگی اور اس اسمبلی میں ذمہ دار سیاستدانوں کو اپنے افعال کے لئے حزب اختلاف کے سامنے جواب دہ

ہونا پڑے گا۔[1]

جواں سال ترک شعرا میں سے ایک اور بہت بڑے صاحب کمال شاعر نامق کمال (۱۸۴۵ — ۱۸۸۸) نے بھی اپنی نظم آزادی میں اس حدیث کو پیش کیا ادیب نامق کمال ہی ہے جس کے افکار اور تحریروں نے بعد کے ترکی ادب اور سیاست پر گہرے اثرات چھوڑے اور اس کا یہ اثر صرف ترکی تک محدود نہ رہا۔ موجودہ دور میں بعض اوقات اس حقیقت کو فراموش کر دیا جاتا ہے کہ انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے آغاز میں شام اور عراق کے عربوں کے ایک بہت اہم روشن دماغ طبقے ترکوں کے مدرسوں کالجوں میں تعلیم پائی اور ترکی کے ان افکار کو جذب و قبول بھی کیا۔ چنانچہ جواں سال ترکی کے سیاسی افکار کی بہت سی خصوصیات دنیائے عرب میں پھیلیں اور یوں بالواسطہ طور پر وسیع تر اسلامی دنیا بھی ان سے متاثر ہوئی۔

ترکی میں نامق کمال کو دو قسم کے افکار یعنی آزادی اور وطن پرستی کا پیامبر سمجھا جاتا ہے۔ اس نے مقالوں، مضامین، ناولوں، ڈراموں اور نظموں کے ذریعے ترکی کے مسلمان قارئین کو انیسویں صدی کے یورپ کے لبرل خیالات کی خصوصیات سے روشناس کرایا لیکن یہ کچھ اس انداز سے کیا کہ افکار مسلمانوں کی روایتوں اور نظریات کے سانچے میں ڈھلے ہوئے نظر آتے ہیں۔

نامق کمال اپنی پرجوش وطن پرستی اور آزاد خیالی کے باوجود ایک سچا اور پکا مسلمان تھا۔ چنانچہ جس وطن کی محبت کے نغمے وہ گاتا ہے۔ اگرچہ وہ ایک خطۂ زمین ہی ہے۔ اور وہ ملت نہیں ہے پھر بھی وہ "اسلامی سلطنت عثمانیہ" کا قیام عمل میں لانا چاہتا ہے اپنی ساری زندگی میں وہ بڑی مضبوطی سے روایتی اسلامی اقدار اور عقیدوں سے وابستہ رہا اور اکثر اس نے "تنظیمات" سے تعلق رکھنے والے افراد پر بڑی سختی سے نکتہ چینی کی کیونکہ وہ لوگ قدیم اسلامی روایات کے بہترین حصے کی حفاظت میں ناکام رہے تھے یہی نہیں اس نے ان لوگوں کو اس بات کی تحریک بھی دی کہ وہ مغرب کے نئے اداروں کو اپنے ملک میں اپنانے کی کوشش کریں۔ اس نے اسلامی اقدار کی حمایت کی اور ان اسلامی کارناموں کی مدافعت کا حق بھی ادا کیا جنھیں مغرب کے بعض لوگ گھٹا کر پیش کرتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اس نے عثمانیوں کی رہنمائی میں پان اسلامی وحدت کا نعرہ بھی بلند کیا۔ تاکہ تہذیب جدید کو ایشیا، اور افریقہ میں جذب کر کے یورپ کے جواب میں ایشیا کا "توازن طاقت" قائم کیا جا سکے۔

وہ مغربی تہذیب کے کارہائے نمایاں سے گہرے طور پر متاثر تھا۔ مگر اس کے نزدیک اسلامی دنیا کی پسماندگی "مطلق" نہیں بلکہ اضافی حیثیت رکھتی تھی، جس کی وجہ یہ نہ تھی کہ اسلام میں بالذات کوئی نقص تھا۔ بلکہ یہ مغرب کا اقتدار تھا جس نے مشرق کو ترقی کی راہ پر گامزن ہونے کے مواقع سے محروم کر دیا تھا۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ اسلامی ریاستوں کو طرز جدید اختیار کرنا چاہیئے۔ لیکن اس میں نقالی سے کام نہیں لینا چاہیئے۔ اور اپنی روایات۔ معتقدات اور اصولوں کے دامن کو ہاتھ سے نہ چھوڑنا چاہیئے۔ بلکہ اس کا عقیدہ یہ تھا

---

[1] یہ حدیث واقعی موضوع ہے۔ قرآن کی حدود کے اندر رہتے ہوئے آزادانہ اظہار خیال کے بعد (جسے مشاورت کہتے ہیں) ایک نتیجہ پر پہنچنا اور اسے ملت کے لئے بطور قانون نافذ کرنا۔ یہ ہے صحیح طریق کار۔ (طلوع اسلام)

کہ مغربی تہذیب کے بہترین عناصر وہی ہیں کہ جو قدیم اسلامی روایات سے ماخوذ ہیں یا ان روایات کی سطح پر پورے اترتے ہیں۔ چنانچہ اس کے نزدیک جب مسلمان مغربی تہذیب کو اپناتے ہیں تو وہ گویا درحقیقت اپنی ہی عمیق اور مستند روایات سے از سر نو رشتہ جوڑتے ہیں یہاں ناتق کمال ایک ایسا استدلال اختیار کرتا ہے جو بعد میں مسلمانوں کے ہاں رومانوی اور نقالانہ حیثیت رکھنے والی تصنیفات میں اہم مقام اختیار کر گیا۔ اس قسم کے استدلال کا مقصد کبھی تو یہ ہوتا تھا کہ مغربیوں کی نظر میں اسلامی روایتی اقدار کے وقار کو بڑھایا جائے مگر بیشتر اس کا مقصد یہ رہا ہے کہ اصلاح پسندوں کے خیالات کو کٹر قسم کے مسلمانوں کے لئے زیادہ سے زیادہ قابل قبول بنایا جائے۔

ناتق کمال کے سیاسی افکار بڑی حد تک مانتسکیو (MONTESQUIEU) اور روسو (ROUSSEAU) کے خیالات سے متاثر ہیں اور حکومت کی عملی شکل سے متعلق اس کے نظریات لندن اور پیرس کی پارلیمنٹوں کے نظام پر مشتمل ہیں اس کے سیاسی افکار پر جس چیز نے انتہائی گہرا اور پائیدار اثر چھوڑا وہ مانتسکیو کی تصنیف "اسپری دالوے" (ESPRIT. DES LOIS) ہے جس کا اس نے ۱۸۶۳ء میں ترجمہ چھاپنا شروع کیا تھا۔ اپنے بعد کے مضامین میں اس نے مانتسکیو کے افکار کو اصول شریعت سے مطابقت دینی شروع کی۔ اس کا یہ اقدام بالکل ویسا ہی تھا جیسے ابتدائی دور کے مسلمانوں نے ارسطو کے فلسفے اور قرآن مجید کے الہیاتی افکار میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی تھی جس کے نتیجے میں دونوں کی نئی توجیہیں کرنا ضروری ہو گیا۔ کمال کے نزدیک شریعت کے منصفانہ اور عقل پسندانہ احکام، مانتسکیو کے ان نیچرل اصولوں سے مختلف نہیں ہیں جنہیں مانتسکیو "فطرت اشیاء" قرار دیتا ہے اور جس سے قوانین نمودار ہوتے ہیں۔ لہٰذا کمال کے اس نقطۂ نظر کو خدا کے بارے میں ایک طرح کے صوفیانہ نقطۂ نظر سے مطابقت دی جا سکتی ہے۔

فطری یعنی خدائی قانون کا ایک بنیادی اصول آزادی ہے۔ کمال پہلا شخص نہ تھا جس نے ترکی میں انسانی حقوق اور پارلیمانی طرز حکومت کے بارے میں کچھ کہا ہو۔ لیکن وہی وہ پہلا شخص ہے جس نے ان دونوں چیزوں کو مربوط کیا۔ اور آزادی اور حکومت خود اختیاری کے بارے میں ایک واضح تصور قائم کیا۔ صادق رفعت پاشا نے انسان کے آزادی کے بنیادی حق کا مطالبہ تو کیا لیکن وہ اس حق کی حفاظت کے لئے اس کے سوا اور کوئی طریقہ تجویز نہ کر پایا کہ بادشاہ کو انصاف سے حکومت کرنی چاہیئے۔ اسی طرح ضیا پاشا نے آئین اور اسمبلیوں کے خیالات تو پیش کئے مگر ان کے ذریعہ وہ زیادہ سے زیادہ سلطنت عثمانیہ کو مغربی طرز حکومت کی شکل دینا چاہتا تھا۔ کمال کے نزدیک بھی حکومت کا اولین فرض انصاف سے حکومت کرنا ہے لیکن اس کے علاوہ اس نے شہریوں کے ایسے سیاسی حقوق کے بارے میں بھی ایک واضح نقطۂ نظر اختیار کیا جن کا احترام انصاف کی رو سے حکومت کے لئے واجب ہو اور اس نے وہ وسیلے بھی تلاش کر لئے جن کے ذریعہ ان حقوق کی حفاظت بھی کی جا سکے۔

ان افکار کے لئے ناتق کمال نے اسلام کے ماضی میں سے نمونے اور مثالیں تلاش کرنے کی کوشش کی تھی چنانچہ اس نے عوام کے اقتدار اعلیٰ کو بیعت سے مطابقت دی۔ جو ایک طرح سے ہر نئے خلیفہ کے تقرر کے وقت ایک رسمی حلف نامۂ اطاعت تھا۔

جس کے ذریعے سے حکمراں اور رعایا میں معاہدے کی تکمیل ہو جاتی تھی۔ حکومت کی نمائندہ حیثیت اور حکومتی امور میں شاورت کے اصول کے سلسلہ میں اسے خود قرآن پاک سے استدلال مل گیا۔ اس ضمن میں تیسری سورۃ کی وہ آیت قابلِ ذکر ہے جس میں رسول اللہ کو یہ حکم دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے پیروکاروں کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کریں اور ان سے صلاح و مشورہ کریں[1]۔ یہ وہ آیت ہے جسے نامق کمال ضیا پاشا اور ان کے رفیقوں نے خوب آگے بڑھایا۔ اور جو انیسویں صدی کے ترکوں اور دوسرے آزاد منش مسلمانوں میں بہت مقبول تھی۔ کمال نے ایک قدم اور آگے بڑھاتے ہوئے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ اصلاحات کی تحریک کے آغاز سے پہلے خود سلطنتِ عثمانیہ بھی ایک طرح کی نمائندہ حکومت ہوا کرتی تھی جسے کہ اپنے خاتمے سے پہلے خود ینی چری کا عسکری نظام ایک اعتبار سے "قوم کی مسلح مشاورتی اسمبلی" کی حیثیت رکھتا تھا۔

مغربی پارلیمانی اداروں کو اسلامی روایات سے مطابقت دینے کی یہ کوششیں اسلامی قانون، دینیات اور تاریخی نقطہ نظر سے تحریری نکتہ چینی سے بچ نہیں سکتیں۔ تاہم اس کے باوجود ان کی کوششوں کو نہ صرف سلطنتِ عثمانیہ بلکہ اس کے باہر بھی قبول حاصل ہوا اور روشن دماغ مسلمانوں کی ایک پوری نسل ان افکار کی قائل ہوئی کیونکہ وہ روایتی اسلام سے مطمئن نہیں تھے۔ مگر جنہیں اسلام سے اتنا لگاؤ بھی تھا کہ وہ مغرب سے حاصل کردہ اقدار کا جواز اپنے اسلامی عقائد سے مہیا کریں۔ ان لوگوں کے افکار کے اثرات کا اندازہ نوجوان ترکیہ کے انقلاب کے بعد پیدا ہونے والے نتائج ہی سے کیا جا سکتا ہے۔

۴ر نومبر ۱۹۰۸ء کو عثمانی پارلیمنٹ کا افتتاح کرتے ہوئے سلطان نے جو تقریر کی اس کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں کہ " یہ ایک ایسا پارلیمانی طرزِ حکومت ہے جو شریعت نے تجویز کیا ہے"۔

———×———

(طلوعِ اسلام۔ ترکوں کے خیالات کی شدت درحقیقت قدامت پرست طبقہ کے متشدد خیالات کا ردِّ عمل تھی۔ جو وہاں صدیوں سے مسلط چلے آ رہے تھے۔ اگر اُن کے سامنے قرآن ہوتا تو وہ اصلاحات بھی کر سکتے اور اس قدر متشدد بھی نہ ہوتے یہ کام دورِ حاضر کے مفکرین کا ہے۔ جن کے سامنے قرآن ہو۔!)

———×———

[1] وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (طلوعِ اسلام)

**نوادرات**
(از علامہ اسلم جیراجپوریؒ) علامہ موصوف کے مضامین کا نادر مجموعہ
بڑا سائز ۴۰۰ صفحات قیمت: چار روپے

مذاکرۂ عالم اسلامی لاہور

# اسلام میں آزادیٔ مذہب

از پروفیسر محمد خلف اللہ۔ الیگزینڈریا یونیورسٹی۔ (قاہرہ)

یہ مقالہ اسلام میں آزادیٔ مذہب کے دو پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے۔ اول تو یہ کہ مسلمان کو یہ آزادی حاصل ہو کہ وہ اپنے مذہب کے بارے میں غور و فکر کر سکے۔ اور مذہبی احکامات و تصورات کو سمجھ سکے اور اس سلسلے میں سماج یا حکومت کی طرف سے کوئی مداخلت نہ کی جائے۔ اور نہ اس کے مذہبی خیالات کی بنا پر اسے مالی، ذاتی یا منصبی قسم کا کوئی خطرہ ہی درپیش ہو۔ دوسری چیز اسلامی سماج میں بسنے والے غیر مسلموں کی آزادی ہے تاکہ وہ اپنے مذہب کے مطابق اپنی زندگی بسر کر سکیں اور عبادت کی رسوم کو سرانجام دے سکیں اور اپنی مذہبی ہدایات کے مطابق، دو زندگی کی تنظیم کر سکیں۔ اور اس سلسلے میں نہ تو ان کے معاملات میں کوئی مداخلت کی جائے اور نہ ان کے مفادات اور عبادت کے مقامات ہی کو کوئی نقصان پہنچے۔

سوال یہ ہے کہ آزادی کے ان دو پہلوؤں کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر کیا تھا؟ اور اس نے صدیوں تک کیسے ارتقاء کی منازل طے کیں؟ کیا تاریخ کے کسی عہد میں یہ بھی ہوا کہ اسلام نے آزادی کے ان دونوں پہلوؤں پر پابندی عائد کی ہو یا ان میں سے کسی ایک پہلو کو دبایا ہو یا ان کے بارے میں دشمنی اور تشدد کا نقطۂ نظر اختیار کیا ہو؟

اسلام بنیادی طور پر دہریت، اور بت پرستی کے خلاف ایک بغاوت تھا۔ اس نے خدا کی وحدت پر اصرار کیا اور تمام الہامی مذاہب کی سچائی پر زور دیا۔ دوسرے الہامی مذاہب کے پیروکاروں کے بارے میں یہ چیز اسلامی نقطۂ نظر میں بنیادی شے کی حیثیت رکھتی ہے۔ قرآن مجید کا یہ ارشاد ہے کہ "تم یہ کہو کہ ہم خدا پر یقین رکھتے ہیں اور اس کی طرف سے جو وحی ہم پر نازل ہوئی ہے اس پر بھی یقین رکھتے ہیں اور حضرت ابراہیم، حضرت اسمٰعیل، حضرت اسحٰق، حضرت یعقوب اور ان کے قبائل اور حضرت عیسٰی اور حضرت موسٰی پر نازل ہونے والی وحی اور ان تمام پیغمبروں پر نازل ہونے والی وحی پر جو خدا تعالیٰ نے نازل کی یقین رکھتے ہیں۔ ہم ان میں سے کسی ایک کے بارے میں کوئی امتیاز نہیں کرتے اور ہم اسلام میں خدائے تعالیٰ کے سامنے سر جھکاتے ہیں، لہٰذا اگر وہ ویسے ہی معتقدات رکھتے ہوں جیسے کہ تم، تو پھر وہ حقیقۃً صحیح راستے پر ہیں لیکن اگر وہ اس سے روگردانی

کرتے ہیں تو وہی خسارے میں رہیں گے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے تمہیں ان کے مقابلہ میں موزوں سمجھا ہے اور اللہ تعالیٰ ہی سمیع و علیم ہے (۳: ۸۴ - ۸۵)

آیئے ہم تاریخ پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالیں اور یہ دیکھیں کہ اس اصول کو عمل میں کیسے لایا گیا۔

کفارِ مکہ کے ہاتھوں اذیتیں اٹھانے اور مصائب جھیلنے کے بعد مدینہ منورہ میں اہل ایمان کے ایک گروہ کی تنظیم کی گئی۔ رسول مقبولؐ نے مدینہ منورہ پہنچ کر جو اقدامات کئے ان میں سے ایک اولین اقدام یہ کیا کہ مدینے کے تین بڑے فریقوں یعنی مہاجرین کو انصارِ مدینہ اور یہودیوں کے درمیان ایک سمجھوتہ طے کرایا۔ ہمارے نقطۂ نظر سے یہ بات اہم ہے کہ اس حقیقت کو نمایاں کیا جائے کہ اسلام کے اس پہلے ہی معاہدے میں غیر مسلموں کی مذہبی آزادی کا صاف طور پر اور تاکیدی بیان تھا۔ اس کے بعد تاریخِ اسلام جس میں فتوحات بھی ہیں جنگیں بھی اور صلح نامے بھی ہیں، معاہدے اور سمجھوتے بھی ہیں اور بادشاہوں اور سلطنتوں کا قیام بھی ہے اس بات کا اظہار کرتی ہے کہ اسلام نے غیر مسلم شہریوں کی مذہبی آزادی کے بارے میں اپنی اس بنیادی پالیسی کو کیوں کرنبا ہا ہے۔ اس پالیسی کا بیان قرآن مجید کی ایک مشہور و معروف آیت میں ملتا ہے۔ "کہہ دو اے اہل کتاب! آؤ ہم اور تم مشترکہ امور کو آپس میں طے کرلیں کہ ہم خدا کے سوا کسی کی پرستش نہیں کرتے۔ ہم اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے اور ہم اپنے آپ میں سے خداؤں اور بتوں کی تعمیر نہیں کرتے سوائے اللہ کے۔[1] لیکن اگر وہ اس سے روگردانی کریں تو ان سے کہہ دو کہ اس بات کے گواہ رہیں کہ کم از کم ہم ضرور مسلمان ہیں۔" (سورۃ ۳: ۶۳)

پیغمبر مسلم نے اپنے ہمسایہ حکمرانوں اور سرداروں کو جو مراسلت بھجوائیں ان میں سے اکثر نے اس آیت کو کلیدی اہمیت دی۔ رسول کریم صلعم کی زندگی میں عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان ہمدردی اور دوستی کے جذبات پیدا ہوگئے۔ اور چیز قرآن مجید کی بکثرت حوالے میں میں آنے والی آیت میں بھی محفوظ ہے اور بہت سے تاریخی واقعات کے طور پر بھی۔ آیت قرآنی کا یہ ارشاد ہے۔ "اہل ایمان سے سب سے زیادہ محبت کرنے والوں میں تمہیں ایسے لوگ ملیں گے جو یہ کہتے ہیں کہ ہم عیسائی ہیں۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں ایسے لوگ ہیں جو علم کے حصول میں مگن ہیں اور ایسے لوگ ہیں جو تارک الدنیا ہیں اور جو درشت اور غصہ ور نہیں ہیں اور جب وہ پیغمبر اسلام کی وحی کو سنیں گے تو تم دیکھو گے کہ ان کی آنکھوں میں آنسو ہونگے کیونکہ وہ حقیقت کو پہچان سکتے ہیں اور وہ یہ دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے خدا ہم ان باتوں پر یقین رکھتے ہیں اور ان کی صداقت کی گواہی دیتے ہیں (سورۃ ۳: ۸۲، ۸۳)

جہاں تک تاریخی واقعات کا تعلق ہے میں ان دو مثالوں کا حوالہ دینا چاہتا ہوں کہ حبش کے حکمران نجاشی نے مکہ کے پہلے مسلمان مہاجروں کا بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا انھیں پناہ دی اور ان کے ساتھ بڑی مروت سے پیش آیا۔ اور جب نجرانی

---

[1] یہ ترجمہ صحیح نہیں ہے۔ (طلوعِ اسلام)

عیسائیوں کا ایک وفد مدینے میں رسول مقبولؐ کی خدمت میں حاضر ہوا تو انھوں نے مسجد میں اس کا استقبال کیا اور اس مسجد میں ہی اس وفد نے اپنی عبادت کی رسوم ادا کیں۔

جب اسلام پھیلا اور بزنطین اور ایران کی سرحدوں تک اس کا اثر چھایا تو مفتوح لوگوں کے بارے میں اسلامی حکمت عملی واضح کر دی گئی یعنی اگر مفتوح لوگ ایمان لے آئیں تو ان کے حقوق و فرائض بالکل وہی ہوں گے جو دوسرے مسلمانوں کے ہوں گے اور اگر وہ اپنے مذہب پر قائم رہنا چاہیں تو اس کی بھی انہیں مکمل آزادی ہوگی بشرطیکہ وہ ایک طرح کا دفاعی ٹیکس ادا کریں جو سلطنت کی تنظیم اور اس کو برقرار رکھنے میں مدد دے۔ لیکن اگر وہ ان دونوں متبادل شرائط میں سے کسی ایک کو بھی منتخب نہ کریں تو ذمیوں کو ریاست کا دشمن سمجھا جائے گا۔ اسلام کے پھیلنے اور فتوحات کے دوران میں اس پالیسی پر مستقل مزاجی سے اور سرکاری طور پر عمل ہوتا رہا۔ اس سلسلہ میں حضرت عمرؓ نے ساتویں صدی عیسوی میں جو دستاویز لکھی وہ بے حد تاریخی اہمیت رکھتی ہے۔ اس دستاویز کے ذریعے یروشلم کے لوگوں سے امن و سلامتی کا معاہدہ کیا گیا۔ اس دستاویز کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

"اللہ کے نام پر جو غفور الرحیم ہے وہ معاہدۂ حفاظت ہے جسے اللہ کا بندہ عمرؓ اہل ایمان کے کمانڈر کی حیثیت سے ایلیہ یروشلم کے لوگوں کے ساتھ طے کرتا ہے۔ عمرؓ ان لوگوں کو ان کی جان، مال، معبدوں، صلیبوں اور مریضوں اور صحت مند سب کی حفاظت کی ضمانت دیتا ہے اور یہ کہ نہ تو ان کے معبدوں پر قبضہ کیا جائے گا اور نہ ہی انہیں منہدم کیا جائے گا اور نہ ان کی کوئی زمین ہی ان سے چھینی جائے گی۔ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے احکام کی رو سے ہے اس کے پیغمبرؐ کے فرمان کی رو سے ہے اور پیشرو خلیفہ کے ارشادات کے مطابق ہے اور یہ تمام اہل ایمان کے منشا کے مطابق ہے بشرطیکہ یروشلم کے لوگ ٹیکس ادا کرتے رہیں۔" (عربی میں سیاسی دستاویزات کا مجموعہ۔ مرتبہ حیدر آبادی قاہرہ ۱۹۴۱ء)

جب عربوں نے مصر کو فتح کیا تو انھوں نے مصری عیسائیوں اور بازنطینیوں کے اختلافات کو رفع کیا اور عبادت اور مذہبی فکر کی آزادی سب کے لئے برقرار رکھی انھوں نے بطریق سربراہوں کو زمیندارانہ امور کے انتظامات سونپ دیئے اور بازنطینی دارالحکومت کے دوران حکومت میں جو گرجے منہدم ہوئے تھے انہیں واپس کر دیا۔

یہی طرز عمل ہسپانیہ میں اختیار کیا گیا جہاں کے تمام مفتوحین شہریوں کو مکمل آزادی حاصل تھی۔ اس چیز کو واضح ثبوتوں کے ساتھ زمانۂ حال کے ایک عیسائی مصنف "ایڈم میٹز" نے اپنی تصنیف "چوتھی صدی ہجری میں اسلام کی نشاۃ الثانیہ" میں بیان کیا ہے۔ اسی طرح سٹینلے لین پول نے اپنی تصنیف "ہسپانیہ میں عرب اقتدار کی داستان" اور سر تھامس آرنلڈ نے "اسلامی تعلیمات و تبلیغات" میں ثابت کیا ہے۔

ایڈم میٹز قرون وسطیٰ کی اسلامی تہذیب کے ایک خاص وصف کی طرف توجہ مبذول کراتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اسلام کے پیروکاروں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی صفوں میں دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کی ایک بڑی تعداد ملتی ہے۔ یہ صورت حال

جو ہم آہنگی اور رفیقانہ تعاون کی مقتضی تھی اس رواداری کا نتیجہ تھی جو اسلام میں ابتدا ہی سے پائی جاتی ہے اور جس سے اس عہد کا یورپ بے خبر تھا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ اسلام میں مذاہب کے تقابلی مطالعے اور علم کا ارتقاء ہوا اور عالموں کی ایک بہت بڑی تعداد اس طرف کھنچ آئی۔ اسلامی قوانین حکومت میں غیر مسلموں پر کاروبار یا کام میں حصہ لینے کے سلسلہ میں کبھی کوئی پابندی عائد نہیں ہوئی۔ چنانچہ بعض ترقی پذیر اسلامی مملکتوں میں غیر مسلموں کی بہت بڑی بڑی ملکیتیں تھیں اور بعض خاصے منافع بخش پیشوں اور کاروبار پر ان کا قبضہ تھا جن میں روپے کا لین دین اور طبابت خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اسلامی حکمرانوں نے شاذ ہی غیر مسلم رعایا کے معاملہ میں مداخلت کی بلکہ اس کے برعکس ان کے میلوں یا تہواروں اور رسوم میں حصہ لیا کرتے تھے۔

اسلام میں مذہبی آزادی کے تدریجی ارتقاء کا غیر جانبدارانہ جائزہ لینے کے لئے اتفاقی یا حادثاتی نوعیت کی ان کوتاہیوں کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے جو تاریخ میں ہمیں ملتی ہیں۔ وقتاً فوقتاً ایک یا دوسرے مسلمان ملک میں بدامنی رونما ہوتی رہی جب کہ عوام کے جذباتی ہجوم یا غلط حکمران یا کسی جلد باز فاتح نے غیر مسلم فرقے کے ساتھ ناروا سلوک اختیار کیا ہو یا ان کی ملکیت اور عبادت گاہوں کے تقدس کا احترام نہ کیا ہو۔ یہ اور اس قسم کے واقعات اس نوع کے ہیں جو جنگ کے نتیجے میں یا معاشرتی و سیاسی انتشار یا مذہبی جنون کی لہر کے باعث وجود میں آئے۔ لیکن یہ چیز مذہب نہیں ہے اور نہ اسے مذہبی آزادی کی نفی ہی قرار دینا چاہیئے یہ تو مستثنیات ہیں قوانین نہیں۔ مغرب کی مذہبی تاریخ بھی اس قسم کے واقعات سے مستثنیٰ نہیں ہے بلکہ اس میں تو رسوائی کے کچھ نمایاں انداز ہی نظر آتے ہیں۔

اگر ہم عہد حاضر کو سامنے رکھیں تو مکمل مذہبی آزادی کا ایک مثالی ملک مصر دکھائی دیتا ہے جو تاریخی طور پر اور تہذیبی و ثقافتی طور پر اسلامی ملک ہے۔ اس ملک کی غیر مسلم اقلیت دنیا کی خوشحال ترین اقلیتوں میں سے ہے۔ یہ لوگ پورے تحفظ اور آزادی کے ساتھ اپنی مذہبی زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہ اسلامی مساجد کے پہلو بہ پہلو اپنے گرجے اور معبد تعمیر کرتے ہیں۔ وہ اپنے مسلمان بھائیوں کے مذہبی اور قومی تہواروں میں اسی طرح شریک ہوتے ہیں جس طرح مسلمان ان کے ساتھ۔ وہ مادر وطن کی عظمت کی خاطر مشترکہ مساعی اور جد و جہد سے کام لیتے ہیں اور حکومت کے فرائض اور خدمات میں شریک ہوتے ہیں۔ سنہ ۱۹۵۶ء کے آئین میں مذہبی ہم آہنگی کے اس پہلو کو نمایاں شکل دی گئی۔ چنانچہ آئین کی دفعہ ۶ کے ماتحت ریاست تمام مصریوں کو آزادی، تحفظ، سلامتی اور یکساں مواقع ترقی کی ضمانت دیتی ہے۔ اسی آئین کی دفعہ ۳۱ میں یہ کہا گیا ہے کہ تمام مصری قانون کی نظروں میں برابر ہیں۔ وہ حقوق اور فرائض میں مساوی حیثیت رکھتے ہیں[1]۔ اور اس میں نسل، زبان، اصل، مذہب اور عقیدے کو کوئی سروکار نہیں ہے۔ دفعہ ۴۳ میں عقیدے کی آزادی کا اعلان کیا گیا ہے اور حکومت مذہبی رسوم وغیرہ

---

[1] حقوق میں اگر حکومت کے کاروبار اور مجلس قانون سازی میں شرکت اور کلیدی مناصب تک رسائی بھی شامل ہیں تو یہ چیز غیر قرآنی ہے۔ (طلوع اسلام)

وغیرہ کی ادائیگی کا ذمہ لیتی ہے۔ بشرطیکہ ایسی رسوم سے اخلاقِ عامہ اور امنِ عامہ کو کوئی صدمہ نہ پہنچے۔

آئین کی یہ دفعات لفظاً اور معناً اسلامی روح کے مطابق ہیں اور یہ اسلامی اصولوں کو حالات کے مطابق ڈھالنے اور اسلامی رواداری اور پرامن باہم وجودیت کی ایک ایسی مثال پیش کرتی ہیں جو جدید جمہوریت کا تقاضا ہے۔

آیئے ہم اس سوال کو بھی طے کرتے چلیں کہ خود مسلمانوں اور آئین کی مذہبی آزادی کا ان کی اپنی حکومت میں کیا حال ہوتا ہے۔ اسلام نے ابتدا ہی سے فرد کی آزادی اور غلامی کی زنجیروں سے اس کی رہائی اور انسانی وقار پر اصرار کیا۔ اسلام نے بہتر انسانی زندگی کے طرزِ عمل کے لئے بعض بہت وسیع اصول سامنے رکھے اور مسلمان عوام کو بدلتے ہوئے عہد اور حالات کے مطابق آزادانہ طور پر اپنے سماجی اور سیاسی نظاموں کو ترقی دینے کی اجازت دی۔ اسلام نے مسلمانوں کو کائنات کے بارے میں غور و فکر کی تحریک دی اور علم کے حصول کے لئے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا سبق دیا۔ قرآن مجید میں بکثرت ایسی آیات ملتی ہیں جن میں غور و فکر کرنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے اور خالص اور تجربی استدلال کو استعمال میں لانے کا تقاضا کیا جاتا ہے۔

تاریخ کے ابتدائی ایام میں مسلمانوں نے اپنی اس آزادی کا قرآن مجید کی تفسیروں اور روایتوں کی تشریح کے لئے اور فقہ کے اصولوں کا روزمرہ کے امور پر اطلاق کرنے کے لئے استعمال کیا۔ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں مختلف اور متصادم دبستانِ فکر بھی ابھرتے ہوئے ملتے ہیں۔ بالخصوص جدلیاتی مذہب میں جب کہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ حکومت کبھی تو ایک دبستان کی حمایت کرتی ہے اور کبھی دوسرے کی، حکومت کا اس طرح کا طرزِ عمل بعض اوقات عالمانہ تحقیق و تفحص کی آزادی پر اثر انداز ہوتا تھا۔ تیسری صدی ہجری میں حکومت کی مخالفت کی بنا پر جو معتزلہ کے نظریات کی حامی تھی۔ امام احمد ابن حنبل کو صعوبتیں اور مصائب برداشت کرنا پڑے۔

بعض اوقات حکومت کا تشدد کسی صوفی کو نشانہ بناتا جیسا کہ دسویں صدی ہجری میں حلاج کا واقعہ۔ لیکن یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کی وجوہات مذہبی نہیں تھیں بلکہ بہت سی تھیں جن میں سیاسی وجوہات بھی شامل ہیں۔

مذہبی قیود کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ کسی مفکر یا عالم پر دہریت اور الحاد وغیرہ کا الزام عاید کر دیا جائے[۱] مگر یہ رجحان اسلامی تاریخ کے دورِ انحطاط میں پیدا ہوا۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ سماجی اور ذہنی ترقی، مذہبی افکار اور نقطہائے نگاہ میں رواداری اور آزادروی کا باعث بنتی ہے۔

اسلام کی ثقافتی تاریخ نے انسانی علم کے اضافے میں جو گراں قدر حصہ لیا ہے، اس سے یہ دعوےٰ کیا جاسکتا ہے کہ

---

[۱] لیکن قدامت پرست طبقہ کی طرف سے آج تو اس کی اجازت نہیں دی جاتی! (طلوعِ اسلام)

[۲] اس کا بدترین مظاہرہ خود عربی نمائندگان نے عین کولمبو میں کیا تھا۔ (طلوعِ اسلام)

اسلام نے مذہبی معاملات میں آزادی کی علمبرداری بھی کی، اس کو برقرار بھی رکھا اور اس کی حوصلہ افزائی بھی کی۔ قدامت پرستی اور جدت پسندی، فلسفے اور تصوف، مقامی اور غیر مقامی کلچر۔ سب کو اسلام کے آغوش میں جگہ ملی۔ انسانی علم کا کوئی ایسا میدان نہیں ہے جس میں اسلام نے استدلال یا ذہنی سرگرمیوں پر کوئی پابندی عائد کی ہو۔ اسلام میں مذہب اور سائنس کا اختلاف کوئی اہم مسئلہ نہیں ہے۔

عقائد کی آزادی کے بارے میں اسلام کا یہ لبرل نقطۂ نظر اور فکر اسلامی کے الہیاتی آئین کے بنیادی امور میں سے ہے جن کے ذریعے سے ساتویں صدی ہجری ہی میں انسانی حقوق کو تسلیم کر لیا گیا اور انھیں اسلامی دستورِ حیات اور اسلام کے پیغام کا ایک جزو سمجھا جانے لگا۔

انسانی ترقی کے موجودہ دور میں یہ وہ حقیقت ہے جو انتہائی اہمیت رکھتی ہے۔ اگر مسلمان اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیں تو ان میں خود اعتمادی عود کر آئے گی اور وہ امنِ عالم کو برقرار رکھنے اور انسانی خوش حالی کے اضافہ میں مؤثر حصہ لے سکیں گے۔ اور اگر مغرب کے لوگ اس حقیقت کو دیانت داری سے مان لیں[۱] تو انھیں پتہ چلے گا کہ مشرق کے روحانی ورثے میں اسلام نے کتنا گراں قدر اضافہ کیا ہے اور وہ انسانی جدوجہد کے ہر شعبے میں مشرقیوں کے ساتھ تعاون سے کام لیں گے۔

---

[۱] وہ کس طرح مان لیں جب کہ وہ ابھی کل کو کیمپ بیپ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے کہ خود مصری نمائندگان اپنے سے مختلف خیالات رکھنے والوں کا گلا گھونٹنے کے لئے کس طرح آستینیں چڑھاتے اور شور مچاتے تھے۔ (طلوعِ اسلام)


# برقِ طور

از۔ پرویز

استبداد و ملوکیت کے مجسمہ فرعون، پیشوائیت کی دسیسہ کاریوں کے پیکر ہامان اور سرمایہ داری کی خون آشامیوں کی تمثیل قارون کے متحدہ محاذ کے خلاف صاحبِ ضربِ کلیم کی نبرد آزمائی کی داستان

قیمت - چھ روپے

مذاکرۂ عالمِ اسلامی (لاہور)

# اسلام میں قانون سازی کے امکانات

اور

# اجتہاد کا مقام[1]

پروفیسر جے۔ شاخت۔ لیڈن یونیورسٹی (ہالینڈ)

جس موضوع پر میں آج تقریر کر رہا ہوں وہ نہ صرف علمی اور تاریخی دلچسپی کا حامل ہے بلکہ ایک ایسا مسئلہ ہے جسے تمام ممالک اسلامیہ اور خصوصاً پاکستان میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہو گئی ہے اور مجھے یہ بتا دینے کی چنداں ضرورت نہیں کہ میں اس کی تائید یا مخالفت میں کچھ نہ کہوں گا۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جسے ہر ملک کے مسلمانوں کو اپنے طور پر حل کرنا چاہیئے۔ ایک مورخ کی نظر میں تمام مکاتب فکر کے خیال یکساں جائز و قابل قدر ہیں۔ کیونکہ انہوں نے اپنے اپنے طور پر اسلامی فکر قانونی کے امکانات کا جائزہ لیا ہے اور لے رہے ہیں۔ پس یہ سوال ہو سکتا ہے کہ اسلامی قانون اور اس کی سابقہ سرگزشت اور تدوین و تکمیل کے ایک غیر مسلم طالب علم سے اس مذاکرہ میں حصہ لینے کی کیا توقعات ہو سکتی ہیں۔ اس سے یہ توقع تو یقیناً نہیں کی جا سکتی کہ وہ اجتہاد و تقلید سے متعلق روایتی نظریہ کی پوری سرگزشت بیان کرنے بیٹھے جس سے کم و بیش سب واقف ہیں۔ یا وہ ان اعتراضات کی تفصیل میں جائے جو ایام سابق میں اس نظریہ کے خلاف اٹھائے گئے ہیں۔ یا ان دور رس تبدیلیوں کا ذکر کرے جو فکر جدید کا نتیجہ ہیں۔ مجھ سے یہ بھی توقع نہیں کی جا سکتی کہ میں شرح و بسط سے یہ بیان کروں کہ اسلامی تاریخ میں شریعت اور قانون میں کیا تعلق رہا ہے۔ یہ کچھ کرنے کے بجائے میرے لئے یہ مناسب ہو گا کہ میں وہ حل طلب مسئلہ جو نہ صرف پاکستان بلکہ دوسرے تمام ممالک اسلامی میں اس وقت پیش نظر ہے اُسے اس کے صحیح

---

[1] ڈاکٹر شاخت کا یہ وہ مقالہ ہے جسے انہوں نے کولوکیم میں نہیں پڑھا تھا۔ (تفصیل طلوع اسلام بابت فروری ۱۹۵۸ء میں گذر چکی ہے) اس مقالہ کا اردو ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔ (طلوع اسلام)

تاریخی پس منظر میں آپ کے سامنے رکھوں۔ مغربی طالب العلم اسلامی قانون کی ابتدائی تاریخ کے متعلق گذشتہ دس پندرہ سال میں جن جدید نتائج پر پہنچے ہیں وہ آجکل کے حالات کے بالکل متوازی ہیں۔

قانون سازی میں اجتہاد کا مسئلہ جو ان دنوں مسلمانوں کے سامنے ہے وہ قانون عامہ کی تاریخ میں کوئی انوکھی چیز نہیں یہ ایک وسیع مسئلہ ہی کی ایک شکل ہے کہ ناقابل تغیر عناصر کو کس طرح زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ منطبق کیا جائے بہت سے قانون سازوں نے یہ کوششیں کی کہ قانون کو ہمیشہ کے لئے معین و محکم بنا دیا جائے گویا کہ تحکم اور اٹل ہونا ہی قانون کی خصوصیت ہے۔ لیکن اس سے بالآخر معاشرتی مقتضیات و شعور اور قانون مدونہ کے مابین تصادم اور کشمکش واقع ہو جانے کا قوی احتمال پیدا ہو جاتا ہے۔ رومن لا، بازنطینی قانون اور کلیسائے مسیحی کے قوانین نے قانون کے محکم اور تغیر پذیر عناصر کو الگ الگ اپنے اپنے مقام پر رکھا اور اس طرح قانون میں ثبات و استحکام اور مقتضیات زمانہ کو پورا کرنے کی صلاحیت پیدا کر کے ہر تضاد اور کشمکش کو رفع کر دیا۔ لیکن اس کے برعکس اسلامی قانون کا قدامت پسند نظریہ اپنے عقائد میں تبدیلی کے امکانات ہی کا منکر ہے اور اقتدار سیاسی کے حق قانون سازی کا جواز ہی تسلیم نہیں کرتا۔ یہ نظریہ دوسری صدی ہجری یعنی امام شافعیؒ کے زمانے سے شروع ہوا ہے اور گو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ ماسبق میں شریعت کی تدوین و ترتیب کا وہ ایک قدرتی نتیجہ تھا۔ لیکن حالیہ تحقیقات سے ثابت ہو گیا ہے کہ اپنے زمانہ تدوین میں اسلامی قانون عملی طور پر تو کجا لفظی طور پر بھی کبھی ناقابل تغیر اور اٹل نہیں رہا ہے۔ اس نے صرف دوسری صدی ہجری میں ناتغیر پذیری کی طرف ایک فیصلہ کن اقدام کیا ہے۔ زمانہ قبل از امام ابوحنیفہؒ کے کوفیوں، بصریوں اور مکیوں کی اور امام مالکؒ سے پیشتر کے مدنیوں کی اور امام اوزاعیؒ سے قبل کے شامی مذاہب فقہ کی فکر، قانونی قدامت پرست نظریہ "اصول اربعہ" کے زیر اثر تھی۔ ان کی فکر میں ہر دور کے مستند علماء کا "تصور" زندہ روایات" کا عام عقیدہ کار فرما نظر آتا ہے یہ علماء کسی ایسے عقیدہ کی توضیح و تشریح کرتے رہنا ہی اپنا فرض نہ سمجھتے تھے جو ہمیشہ کے لئے محکم اور اٹل ہو بلکہ حکومت وقت کے احکام اور اپنے زمانہ کی امت کے عمل کو اسلامی معیاروں پر پرکھتے رہنا اور ناواقف مسلمانوں کو صحیح طریقہ اسلامی کے مطابق گذر بسر کرنے کے لئے وعظ و نصیحت کرنا اپنا منصب تصور کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ خلفائے وقت اور ان کے گورنروں کے صادر کئے ہوئے احکام اور عوام الناس کے عمل کو بشرطیکہ یہ دونوں مستند اسلامی معیاروں پر پورے اترتے ہوں سنت کا جزو اور صحیح اسلامی طریق زندگی سمجھنا چاہیئے۔ اس کے ساتھ ہی ان کو اس کا یقین تھا کہ ان کا یہ عقیدہ اصحاب رسولؐ کی تعلیمات ہی کی پیروی و تقلید ہے جو مقتدایان دین کی حیثیت سے وہ اپنے اپنے شہروں میں اپنے زمانہ میں دیا کرتے تھے اس طرح وہ قانون مشرع کی محکمیت اور اقتضائے زمانہ کے اغراض کی تکمیل میں توافق پیدا کر لیتے تھے۔

امام شافعیؒ اور قدیم مذاہب فقہ کے نمائندوں کے درمیان مباحثات اور شافی الذکر کی تصانیف میں جو اب دستیاب ہوتی ہیں اور متعدد روایات ہیں جس سے اسلامی قانون کی ابتدائی سرگذشت کی تشریح ہوتی ہے اس واقعہ کی کثیر شہادات موجود ہیں۔ آخر میں وہ مجلول یادداشت بھی کچھ کم اہمیت کی حامل نہیں جسے ابن المقفع نے ۱۴۰ھ سے کچھ ہی قبل عباسی خلیفہ منصور کی خدمت

میں پیش کیا تھا۔ اس میں مشورہ دیا گیا تھا کہ خلیفہ کو ان تمام عقائد و احکام پر جو مختلف بلادِ مملکت میں نافذ و مروج تھے نظرِ ثانی کرنی چاہیئے۔ اور ان سب میں یکسانیت پیدا کرنے کے لئے اپنے فیصلوں کو ایک ضابطہ کی شکل دے کر سارے قضاۃ کے نام احکام صادر کر دینا چاہیئے کہ ان پر پابندی سے کاربند ہوں۔ اس نے اس پر بھی زور دیا تھا کہ ہر خلیفہ وقت کو وقتاً فوقتاً اس ضابطہ کی نظرِ ثانی کرتے رہنا چاہیئے۔ خود خلیفہ بھی قرآن و سنت کی پابندی کرے۔ سنت سے مراد ابن المقفع کی یہ تھی کہ اس میں پچھلی حکومتوں کے صادر کردہ احکام بھی بڑی حد تک داخل سمجھے جائیں۔ استدلال اس کا یہ تھا کہ چونکہ یہ فیصلے حکمرانِ وقت کے صادر کئے ہوتے ہیں۔ اور قدیم مکتب فقہ کے کسی رکن کے قیاسات نہیں ہوتے اس لئے بعض پہلوؤں سے ثانی الذکر کی آراء سے مستحکم بھی ہو سکتے ہیں بہرحال ان واقعات میں عہدِ عباسیہ کے آغاز میں جو آثار کارفرما ہیں اُن کی اور اس زمانہ کے میلانات کی نمایاں جھلک ضرور ان میں نظر آتی ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب اسلامی قانون اپنے ناقابلِ تغیر ہونے کی طرف ایک فیصلہ کن موڑ مڑتا ہے۔ ہمیں اس کے بہت سے وجوہ و اسباب دکھائی دیتے ہیں۔ سنت، یعنی ظاہری طور و طریقِ زندگی، اسلام کا ہی نہیں بلکہ خود مذہب پر حکومت کی کڑی نگرانی کی وجہ سے علماء جس عظیم خطرہ کا اندیشہ محسوس کرتے تھے وہ پہلا اور یقیناً سب سے زیادہ اہم سبب تھا۔ ثانیاً اس زمانہ میں روز بروز زیادہ اثر و دباؤ روایت پرستوں یعنی اہلِ حدیث کا پڑ رہا تھا جس کے تحت وہی پرانے نظریہ یعنی اصولِ شافعی کی توضیحیں اور تشریحیں ہونے لگیں اور جس کی نہ صرف امام شافعی کے پیروؤں نے بلکہ دوسرے مذاہبِ فقہ نے بھی تقریباً بحث و درج کر دی۔ تیسرے ساتھ ہی ساتھ اُن دنوں اسلامی قانون کا نظام خود اس درجہ مکمل ہو چکا تھا کہ تمام قرآن کے لئے روز مرہ کی زندگی کا کوئی گوشہ اس سے باہر نہیں رہا تھا۔ اور اپنی تغیر پذیری کی بدولت جو اس وقت تک قائم تھی معاشرتی حالات اور مقتضیاتِ زمانہ آغازِ عہدِ عباسیہ کی اس میں صاف جھلک دکھائی دیتی تھی لیکن اب یہ ہونے لگا کہ قانون کی حکمت اور ناتغیر پذیری پر خاص توجہ مرکوز ہو گئی یہاں تک کہ احکامِ فقہ اور معاشرتی ضروریات میں تطابق نہ رہا اور بُعد بڑھتا گیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ اس صورتِ حال کا کسی کو خیال تک نہ آتا تھا۔ حتیٰ کہ سرکاری قوانین بھی اسے پھر سے سازگارِ زمانہ بنانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سی وجوہ بیان کی جا سکتی ہیں۔ میں صرف اس قدر عرض کروں گا کہ فقہ کی حکمت اور استحکام پر یا بالفاظِ دیگر مابعد الطبیعیاتی تعین و تیقن پر یہ خاص توجہ جو پچھلے عربوں کی ذہنیت یا ابتدائی اسلام کی اسپرٹ سے ہم آہنگ نہ تھی گویا ایک ردِ عمل یا ٹوئن بی (TOYNBEE) کے الفاظ میں "جواب" تھی جو اسلام اور فقہ اسلامی پر مسلط کر دی گئی۔ اور یہ سب کچھ اسی شخصیت پرستی کی ذہنیت کا نتیجہ تھا جس سے قدیم عربوں کو دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔

فقہ اسلامی کے اس فیصلہ کن موڑ (انقلاب) کی جو کچھ اہمیت ہے اس میں مبالغہ نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک ماضی سے بالکلیہ روگردانی تھی۔ اور واقعہ ہے کہ اپنے نظریہ اور موضوعہ اصول کے تحت امام شافعی نے جو چند فتوے دیئے ہیں وہ عمرانی نقطۂ نظر سے قدیم عراقیوں اور مدنیوں کے تخیل سے بہت پست ہیں۔ اس نئی رہنمائی کے اثر سے تقلید و اجتہاد کی اصطلاحات

کا مفہوم ہی بدل گیا۔ قدیم مذاہب فقہ میں "تقلید" خود اپنے معنوں کے اعتبار سے ناتغیر پذیر نہ تھی بلکہ مفہوم اس کا صرف یہ تھا کہ اپنے اپنے مکتب فقہ کی زندہ روایات کو کسی مقامی صحابی رسول کے عمل سے منسوب کر کے پیش کر دیا جائے۔ اس طرح یہ کہہ سکتے ہیں کہ اہل مکہ حضرت ابن عباس کی تقلید کرتے تھے اور کوفہ والے حضرت ابن مسعود کے مقلد تھے۔ امام شافعی نے تقلید کے اس تصور کے مقابل اپنے اجتہاد کا تصور پیش کر دیا جس سے اُن کی غرض یہ تھی کہ ذاتی تحقیق و استدلال کی بنا پر قدیم مذاہب فقہ کی زندہ روایات سے ہٹ کر فیصلہ اور عمل کرنے کی آزادی ہو۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ہر شخص کو اجتہاد کا حق اور اس کی اجازت ہونی چاہیے مگر عملاً یہ ممکن نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تقلید اپنے محدود مفہوم میں گھٹ کر رہ گئی جس سے ہم سب بخوبی واقف ہیں۔ ہر عمل کا ایک رد عمل ہوا کرتا ہے۔ اجتہاد نے بھی اپنا چولا بدل لیا اور یہ وہی اجتہاد ہے جس کا آج کل کے مصلحین مطالبہ کر رہے ہیں۔

روایتی ملائے خواہ وہ کچھ ہی کیوں نہ ہوں، تاریخی نقطۂ نظر سے یہ ان علمائے قدیم کے استدلال سے میل نہیں کھاتا جنھوں نے اول اول اسلامی فقہ کی تدوین کی ہے اور جن کے نقش قدم پر چلنا آج کل کے مصلحین بھی باعث فخر سمجھتے ہیں۔

حق اجتہاد کا یہ مطالبہ کچھ پاکستان ہی پر منحصر نہیں، مشرق وسطیٰ کے بہت سے علما بھی جو نظری طور پر اسلامی فقہ پر ایک جدید رنگ چڑھانا چاہتے ہیں، یہ مطالبہ کرتے رہتے ہیں۔ جہاں تک شرع میں تجدد پسند قانون سازی کے عملی مظاہرہ کا تعلق ہے یہ علماء کوئی تدبیری بنیاد ڈھونڈھ نکالتے ہیں تاکہ ان کی دور رس جدت پسندی اور اصلاحات کے لیے جواز حاصل ہو سکے۔ لیکن ان واقعات کا تاریخی طریق سے مطالعہ کرنے والا یہ پوچھ سکتا ہے کہ آپ جب اسلامی فقہ کے بنیادی اداروں میں اتنی تبدیلی و اصلاح کر رہے ہیں تو روایتی فقہ کے مظاہر و عناصر جو حقیقی اسلام کا جزو بھی نہیں، بلکہ لواحق میں شمار کیے جا سکتے ہیں، آخر کون سی ایسی تقدیس رکھتے ہیں جسے آپ چھونا نہیں چاہتے۔ جدید قانون سازی کی واحد مثال مجھے شمالی افریقہ کے ایک عرب مملکت یعنی تیونس میں ملتی ہے جہاں اگست ۱۹۵۶ء میں ایک ضابطۂ قانون شخصی کا پاس کیا گیا ہے۔ بہ حیثیت ایک مورخ کے میں تو اس ضابطہ کو ایک دوسرے اسلامی ملک کی (یعنی ترکی کی) بالکل سیدھے طریق پر تنسیخ قانون شرع اسلامی ہی کی سطح پر دیکھتا ہوں۔

پہلی صدی ہجری کے اختتام اور دوسری صدی کے آغاز کے ماہرین فقہ اسلامی کا یہ کام تھا کہ وہ اسلام کے دینی اور اخلاقی معیاروں پر قانون اور اپنے ماحول و مقتضیات روزمرہ کی جانچ کرتے اور دیکھتے کہ ان میں کس قدر توافق ہے۔ مجھے دکھائی دیتا ہے کہ اسلامی ممالک کے نئے قوانین بنانے والوں کے سامنے بھی یہی کام ہے کہ اس طرح اپنے زمانہ کے حالات و مقتضیات پر بھی بہ تعلق نقد غور کریں۔ ایک سوال جسے وہی حل کر سکتے ہیں، اور جسے انھیں حل کرنا ہوگا یہ ہے کہ وہ ٹھیک ٹھیک طور پر اس کا تعین کر دیں کہ ان کی رائے میں روایتی اسلامی عقیدہ کے وہ کون کون سے عناصر ہیں جو اسلامی معیاروں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اس سوال کے بہت سے جوابات دیے جا سکتے ہیں اور دیے بھی گئے ہیں۔ بہرحال مختلف ممالک میں اس بحث و تمحیص اور رد و قدح کا نتیجہ کچھ ہی کیوں نہ نکلے اسلام اور اسلامی قانون کا مطالعہ کرنے والے اہل مغرب اسے بڑی دلچسپی سے دیکھیں گے۔

مذاکرۂ عالم اسلامی لاہور

# اسلام اور تحصیل علم

از استاذ بدیع الزمان فروزانفر - تہران یونیورسٹی (ایران)

قرآن مبین کی ہدایات اور رحمۃ للعالمین کی بعثت پر مبنی اسلامی معاشرے میں ترقی و توسیع ثقافت کے ایسے عظیم الشان امکانات موجود ہیں جو فلسفیوں اور تخیلی جنت کے نقشے پیش کرنے والے مفکروں کے حیطۂ خیال میں بھی نہیں آسکتے تھے۔ چنانچہ یہ امر حیرت انگیز نہیں کہ مسلم معاشرے کے دور زریں میں اسلامی تہذیب و تمدن کو وہ ارفع مقام حاصل ہو گیا تھا جو آج اسلامی ثقافت کی تاریخ سے ناواقف اصحاب کے فہم سے بالا اور اس سے آشنا حضرات کے لئے باعث استعجاب ہے۔

اسلام نے ارتقائے ثقافت کے جن امکانات کو پیدا کیا اور جو آگے چل کر اسلامی معاشرے کی نمو کا باعث بنے ان کا مطالعہ اس لحاظ سے بے حد سود مند ہے کہ ان کی مدد سے ہم ان ذرائع و وسائل کو جان سکتے ہیں جنھیں اختیار کر کے مقدس بانیٔ اسلام نے انسانیت کو خوشی اور خوشحالی سے ہمکنار کیا۔

اسلامی ثقافت کی ترقی کے اسباب میں سے ایک معنی خیز سبب وہ نظریہ تھا جو اسلام نے علم اور ارباب دانش کے بارے میں پیش کیا۔ مہذب ترین معاشرے کے قیام کے پیش نظر دین اسلام میں علم کی اہمیت پر بے حد زور دیا گیا ہے۔ علم و فکر کی ضرورت سے متعلق قرآن پاک میں متعدد آیات ملتی ہیں کہ عالم طبعی اور عالم انسانی پر غور کرنا چاہیئے۔

"اولم ینظروا فی ملکوت السمٰوٰت والارض" اور "ان فی خلق السمٰوٰت والارض واختلاف اللیل والنہار لآیات لاولی الالباب" علم کا حصول بہت اہم ہے۔

"قل ھل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون انما یتذکر اولوا الالباب" "یرفع اللہ الذین آمنوا منکم والذین اوتوا العلم درجات" "ومن یؤت الحکمۃ فقد اوتی خیراً کثیراً"

ایک عالم کی شہادت اتنی ہی درست ہے جتنی فرشتوں اور خود اللہ تعالیٰ کی شہادت۔

"شھد اللّٰہ انہ لا الٰہ الا ھو والملٰئکۃ واولوا العلم قائما بالقسط"

جیسا کہ امام غزالی نے فرمایا ہے۔ اس آخری نکتے سے اس امر کی مکمل وضاحت ہو جاتی ہے کہ اسلام نے تحصیل علم کو کتنا بلند درجہ بخشا ہے (احیاء العلوم۔ جلد اول ص۱۱)۔ مزید براں قرآن مجید کی رو سے تحصیل علم ایک فرض ناگزیر ہے

فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے تحصیل علم میں بے انتہا دلچسپی کا اظہار فرمایا۔

"من جاءہ الموت وھو یطلب العلم لیحیی بہ الاسلام فبینہ وبین الانبیاء فی الجنۃ درجۃ واحدۃ"

نیز

"العلماء ورثۃ الانبیاء" و "اقرب الناس من درجۃ النبوۃ اھل العلم والجھاد" و "یشفع یوم القیامۃ ثلاثۃ الانبیاء ثم العلماء ثم الشھداء"

غزوۂ بدر کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان جنگی قیدیوں کی رہائی کا حکم صادر فرمایا جنہوں نے دس دس بچوں کو لکھنے پڑھنے اور حساب سکھانے کی ذمہ داری قبول کی۔ آپ نے اپنے صحابہؓ اور پیروؤں پر زور دیا کہ جہاں تک ممکن ہو تحصیل علم کریں، مثلاً آپ نے زید بن ثابت (رضی اللہ عنہ) کو عبرانی یا شاید سریانی یا دونوں زبانیں سیکھنے کے لئے ارشاد فرمایا (اسد الغابہ، جلد اول، ص ۲۲۲ و صحیح بخاری)

بلاشبہ اسی ہمت افزائی کے باعث مسلمانوں میں تحصیل علم کا رجحان بڑی شدت سے پیدا ہوا۔ عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ عہد نامۂ قدیم و جدید سے واقف ہوئے اور عبداللہ ابن عمرو عاص نے عہد نامہ قدیم اور سریانی زبان کا علم حاصل کیا۔

علم کے بارے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کے باعث آپ کے صحابہ اور دوسرے مسلمان علماء کے ساتھ انتہائی انکساری کے ساتھ پیش آتے تھے۔

روایت ہے کہ ایک بار عبداللہ ابن عباسؓ نے مشہور عالم زید بن ثابتؓ کو گھوڑے پر سوار ہوتے وقت سہارا دیا اور بتایا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ہدایت فرمائی تھی۔

اس سلسلہ میں خلفاء، ملوک، وزراء حتیٰ کہ عوام نے بھی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال کو شمع راہ بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ سن ہجری کی ابتدائی صدیوں میں علماء کو تمام دنیائے اسلام میں بے حد فروغ حاصل ہوا۔ متعدد مستند کتابیں اس حقیقت کی شہادت دیتی ہیں۔

مسلمانوں نے اپنے دین کی اشاعت کے مدنظر متعدد ملک فتح کئے اور یوں وہ مختلف قسم کی ثقافتوں سے دوچار ہوئے۔ اسلامی اور غیر اسلامی عقائد کے رابطے سے ایک ایسی اعلیٰ ثقافت ظہور میں آئی۔ جو دنیائے قدیم کی تمام ثقافتوں کے

بہترین عناصر کی حامل تھی۔

اسلامی ثقافت میں دنیوی اور روحانی عناصر کے مابین ایک توازن موجود ہے اس اعتبار سے یہ دنیا بھر میں پہلی اور واحد ثقافت ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ قرونِ وسطیٰ کی دنیا تبدیل کرنے اور نئے علمی چشم انداز کو وجود میں لانے کے لئے دوسری تمام تہذیبوں سے بازی لے گئی۔

ابتدائی دور کے مسلمانوں نے تحصیل علم کی خاطر دور دراز ملکوں کا سفر اختیار کیا اور دنیائے اسلام کے جس گوشے میں بھی پہنچے، اسلامی اخوت کے باعث گھر کا سا ماحول پایا۔ اسلام کے ابتدائی دور ہی سے احادیث کی تلاش میں مسلمان سیاحت کرنے لگے تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب عبداللہ ابن عباسؓ مدینہ منورہ میں احادیث جمع کر رہے تھے، انھیں نہ گرمی کی پروا تھی نہ بادِ سموم کی۔ احادیث جمع کرنے کے لئے وہ اتنے بیتاب تھے کہ معلومات حاصل کرنے کے لئے وہ لوگوں کو نیند سے بیدار کر لیتے تھے۔ اسی طرح ابوذر غفاریؓ نے ایک بار احادیث کی تلاش میں شام کا طویل اور جانکاہ سفر اختیار کیا۔

علم کی دوسری اصناف کو بھی اسی طرح مقبولیت حاصل تھی۔ علماء اسلامی دنیا کے گوشے گوشے میں پھرتے اور منظومات، ضرب الامثال اور اصطلاحات جمع کرتے تھے۔ آگے چل کر جب یہی مستعدی اور سرگرمی (علوم) کی طرف منتقل ہوئی تو اس کا نتیجہ اسلامی ثقافت اور دنیا کی تہذیبی ترقی کی صورت میں ہمارے سامنے آیا۔

اسلام نے علم اور انفاق مال کو جو اہمیت دی ہے اس کے باعث مخیر حضرات کے عطیات سے مدرسے، اکاڈمیاں خانقاہیں، کتب خانے اور رصد گاہیں قائم ہوئیں۔ مشہور نظامیہ مدارس، الازہر، مستنصریہ مدارس اور اسی قسم کے دوسرے ادارے جہاں مشاہیر نے تربیت پائی، خود لوگوں نے قائم کئے تھے۔ مسلمانوں کے ہر فرقے نے اپنا ایک مخصوص علمی مرکز قائم کر رکھا تھا جو ہر خاص و عام کے لئے کھلا ہوتا تھا اور ہر طبقہ کے لوگ جن میں مستورات بھی شامل تھیں۔ ان درسگاہوں سے فیض یاب ہو سکتے تھے۔

یہاں یہ امر قابل توجہ ہے کہ عورت کو اسلام نے بہت معزز مقام دیا ہے انھیں جہاد میں حصہ لینے اور حسب خواہش تعلیم حاصل کرنے کی عام اجازت تھی۔ اسلامی معاشرے میں ایسی کئی عورتوں کے نام ملتے ہیں جنھوں نے تقویٰ، شجاعت یا علم کے اعتبار سے شہرت حاصل کی ہے۔ مثلاً رابعہ العدویہ اور فاطمہ نیشاپوریہ کا شمار صوفیائے عظام میں ہوتا ہے زینب بنت عبدالرحمٰن کو احادیث اور فقہ اسلامی پر عبور حاصل تھا۔ زینب بنت کی مشہور معلمہ تھیں۔ فاطمہ بنت محمد سمرقندی۔ جو مشہور امام علاء الدین مسعود کاشانی کی بیگم تھیں۔ علمی مباحثوں میں اپنے خاوند کا ہاتھ بٹاتی تھیں۔ اور نورالدین محمود زنگی عامل شام آپ کا بے حد احترام کرتا تھا (جواہر المضیہ جلد دوم، صفحہ ۲۷۸)

ان کے علاوہ کچھ اور مشہور و معروف خواتین کا نام بھی لیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر سیدۃ الوزارۃ حنبلیۃ ست العرب ام محمد اور عائشہ بنت محمد ابن عبدالہادی جنھیں فقہ میں سند کا درجہ حاصل تھا۔ ان میں سے بعض نے کئی ایسے علماء کو

نقش دیا تو آگے چل کر مشاہیر کی صف میں شمار ہونے۔

اس طرح مسلمانوں کو وہ ذرائع و وسائل حاصل ہو گئے تھے جن سے ایک وسیع ثقافت تخلیق کی جا سکے اور انہوں نے انسانیت کی گراں مایہ خدمت سرانجام دیں۔

میری رائے میں ہماری موجودہ کانفرنس کی قسم کے اجتماعات اس لحاظ سے بے حد اہم ہیں کہ ان سے مسلمانوں کو اپنا ماضی یاد کرنے کی تحریک ملتی ہے اور وہ تعلیمات اسلامی کی روشنی میں ثقافت عالم کی ترقی میں کوشاں ہو سکتے ہیں۔

---

یہ درست ہے لیکن سب سے پہلے یہ تعین کرنا چاہیئے کہ علم کہتے کسے ہیں اور اس کے حصول سے مقصد کیا ہے؟ جو علم فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں قرآنی اصول کے مطابق استعمال کرنے میں مدد نہیں دیتا اور جو زندگی کے عملی مسائل کا حل نہیں بتاتا، وہ علم نہیں بلکہ "ذہنی عیاشی" یا فریب نظر ہے۔ (طلوع اسلام)

---


# فردوس گم گشتہ

## از: پرویز

ان مضامین کا مجموعہ جنہوں نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نگاہ کا زاویہ بدل دیا ہے اور فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔

اردو لٹریچر کی بلند پایہ کتاب

بڑے سائز کے ۴۱۶ صفحات ——— قیمت: چھ روپے

ملنے کا پتہ:

ناظم ادارہ طلوع اسلام ——— کراچی

# قرنِ اوّل کے مذہبی فرقے

## اور

## اُن کا پس منظر

(تلخیص ـ علامہ محمد امین مرحوم ـ مصری)

(اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں کہ نبی اکرمؐ کے زمانے میں تمام مسلمان ملّتِ واحدہ تھے اور ان میں کوئی فرقہ نہیں تھا۔ فرقہ ہو بھی کیسے سکتا تھا جب قرآن نے فرقہ بندی کو بنصِ صریح شرک قرار دے دیا تھا اور رسول اللہؐ نے کہہ دیا تھا کہ جو لوگ فرقہ بنا لیں مجھے ان سے کوئی سروکار نہیں ہوگا۔

اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ نبی اکرمؐ کی وفات کے تھوڑے عرصہ بعد مسلمانوں میں فرقے بننے شروع ہو گئے جن کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔

لہٰذا ہر جویائے حقیقت کے دل میں فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان فرقوں کی ابتدا کس طرح سے ہوئی اور شروع میں کون سے فرقے وجود میں آئے؟ اس سوال کے متعلق طلوعِ اسلام میں اس سے پہلے بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہمیں اس کا احساس تھا کہ یہ موضوع ہنوز تشنۂ تکمیل ہے اور اس کے متعلق جامع طور پر مزید لکھنے کی ضرورت ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ سوال تاریخ سے متعلق ہے اور یہ واقعہ ہے کہ (تعداد کی کثرت کے باوجود) ہمارے ہاں تاریخ کا قابلِ اعتماد ذخیرہ بہت کم ہے۔ ہمارے دور میں جن مورخین نے نسبتاً زیادہ تحقیق و کاوش سے کام لے کر قرنِ اول کے کوائف و وقائع کو پیش کیا ہے ان میں علامہ محمد امین مصری کا مقام خاصا بلند ہے۔ چنانچہ ہم نے ان کی تاریخی تحقیقات سے ابتدائی فرقوں کی تاریخ کو مختصر مرتب کیا ہے جو پیشِ ناظرین ہے۔ اس میں پہلا حصہ ان فرقوں کے پس منظر پر مشتمل ہے اور اس کے بعد شیعہ، خوارج اور مرجیہ کے احوال و کوائف ہیں۔

جیسا کہ معلوم ہے طلوعِ اسلام کو کسی فرقے سے کوئی تعلق نہیں۔ اس لئے اس میں جو کچھ لکھا جاتا ہے اس

ہے نہ کسی فرقہ کی تائید مقصود ہوتی ہے: مخالفت۔ زیرِ نظر مقالات کو بھی اسی انداز سے دیکھنا چاہیئے۔ واضح رہے کہ ان مقالات میں جہاں جہاں کسی رائے کا اظہار کیا گیا ہے وہ بھی علامہ ایں کی رائے ہے۔ طلوع اسلام کی نہیں۔ اتنا مزید واضح کر دینا ضروری ہے کہ طلوع اسلام تاریخ کو (قرآن کی طرح) یقینی نہیں سمجھتا۔ اسے ظنی قرار دیتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ ظن کبھی یقین کا مقام حاصل نہیں کر سکتا۔ تاریخی معاملات میں اس حقیقت کو بھی ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔ طلوع اسلام]

خلافت کا مسئلہ وہ پہلا مسئلہ تھا جس کی بنیاد پر مسلمانوں میں اختلافات نے شدت اختیار کر لی تھی۔ مسلمانوں کی آراء اس مسئلہ میں باہم مختلف ہوتی چلی گئیں اور اس اختلاف کی بنیاد پر عصرِ اول میں اسلام کے اہم ترین فرقوں نے جنم لیا۔ یہ اہم ترین فرقے خوارج، شیعہ اور مرجئہ تھے آج کی نوعیت میں ہم اس مسئلہ کے احوال و ظروف سے مختصراً بحث کریں گے تاکہ معلوم ہو سکے کہ یہ فرقے کس طرح پیدا ہوئے اور کس طرح پھیلے۔ اس مسئلہ کی تفاصیل بیان کرنے کا یہاں موقع نہیں۔ انھیں ہم دوسرے وقت میں بیان کریں گے۔

**خلافتِ نبوی** رسول اللہ صلعم کی وفات ہو گئی۔ آپ نے اپنا کوئی جانشین مقرر نہیں کیا تھا اور نہ ہی یہ بتایا تھا کہ اس کا انتخاب کس طریقہ سے کیا جائے۔ آپ کی وفات کے بعد مسلمانوں کے سامنے وہ مشکل ترین بلکہ خطرناک ترین سوال آ گیا۔ سیاسی زندگی میں ان کی کامیابی اور ناکامی کا مدار اسی پر تھا کہ وہ اس مسئلہ کو کس طرح حل کرتے ہیں۔

رسول اللہ صلعم کی وفات کے ساتھ ہی مسلمانوں نے یہ سوچنا شروع کر دیا تھا کہ آپ کا جانشین کون ہوگا۔ آپ کی تدفین سے پہلے ہی انصار نے اس مسئلہ میں عجلت سے کام لیا۔ اور سقیفہ بنی ساعدہ میں اس مسئلہ پر غور کرنے کے لئے ایک اجتماع منعقد کر لیا تاکہ اس امر کا کوئی حتمی فیصلہ کر لیا جائے۔ حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ اور ابو عبیدہ بن الجراح وغیرہ کو جب بعد میں اس اجتماع کی خبر ہوئی تو وہ بھی سقیفہ بنی ساعدہ میں پہنچ گئے کیونکہ انھیں یہ اندیشہ تھا کہ کہیں انصار اس مسئلہ کا فیصلہ محض اپنے نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر ہی نہ کر ڈالیں۔ اس اجتماع میں مسلمان دو برابر کی ٹولیوں میں منقسم ہو گئے تھے۔ ایک رائے یہ تھی کہ جانشین کا تقرر انصار میں سے ہونا چاہیئے۔ ان لوگوں کی دلیل یہ تھی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ میں تیرہ سال تک اپنی قوم میں رہے اور ان کو برابر اسلام کی طرف دعوت دیتے رہے مگر ان میں سے بہت ہی تھوڑے لوگ مسلمان ہو سکے۔ اپنی قلتِ تعداد کی بنا پر یہ لوگ ان ایذا رسانیوں سے بھی رسول اللہ صلعم کی حفاظت نہ کر سکے جو برابر آپ کے مخالفین کی طرف سے آپ کو اور مسلمانوں کو پہنچائی جا رہی تھیں۔ اور نہ ہی دین کی سربلندی و سرفرازی کے لئے وہ کچھ عملی طور پر کر سکے۔ جب رسول اللہ صلعم نے مکہ کو چھوڑ کر مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرمائی تو انصار نے آپ کی مدد کی۔ آپ پر ایمان لائے اور انھوں نے ہی دین کی سربلندی کے لئے کام کیا۔ مخالفین کی ایذا رسانیوں اور جنگ آزمائیوں سے رسول اللہ صلعم اور آپ کے اصحاب کی حفاظت کی۔ انصار آخر دم تک رسول اللہ صلعم کے ساتھ رہے تاآنکہ تمام جزیرۂ عرب مسلمانوں کے زیرِ نگیں آ گیا۔ رسول اللہ صلعم اس دار فانی سے تشریف لے گئے تو آپ انصار سے ہر طرح راضی اور خوش تھے۔ آپ کی آنکھیں ان سے ٹھنڈی تھیں۔ لہٰذا انصار ہی اس کے حقدار ہیں کہ ان میں سے آپ کے جانشین کا انتخاب کیا جائے۔

## مہاجرین کی رائے

دوسرے فریق (یعنی مہاجرین) کی رائے یہ تھی کہ خلیفہ کا انتخاب ان میں سے کیا جائے۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ سب سے پہلے وہی آپ پر ایمان لائے تھے اور اسلام لانے کی وجہ سے ان کو جس قدر تکالیف اور ایذائیں دی گئیں وہ ان کے باوجود اسلام پر ثابت قدم رہے اور اپنی قلت تعداد کے باوجود وہ ایک لمحہ کے لئے بھی کبھی حق کی پیروی سے نہیں ڈگمگائے۔ اس کے علاوہ ان کا تعلق آپ کی قوم اور آپ کے قبیلہ سے ہے۔ وہ قریشی خاندان کے افراد ہیں اور عرب کے مختلف قبائل سوائے قریش کے کسی دوسرے قبیلہ کی نہ تو اطاعت کریں گے اور نہ ہی ان کی عزت و حفاظت کے علاوہ کسی دوسرے قبیلہ کی عزت و حفاظت کا اعتراف کریں گے۔ لہذا دوسرے لوگوں کے مقابلہ میں وہ اس کے زیادہ حقدار ہیں کہ رسول اللہ صلعم کے جانشین کا انتخاب ان میں سے کیا جائے۔ طویل بحث و مباحثہ کے بعد بعض انصار نے کوشش کی کہ ان دونوں مختلف رایوں میں سمجھوتہ (compromise) کرا دیا جائے۔ چنانچہ انھوں نے یہ تجویز پیش کی کہ مسلمانوں کے دو امیر ہوں۔ ایک امیر مہاجرین میں سے ہو اور ایک امیر انصار میں سے لیکن مہاجرین کی طرف سے جب یہ تجویز بھی رد کر دی گئی تو بالآخر اسی مجلس میں حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھوں پر بیعت کی تکمیل کر لی گئی۔

## حضرت علیؓ کا موقف

حضرت علیؓ اس اجتماع میں شریک نہ تھے۔ انھیں جب یہ خبر پہنچی کہ حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی گئی ہے تو انھیں ناگواری ہوئی اور یہاں سے ایک نئی رائے پیدا ہوئی کہ خلافت رسول اللہ صلعم کے گھر میں رہنی چاہیئے۔ مسلمانوں میں رسول اللہ صلعم سے قریب تر آپ کے چچا حضرت عباس بن عبدالمطلب اور چچیرے بھائی حضرت علیؓ ابن ابی طالب ہی ہو سکتے تھے۔ لیکن چونکہ حضرت عباسؓ سابقین فی الاسلام میں سے نہیں تھے بلکہ جنگ بدر میں مشرکین کے ساتھ مل کر رسول اللہ صلعم سے جنگ کرنے کے لئے آئے تھے۔ اور بالکل آخر میں مسلمان ہوئے تھے۔ لہذا رسول اللہ صلعم کے قرابت داروں میں سب سے زیادہ خلافت کے مستحق حضرت علیؓ ابن ابی طالب ہی ہو سکتے تھے۔ حضرت علیؓ ان صحابہ میں سے تھے جو سب سے پہلے آپ پر ایمان لائے تھے حضرت فاطمہؓ یعنی رسول اللہ صلعم کی چہیتی صاحبزادی کے شوہر تھے۔ ان کا شجاعت و بہادری اور علم و فضل میں ایک خاص مقام تھا۔ جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس رائے والوں کی دلیل یہ تھی کہ رسول اللہ صلعم کا قریبی رشتہ دار اس کا زیادہ مستحق ہو سکتا ہے کہ وہی آپ کا جانشین ہو۔ بنو ہاشم کا گھرانا ابوبکرؓ کے گھرانے سے کہیں زیادہ افضل تھا۔ لہذا عرب کے مختلف قبائل بنو ہاشم کی اطاعت زیادہ کر سکتے تھے۔ مہاجرین نے انصار کے مقابلے میں یہ دلیل دی تھی کہ قریش کا خاندان رسول اللہ صلعم کی قوم اور آپ کا خاندان تھا آپ ہی کی آل و اولاد اور آپ کے قرابت دار اس خصوص میں اوروں سے زیادہ قریب ہیں۔ نہج البلاغت میں ہے کہ حضرت علیؓ نے دریافت فرمایا کہ سقیفۂ بنی ساعدہ میں کیا ہوا؟ اس کے بعد پوچھا کہ آخر قریش نے کیا کہا؟ لوگوں نے بتایا کہ قریش نے دلیل پیش کی کہ وہ نبی کے شجرہ (قوم اور خاندان) سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس پر حضرت علیؓ نے فرمایا کہ ان لوگوں نے شجرہ (قوم اور خاندان) سے تو دلیل پکڑ لی مگر پھل کو ضائع کر بیٹھے (یعنی نبی صلعم کے خود گھر والوں کو بھول گئے اور ان کا حق انھیں یاد نہ آیا) حضرت علیؓ کا مطلب یہ تھا کہ قریش نے جب یہ دلیل پیش کی ہے کہ ان کا تعلق رسول اللہ صلعم کے شجرۂ نسب سے ہے تو جو لوگ رسول اللہ صلعم کے قرابت دار ہیں اور خود ان کے گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں انھیں اس دلیل کا فائدہ زیادہ پہنچنا چاہیئے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ حضرت علیؓ کی طرف اس قول کی نسبت کرنا صحیح ہے یا غلط۔ البتہ یہ واقعہ ہے کہ جو کچھ حضرت علیؓ کے دل میں

تھا اس کی یہ صحیح ترین تعبیر تو ہے۔ اس رائے کی طرف حضرت علیؓ نے لوگوں کو دعوت دی۔ بعض بنو ہاشم نے ان کی تائید کی۔ زبیر ابن العوام نے بھی ان کی تائید کی۔ حضرت علیؓ کی اس رائے کی طرف بعض انصار کو بھی رجحان ہو نالازمی تھا۔ کیونکہ حکومت و خلافت دونوں ہی سے ہاتھوں سے نکل گئی تھی۔ یعنی انصار اور حضرت علیؓ دونوں کا موقف بالکل یکساں تھا۔ چنانچہ حضرت علیؓ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے عرصہ دراز تک بیعت نہیں کی۔

یہ تینوں نظریے باہم متعارض و متخالف تھے اور مختلف زمانوں میں ان کے موید اور مخالف پائے جاتے رہے ہیں۔ حتیٰ کہ پہلے نظریہ (انصار کے نظریہ) کے موید و مخالف بھی برابر موجود رہے ہیں بلکہ کچھ لوگ تو اس نظریہ سے باقاعدہ وابستہ رہے ہیں۔ اگرچہ تاریخ میں ان کا کوئی واضح تذکرہ نہیں ملتا۔[1] لیکن آخر کے دونوں نظریوں میں جو جنگ و جدال برپا تھی وہ یقیناً محکم تر اور شدید تر تھی۔

## شیخین رضی اللہ عنہم کا زمانہ

حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے عہد میں بھی وہ نظریہ جو حضرت علیؓ کی اولیت کا قائل تھا ابھی موت مر نہیں گیا تھا۔ البتہ اس میں سکون و جمود ضرور آگیا تھا۔ جس کی وجہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کا انصاف تھا وہ خود اپنے آپ سے بھی ایسا ہی انصاف کرتے تھے جیسا دوسروں سے کرتے تھے۔ ان دونوں حضرات نے قبائلی عصبیت کو سر اٹھانے کا موقع ہی نہیں دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نظریہ کے سکون و جمود کی بڑی وجہ یہ بھی ہوئی کہ لوگ مختلف جنگوں اور فتوحات میں مصروف تھے اور پیہم کامیابی ان کے قدم چوم رہی تھی۔ اس لئے اعتراض کرنے والوں کو ایسا کوئی گوشہ نہیں ملتا تھا جس کے راستے سے وہ لوگوں کو کسی فتنہ میں مبتلا کر سکیں۔

## حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا عہد

حضرت عثمانؓ کے خلیفہ ہو جانے پر حضرت علیؓ اور ان کے اعوان و انصار کمربستہ ہو گئے۔ ان کی بکثرتیؓ میں اس بات نے اور بھی اضافہ کر دیا کہ حضرت عثمانؓ کا تعلق خاندانِ بنو امیہ سے تھا اور انھوں نے ملکی انتظام و انصرام میں زیادہ تر بنو امیہ کے لوگوں ہی سے مدد لی تھی۔ چنانچہ ان کے زیادہ تر عمال اور گورنر اموی ہوتے تھے۔ ان کا میر منشی اور پرائیویٹ سکریٹری مروان بن الحکم اموی تھا مروان اور اس کی ٹولی نے اس بنیاد ہی کو منہدم کر دیا تھا جو اسلام نے قائم کی تھی۔ اور ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما نے جس کو مستحکم کیا تھا۔ یعنی قبائلی عصبیت کے خلاف جنگ اور اس شعور کی اشاعت کہ تمام عرب بلکہ تمام مسلمان ایک ہی وحدت ہیں۔ ان لوگوں نے امویوں کی طرح حکومت کی۔ عربوں کی طرح حکومت نہیں کی۔ اس بات نے اس پرانی عداوت کو پھر سے ابھار دیا جو بنو ہاشم اور بنو امیہ میں شروع سے چلی آتی تھی اور جو اسلام کی برکت سے اب تک چھپی ہوئی تھی۔ حضرت عثمانؓ کے آخری عہد میں مخفی جماعتیں ہر طرف پھیل چکی تھیں۔ جو حضرت عثمانؓ کو معزول کر کے کسی دوسرے آدمی کو خلیفہ بنانے کی دعوت دے رہی تھیں۔ ان جماعتوں میں وہ جماعتیں بھی تھیں جو لوگوں کو خصوصیت کے ساتھ حضرت علیؓ کو خلیفہ بنانے کی دعوت دے رہی تھیں۔ اس جماعت کے شہرہ ترین داعی (ر)

---

[1] نہج البلاغت جلد دوم میں ابن ابی الحدید کی شرح ملاحظہ کیجئے جس میں ایک شاعر کا پورا قصیدہ موجود ہے جس میں وہ انصار کی تائید اور قریش کے خلاف ان کے موقف کی حمایت کر رہا ہے۔

انہی میں سے ایک عبداللہ بن سبا بھی تھا۔ یہ یمن کا ایک یہودی تھا جو مسلمان ہو گیا تھا۔ وہ بصرہ، کوفہ، شام اور مصر میں دورہ کر کے یہ دعوت پھیلاتا رہا کہ ہر نبی کا ایک وصی ہوتا ہے اور حضرت علیؓ محمد صلعم کے وصی ہیں۔ ان سے بڑھ کر ظالم اور کون ہو گا جنہوں نے رسول اللہ صلعم کی وصیت کو نافذ نہیں کیا اور آپ کے وصی کا حق مار بیٹھے۔ یہ شخص ان لوگوں میں سب سے زیادہ خطرناک تھا جنہوں نے عوام کو حضرت عثمانؓ کے خلاف بھڑکایا تھا، حتیٰ کہ وہ بالآخر شہید کر دیئے گئے۔

## حضرت علیؓ کا دور

جب حضرت عثمانؓ شہید کر دیئے گئے تو مسلمانوں کی اکثریت نے حضرت علیؓ سے بیعت کر لی اور ان لوگوں کا نظریہ ایک حقیقت ثابتہ بن گیا جو رسول اللہ صلعم کی وفات کے دن سے حضرت علیؓ کے استحقاقِ خلافت کے دعویدار چلے آ رہے تھے۔ اکثر بڑے بڑے مہاجرین نے بھی ان کی تائید کی کیونکہ ان کا نظریہ بھی اس نظریہ پر منطبق ہو جاتا تھا۔ حضرت طلحہ، حضرت زبیر اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہم نے حضرت علیؓ کے خلاف خروج کیا اور ان کی خلافت کو تسلیم نہیں کیا۔ ان تینوں حضرات نے حضرت علیؓ کو متہم کیا کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت میں ان کا ہاتھ تھا۔ اگر ہاتھ نہیں بھی تھا تو کم از کم اس سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انہوں نے حضرت عثمانؓ کی مدد کرنے سے دست کشی اختیار کر لی تھی جبکہ انہیں یہ مقدرت حاصل تھی کہ وہ ان لوگوں کو حضرت عثمانؓ کی شہادت سے باز رکھ سکتے تھے۔ ان میں سے کچھ لوگوں کی دلیل یہ بھی تھی کہ جب اُن سے بیعت کر لی گئی ہے تو ان پر واجب ہے کہ وہ قاتلین حضرت عثمانؓ سے قصاص لیں۔ حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما کہتے تھے کہ انہیں حضرت عثمانؓ کے خون کا مطالبہ کرنے کا زیادہ حق ہے، کیونکہ وہ دونوں ان چھ افراد میں سے ہیں جنہیں حضرت عمرؓ نے خلافت کی مجلس شوریٰ کے لئے منتخب فرمایا تھا۔ علاوہ ازیں یہ دونوں حضرات اسلام کے سابقین اولین میں سے بھی تھے۔ امیر معاویہ فرماتے تھے کہ وہ قرابت داری میں حضرت عثمانؓ سے قریب تر ہونے کے علاوہ خاندان بھر میں سب سے زیادہ مقدرت رکھتے ہیں کہ وہ ان کے خون کا مطالبہ کر سکیں۔

## غیر جانبدار صحابہ

کبار صحابہؓ کی ایک جماعت ایسی بھی ملتی ہے، جنہوں نے نہ حضرت علیؓ سے بیعت کی اور نہ کسی دوسرے سے اور ان اختلافات میں انہوں نے قطعاً کوئی حصہ نہیں لیا۔ اس کے برعکس انہوں نے گوشہ نشین ہو جانے کو ترجیح دی۔ ان حضرات میں مشہور ترین حضرت عبداللہ ابن عمر بن الخطابؓ، محمد بن مسلمہؓ، سعد بن ابی وقاصؓ، اسامہ ابن زیدؓ، حسان بن ثابتؓ، عبداللہ ابن سلام جیسے حضرات تھے۔ حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ فرمایا کرتے تھے کہ رسول اللہ صلعم نے مجھے حکم دیا کہ جب لوگوں میں اختلافات پیدا ہو جائیں تو میں اپنی تلوار لے کر احد پہاڑ کی طرف چلا جاؤں اور چٹانوں سے ٹکرا کر اس کی دھار کند کر دوں پھر اپنے گھر میں آ کر بیٹھ جاؤں۔ اور اس وقت تک اپنے گھر سے باہر نہ نکلوں جب تک کسی خطاکار کا ہاتھ مجھے آ کر قتل کر دے یا نصیب کن موت میرا کام تمام نہ کر دے۔

حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ کو جنگِ جمل میں شکست ہو گئی اور دونوں حضرات شہید کر دیئے گئے۔ لیکن امیر معاویہؓ کا معاملہ اتنا آسان نہیں تھا۔ ان پر قابو پانا بہت ہی مشکل تھا، کیونکہ ان کے پاس شام کی ایک منظم اور فرماں بردار فوج موجود تھی۔ حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کے درمیان صفین کا معرکہ پیش آیا۔ جب امیر معاویہؓ نے محسوس کیا کہ حضرت علیؓ کا پلہ بھاری ہے اور ہو سکتا ہے کہ جنگ کا

پالنسہ ان کے خلاف پڑ جائے تو انھوں نے اپنی فوج کو حکم دیا کہ وہ اپنے اپنے نیزوں پر قرآن مجید کو بلند کریں اور اعلان کردیں کہ ہم کتاب اللہ کو حکم بناتے ہیں، آؤ دونوں اسی فیصلہ کو قبول کریں۔

حضرت علیؓ نے امیر معاویہؓ کی اس جنگی چال کو بھانپ لیا تھا۔ اور جنگ کو روکنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ لیکن خود ان کی جماعت میں دو فریق پیدا ہو گئے تھے۔ ایک گروہ تحکیم کے حق میں تھا اور دوسرا گروہ اس کے خلاف تھا۔ حضرت علیؓ بالآخر ان لوگوں کا مطالبہ ماننے پر مجبور ہو گئے جو تحکیم کے حق میں تھے۔ جس پر دوسرا گروہ ان سے الگ ہو گیا اور خوارج کے نام سے پکارا گیا۔ جو لوگ حضرت علیؓ کے ساتھ رہے وہ شیعہ علی کہلائے اور جو لوگ غیر جانبدار رہے۔ نہ انھوں نے حضرت علیؓ کو برا کہا اور نہ ان کے مخالفین کو وہ مرجیہ کہلائے۔

یہ ہے مختصر سا تاریخی پس منظر مسلمانوں کے ان مذہبی فرقوں کا جو عصر اول میں پیدا ہوئے۔ یہ پس منظر ہمیں مجبوراً اس لئے بیان کرنا پڑا کہ اسی کی بنیاد پر وہ تینوں فرقے پیدا ہوئے ہیں جو اسلامی فرقوں میں سب سے بڑے فرقے شمار ہوتے ہیں۔ یعنی خوارج۔ شیعہ۔ اور مرجیہ۔ ان کی بنیاد محض ایک مسئلہ خلافت تھا جو پورے چودہ سو سال گذر جانے کے بعد بھی آج تک حل نہیں ہو سکا۔

آئندہ صفحات میں ان تینوں فرقوں کا مختصر حال بیان کیا جائے گا۔

---

# شیعہ

شیعیت کا پہلا بیج تو اس جماعت نے بو دیا تھا جن کا رسول اللہ صلعم کی وفات کے بعد یہ خیال تھا کہ اہل بیت رسولؐ آپ کی جانشینی کے زیادہ حقدار ہیں اور اہل بیت میں سے مقدم ترین ہستیاں حضرت عباسؓ (رسول اللہ کے چچا) اور حضرت علیؓ (رسول اللہ کے چچیرے بھائی) کی ہیں اور ان دونوں میں سے بھی حضرت علیؓ زیادہ حقدار ہیں۔ حضرت عباسؓ نے خود بھی حضرت علیؓ سے خلافت کے استحقاق میں کوئی مقابلہ نہیں کیا۔ اگرچہ فدک کے معاملے میں میراث کے اندر انھوں نے اپنی اولیت کا دعویٰ ضرور کیا تھا۔[1]

## دعویٰ خلافت

حضرت علیؓ کے لئے دعوت کی تحریک جیسا کہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سادہ طریقہ سے شروع ہوئی۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ خلیفہ کے لئے کوئی تصریح موجود نہیں تھی لہٰذا اس بارے میں لوگوں نے اپنی اپنی رائے سے کام لیا۔ انصار کی رائے نے انھیں اس طرف پہنچایا کہ خلافت ان میں ہونی چاہیئے اور مہاجرین کی رائے نے ان کو اس طرف پہنچایا کہ خلافت مہاجرین میں ہونی چاہیئے۔ اور حضرت علیؓ کے اصحاب اس طرف گئے کہ خلافت ایک معنوی میراث ہے اگر رسول اللہ کے ان میں وراثت جاری ہوتی تو

---

[1] البتہ فرقہ راوندیہ نے اس کی تصریح کی ہے کہ خلافت حضرت عباسؓ اور ان کی اولاد کا حق تھا لیکن اس خیال کا اظہار حضرت عباسؓ کی زندگی میں نہیں ہوا تھا بلکہ منصور اور مہدی کے زمانے میں یہ خیال پیدا ہوا۔

ظاہر ہے کہ وہ مال آپ کے قرابت داروں کو ہی ملتا۔ لہٰذا یہ معنوی میراث بھی انہی کو ملنی چاہیئے۔ کسی صحیح سند سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ حضرت علیؓ نے اپنے حق خلافت کے لئے کوئی نص ——— قرآن کی آیت یا حدیث ——— پیش کی ہو جس سے معلوم ہو سکے کہ رسول اللہ صلعم نے ان کو خلافت کے لئے مقرر فرما دیا تھا۔ اگر ان کے پاس اس قسم کی کوئی نص صریح موجود ہوتی تو آپ جیسی دلاور شخصیت یقیناً کبھی اپنی رائے پر اصرار کئے بغیر دوسروں سے بیعت کر لیتے۔ ہمارے سامنے جو کچھ تاریخی ذخیرہ موجود ہے اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ نے خود صدیق اکبرؓ سے بیعت کرلی تھی جو کچھ حضرت علیؓ سے ثابت ہو سکتا ہے وہ اتنا ہی ہے کہ وہ اپنے آپ کو ان تینوں حضرات سے زیادہ خلافت کا حقدار سمجھتے تھے ان کی دلیل محض یہی تھی کہ وہ اور رسول اللہ کے اہل بیت ہیں، اصل ہیں اور قریش درخت ہیں۔ اور پھل پیڑ سے درخت میں بہترین حصہ ہوتا ہے بخاری نے ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ ایک دن مرض الوفات میں حضرت علیؓ رسول اللہ صلعم کے پاس سے باہر تشریف لائے، لوگوں نے دریافت کیا کہ اے ابو الحسنؓ رسول اللہ صلعم نے کس حال میں رات بسر کی ہے؟ تو آپ نے جواب دیا کہ الحمد للہ اچھی حالت میں بسر فرمائی ہے حضرت عباسؓ نے ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں ایک طرف کو لے گئے اور کہنے لگے۔ خدا کی قسم تین دن کے بعد تم لاٹھی کے غلام ہو گے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ اس تکلیف میں رسول اللہ صلعم کی جلدی ہی وفات ہو جائے گی۔ میں خوب پہچانتا ہوں کہ عبد المطلب کی اولاد کے چہرے مرتے وقت کیسے ہوا کرتے ہیں۔ آؤ چلیں ہم رسول اللہ سے دریافت کرلیں کہ آپ کا جانشین کون ہوگا۔ اگر جانشینی ہم میں ہوئی تو ہمیں معلوم ہو جائے گا اگر کسی اور میں ہوئی تو ہم آپ سے گفتگو کرلیں گے کہ ہمارے لئے وصیت فرما دیں۔ تو حضرت علیؓ نے جواب دیا۔ اس کا خیال رہے کہ خدا کی قسم اگر ہم نے رسول اللہ صلعم سے خلافت کا سوال پیدا کیا اور ہمیں اس سے روک دیا گیا تو پھر لوگ کبھی بھی ہمیں خلافت نہیں دیں گے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں تو خدا کی قسم اس کے متعلق آپ سے سوال نہیں کروں گا۔

صحابہ میں سے کچھ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ حضرت علیؓ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ وغیرہ سے افضل ہیں۔ لوگوں کا بیان ہے کہ اس قسم کی رائے حضرت عمارؓ ابوذرؓ سلمان فارسیؓ جابر بن عبد اللہ عباسؓ اور ان کی اولاد، ابی بن کعبؓ حذیفہ اور دیگر بہت سے صحابہ کی تھی۔

اس دور کے بعد ہمیں نظر آتا ہے کہ اس سادہ سے تصور نے بڑی اہمیت اختیار کرلی اور وہ ایک مستقل نظریہ بن گیا، چنانچہ شیعان علی کہتے ہیں کہ امامت ان مصالح عامہ میں سے نہیں ہے جسے امت کی فکر و نظر کے سپرد کر دیا جائے اور جو امت کے متعین کر دینے سے متعین ہو جائے بلکہ یہ تو دین کا رکن اور اسلام کی بنیاد ہے۔ نبی کے لئے جائز ہی نہیں کہ وہ اسے یونہی چھوڑ جائے اور امت کے حوالے کر جائے۔ بلکہ نبی کا فریضہ ہے کہ وہ امت کے لئے ایک امام کو مقرر کر کے جائے۔ وہ امام کبائر و صغائر (چھوٹے بڑے گناہوں) سے معصوم ہونا چاہیئے اور رسول اللہ صلعم نے حضرت علیؓ کو امامت کے لئے متعین فرما دیا تھا۔ اس مقصد کے لئے وہ چند نصوص بھی نقل کرتے ہیں اور ان کی تاویلیں اپنے مذہب کے مطابق کر لیتے ہیں۔ مگر یہ نصوص ایسی ہیں جن کو نہ علمائے حدیث پہچانتے ہیں اور نہ ناقلین شریعت۔ ان میں سے زیادہ تر موضوع، اور سند کے اعتبار سے مطعون یا ان کی فاسد تاویلات سے بہت ہی بعید ہیں[1]۔

---

[1] مقدمہ ابن خلدون

**وصی کا عقیدہ**

اس سے وصیت کا تصور پیدا ہوا اور حضرت علیؓ کو "وصی" کا لقب دیا گیا جس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلعم نے اپنے بعد خلافت کے لئے حضرت علیؓ کے لئے وصیت فرمائی تھی لہٰذا وہ رسول اللہ صلعم کے وصی تھے یعنی حضرت علیؓ انتخاب کے طریقے سے امام نہیں بلکہ رسول اللہ کی طرف سے نص کے طریقے سے امام ہیں۔ اور حضرت علیؓ نے اپنے بعد والوں کے لئے وصیت فرما دی تھی۔ ایسے ہی ہر دوسرا امام پہلے امام کا وصی ہوا کرتا ہے۔ یہ "وصی" کا لفظ شیعوں میں خوب پھیلا کچھ اس قسم کے اشعار بھی نقل کئے جاتے ہیں جن میں دور اول کے شعراء نے حضرت علیؓ کو وصی کے لقب سے یاد کیا ہے۔ اگرچہ ہمارے نزدیک ان اشعار کی نسبت ان لوگوں کی طرف مشکوک ہے جن کے وہ بتائے جاتے ہیں تاہم اتنی بات ضرور ثابت ہوتی ہے کہ "وصی" کا لفظ عموماً اس دور میں حضرت علیؓ کے لئے بولا جانے لگا تھا۔[1]

**عصمتِ ائمہ**

اس نظریہ نے شیعانِ علی کو اور کئی نظریئے قائم کرنے پر مجبور کر دیا۔ مثلاً اماموں یعنی حضرت علیؓ اور ان کے بعد والے ائمہ کے معصوم ہونے کا عقیدہ۔ چنانچہ کوئی غلطی ان کی طرف منسوب نہیں کی جا سکتی۔ ان سے محض صحیح بات ہی کا صدور ہو سکتا ہے۔ نیز حضرت علیؓ کو مرتبہ دوسرے صحابہ حتیٰ کہ ابوبکرؓ و عمرؓ سے برتر قرار دینا۔ مثال کے طور پر ابن ابی الحدید کا وہ قول ملاحظہ فرمائیے جو انھوں نے حضرت علیؓ کے بارے میں لکھا ہے۔ حالانکہ ابن ابی الحدید نہایت معتدل شیعوں میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں ۔۔۔۔

"ہمارے اصحاب کہتے ہیں ۔۔۔ اور یہی لوگ ہیں جو میانہ روی کے راستہ پر ہیں ۔۔۔ کہ حضرت علیؓ آخرت میں تمام مخلوقات سے افضل ہیں اور جنت میں ان کا مرتبہ سب سے بلند ہوگا۔ ایسے ہی وہ دنیا میں بھی ساری مخلوق سے افضل ہیں۔ ان کے خصائص، امتیازات اور فضائل و مناقب سب سے زیادہ ہیں۔ جو شخص ان سے دشمنی رکھے، جنگ کرے یا بغض رکھے تو وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا دشمن ہے۔ اور کفار و منافقین کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ دوزخ میں رہے گا بجز ان لوگوں کے جن کی توبہ ثابت ہو چکی ہو اور علیؓ کی تولی اور محبت پر اس کی موت ہوئی ہو۔ وہ افاضل مہاجرین و انصار جنھیں حضرت علیؓ سے پہلے خلافت سپرد کر دی گئی تھی۔ ان میں سے اگر کسی نے حضرت علیؓ وغیرہ کی امامت کا انکار کیا ہو یا ان کا حق امامت غصب کیا ہو چہ جائیکہ ان کے خلاف تلوار اٹھائی ہو یا خود اپنی امامت کی طرف لوگوں کو دعوت دی ہو۔ تو ہم یہی کہیں گے کہ وہ سب ہلاک ہونے والے لوگوں میں سے ہیں۔ ایسے ہی جیسے ان پر رسول اللہ صلعم نے غصہ فرمایا ہو۔ کیونکہ رسول اللہ صلعم سے یہ ثابت ہے کہ آپ نے حضرت علیؓ سے فرمایا تھا۔ تم سے جنگ مجھ سے جنگ ہے اور تم سے صلح مجھ سے صلح ہے۔ نیز آپ نے فرمایا تھا۔ خدایا اسے دوست رکھ جو علیؓ کو دوست رکھے اور اس سے دشمنی رکھ جو علیؓ سے دشمنی رکھے۔ نیز آپ نے فرمایا تھا اے علیؓ تم سے وہی آدمی محبت رکھے گا جو مومن ہوگا اور تم سے وہی آدمی بغض رکھے گا جو منافق ہوگا۔ لیکن ہم نے حضرت علیؓ کو دیکھا کہ انھوں نے دوسروں کی امامت کو پسند کیا، ان کی بیعت کی اور ان کے پیچھے نمازیں پڑھیں ۔۔۔۔۔۔ ہمارے لئے یہ جائز نہیں کہ ہم ان کے فعل سے تجاوز کر جائیں۔ اور جو کچھ ان کے متعلق مشہور ہے اس سے کبھی آگے بڑھ جائیں۔ تم دیکھتے نہیں کہ حضرت علیؓ نے معاویہؓ سے اپنی برأت کی تو ہم نے بھی ان سے برأت کر دی اور جب انھوں نے معاویہ پر لعنت بھیجی تو ہم نے بھی لعنت بھیجنی شروع کر دی اور جب اہل شام کی گمراہی کا انھوں نے فیصلہ دیدیا جن میں کچھ

---

[1] عربی اشعار حذف کر دیئے گئے ہیں کیونکہ ناظرین کو ان سے دلچسپی نہیں ہوگی۔ (طلوع اسلام)

صحابہ بھی موجود تھے مثلاً عمرو بن العاص اور ان کے بیٹے عبداللہ وغیرہ تو ہم نے ان کی گمراہی کا فیصلہ کر دیا۔ حاصل یہ ہے کہ ہم حضرت علیؓ اور رسول اللہ صلعم کے درمیان بجز نبوت کے سوا اور کسی فرق کے قائل نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ ہم ان کے ان تمام فضائل کو تسلیم کرتے ہیں جن میں وہ رسول اللہ کے ساتھ شریک ہیں۔ ہم ان اکابر صحابہؓ پر طعن نہیں کرتے جن کے متعلق حضرت علیؓ کے متعلق صحیح سند سے ثابت نہیں ہوا کہ انھوں نے ان پر طعن کیا ہو۔ ہم ان سے وہی معاملہ کرتے ہیں جو ان کے ساتھ خود حضرت علی علیہ السلام نے معاملہ فرمایا تھا۔[۱]

شیعوں کو حضرت علیؓ کی افضلیت اور معصومیت کا قائل ان واقعات نے بنایا جو صحابہؓ سے حضرت ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم سے بیعت کے سلسلہ میں صادر ہوئے تھے۔ ان شیعوں میں کچھ غلو پسند تھے اور کچھ میانہ رو تھے۔ بعض لوگوں نے تو اتنا کہنے پر ہی اکتفا کیا کہ حضرت ابوبکر، عمر اور عثمان اور ان کے ہم خیال صحابہ نے غلطی کی کہ انھوں نے حضرت علیؓ کی فضیلت کو جانتے ہوئے اور یہ سمجھتے ہوئے کہ وہ ان سے بہتر ہیں خود خلیفہ بننا پسند کر لیا۔ کچھ لوگوں نے اس میں غلو سے کام لیا اور انھوں نے ان تمام حضرات کو کافر قرار دیدیا۔ کیونکہ ........ نبی صلعم نے حضرت علیؓ کے لئے وصیت فرمادی تھی اور ...... ان لوگوں نے وصیت کا انکار کیا اور خلافت کے مستحق کو خلافت سے روکا تھا۔ اس کے بعد یہ لوگ تاریخی واقعات کی شرح اپنے اپنے مذہب کے مطابق کرتے ہیں، اور واقعات و حقائق کی عجیب و غریب تاویلیں کرتے ہیں۔ مثلاً ..... شیعوں کا خیال یہ ہے کہ رسول اللہ صلعم کو اپنی وفات کا علم ہو چکا تھا اور آپ نے ابوبکرؓ و عمرؓ کو اسامہ کے لشکر میں اسی لئے جانے کو کہا تھا کہ دارالہجرت ان دونوں سے خالی ہو جائے۔ اور خلافت کا معاملہ حضرت علی علیہ السلام کے لئے صاف ہو جائے۔ اور جو مسلمان مدینہ منورہ میں پیچھے رہ جائیں وہ سکون و اطمینان سے حضرت علیؓ سے بیعت کر لیں۔ جب ان دونوں (ابوبکر و عمرؓ) کو رسول اللہ صلعم کی وفات اور لوگوں کے علیؓ سے بیعت کر لینے کی خبر پہنچے تو وہ خلافت اور خلافت دونوں سے دور جا پڑیں ...... لیکن رسول اللہ صلعم نے جو اندازہ لگایا تھا وہ پورا نہ ہو سکا۔ اور اسامہؓ باوجود رسول اللہ صلعم کے شدت اصرار کے لشکر کو لیکر روانہ نہ ہوئے اور جم کر بیٹھ رہ گئے۔[۲]

## حضرت علی کی الوہیت کا عقیدہ

غلو پسند شیعوں نے حضرت علیؓ کے متعلق اتنے پر ہی اکتفا نہیں کیا انھوں نے اسی پر قناعت نہیں کی کہ حضرت علیؓ کو رسول اللہ کے بعد تمام مخلوق سے افضل قرار دے دیتے اور ان کو معصوم بنا دیتے بلکہ انھوں نے انھیں خدا بھی بنا ڈالا۔ چنانچہ ان میں کچھ لوگ اس کے قائل ہیں کہ ایک الوہیاتی جز وان کے اندر حلول کر گیا تھا اور ان کے جسم کے ساتھ وہ متحد ہو گیا تھا۔ ساتھ ہی یہ بھی کہ ان کو غیب کا علم تھا۔ چنانچہ انھوں نے بڑے بڑے فتنوں کی خبریں دیں اور وہ خبریں صحیح ثابت ہوئیں۔ وہ کفار کے ساتھ اس علم غیب کے مطابق ہی جنگیں کیا کرتے تھے اور فتح و ظفر ان کے قدم چومتی تھی۔ اسی الوہیاتی قوت کے ساتھ انھوں نے خیبر کا دروازہ اکھاڑا تھا۔ چنانچہ اسی کے متعلق انھوں نے فرمایا تھا کہ "بخدا میں نے جسمانی طاقت سے خیبر کا دروازہ نہیں اکھاڑا اور نہ کسی غذائی قوت کے بل پر بلکہ ملکوتی قدرت کے ساتھ میں نے اس کو اکھاڑا تھا ...... یہ لوگ

---

[۱] شرح نہج البلاغۃ صفحہ ۵۲۰ جلد ۲ [۲] شرح نہج البلاغۃ صفحہ ۵۳ جلد ۱

کہتے ہیں کہ اکثر مختلف زمانوں میں حضرت علیؓ کا ظہور ہوتا رہتا ہے ...... کڑک گرج ان کی آواز ہے اور بجلی کا چمکنا ان کا تبسم ہے۔ ...... الخ جن لوگوں نے حضرت علیؓ کو خدا بنایا ہے وہ انھیں خدا قرار دینے میں ہر بات کہتے چلے گئے ہیں اور اس سلسلہ میں انھوں نے بہت ہی عجیب وغریب داستانیں گھڑ رکھی ہیں جن کے طویل ذکر سے کوئی فائدہ نہیں ــــ لوگوں کا بیان ہے کہ سب سے پہلے جس شخص

## عبداللہ ابن سبا

نے ان کی الوہیت کی دعوت دی وہ عبداللہ بن سبا یہودی تھا[1]۔ یہ سب کچھ حضرت علیؓ کی زندگی ہی میں ہوتا رہا۔ اس ابن سبا کا کچھ حال آپ پہلے بھی دیکھ چکے ہیں۔ یہی وہ بڑا شخص تھا جس نے مختلف شہروں کے لوگوں کو حضرت عثمانؓ کے خلاف بھڑکایا تھا۔ اب اسی شخص نے حضرت علیؓ کو خدا بنا ڈالا۔ جو کچھ اس کی تاریخ کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اس نے اس قسم کی تعلیمات اسلام کو منہدم کرنے کے لئے پھیلائی تھیں اور اپنی تعلیمات کو پھیلانے کے لئے مخفی جماعتیں قائم کر رکھی تھیں۔ اسلام کو اس نے محض اپنی بدنیتی کو چھپانے کے لئے ایک پردہ کے طور پر استعمال کیا تھا۔ اسلام لانے کے بعد یہ بصرہ میں آیا اور وہاں اپنی دعوت پھیلانی شروع کی تو بصرہ کے گورنر نے اسے وہاں سے نکال دیا۔ پھر وہ کوفہ میں گیا اور وہاں سے بھی نکالا گیا۔ پھر یہ مصر گیا۔ مصر کے لوگ اس کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ اس کی مشہور ترین تعلیمات میں سے وصیت اور رجعت کا عقیدہ ہے۔ وصیت کے متعلق تو ہم بیان کر چکے ہیں۔ وصیت کا قول ہی اہل مصر کو حضرت عثمانؓ کے خلاف بھڑکانے کا بڑا سبب تھا یعنی یہ دعوی کہ حضرت عثمانؓ نے بلا حق کے خلافت حضرت علیؓ سے غصب کر لی تھی۔ اس رائے کی تائید ان برائیوں

## عقیدہ رجعت

سے کی گئی جو حضرت عثمانؓ کی طرف منسوب کر دی گئی تھیں۔ رہ گیا رجعت کا عقیدہ تو عبداللہ ابن سبا نے پہلے پہلے یہ بات پھیلائی کہ محمد صلعم دوبارہ واپس تشریف لائیں گے۔ وہ کہا کرتا تھا کہ ان لوگوں پر تعجب ہے جو اس بات کو تو صحیح مانتے ہیں کہ عیسی علیہ السلام دوبارہ واپس آئیں گے اور اسے نہیں مانتے کہ محمد صلعم دوبارہ واپس آئیں گے۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ وہ یکبارگی اس دعوت سے پلٹ گیا ـــ معلوم نہیں کیوں ـــ اور اس نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ حضرت علیؓ دوبارہ لوٹ کر آئیں گے۔ ابن حزم کا بیان ہے کہ حضرت علیؓ کے شہید ہو جانے کے بعد ابن سبا کہا کرتا تھا "تم ہزار مرتبہ ان کا سر ہمارے سامنے لاؤ تب بھی ہم ان کی موت کی تصدیق نہیں کریں گے۔ حضرت علیؓ اس وقت تک نہیں مریں گے جب تک وہ زمین کو اسی طرح عدل وانصاف سے نہ بھر دیں جیسے آج وہ ظلم وجور سے بھری ہوئی ہے۔" رجعت کا یہ تصور ابن سبا نے یہودیت سے لیا تھا جن کے ہاں یہ عقیدہ موجود ہے کہ الیاس نبی آسمان پر چڑھ گئے تھے اور وہ جلد ہی دوبارہ واپس آ کر دین اور قانون کو از سر نو قائم کریں گے۔ یہی تصور نصرانیت میں بھی اس کے ابتدائی ادوار میں پایا جاتا تھا۔ یہی تصور شیعوں میں ترقی پاتا گیا۔ تا آنکہ ائمہ کے غائب اور مخفی ہونے کا عقیدہ بھی پیدا ہو گیا اور کہا جانے لگا کہ امام غائب بہت جلد دوبارہ واپس آ کر زمین کو عدل وانصاف سے بھر دیں گے۔ اسی تصور سے مہدی منتظر کا عقیدہ پیدا

---

[1] شہرستانی صفحہ ۲۰۴ جلد ۱ ۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ عبداللہ ابن سبا محض ایک فرضی کردار ہے جس کا تاریخی حیثیت سے کوئی محقق وجود ثابت نہیں لیکن ہم نے ان لوگوں کے دلائل نہیں دیکھے جو ان کے مدعا کو ثابت کرتے ہوں۔

ہوا۔

جو شخص ان باتوں کو دیکھتا ہے اسے تعجب ہوتا ہے اور اس کا سبب سمجھ میں نہیں آتا کہ ان لوگوں نے حضرت علیؓ کی الوہیت کا عقیدہ کیسے اپنا لیا جبکہ امت میں آج تک کسی نے بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی الوہیت کا کوئی دعویٰ نہیں کیا۔ اور حضرت علیؓ خود اس کی تصریح کرتے ہیں کہ وہ رسول اللہ پر ایمان لا کر مسلمان ہوئے اور آپ ہی کی پیروی کرتے رہے۔ ہماری نظر میں اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ شیعان علی نے حضرت علیؓ کی طرف لاتنے کثیر التعداد معجزات اور علوم غیب منسوب کر دیئے ہیں اور یہاں تک کہہ

**علم غیب**

گذرے ہیں کہ ان کو ان تمام باتوں کا علم تھا جو آیندہ ہونے والی ہیں۔ چنانچہ نہج البلاغت میں خود حضرت علیؓ کی زبان سے انھوں نے یہ کہلوا دیا ہے: "اس سے پہلے کہ میں تم میں نہ رہوں مجھ سے پوچھ لو۔ اس خدا کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے تم اب سے لے کر قیامت تک کے واقعات یا ان جماعتوں کے متعلق جو سو آدمیوں کی رہنمائی کریں یا سو آدمیوں کو گمراہ کریں اگر مجھ سے سوال کرو گے تو میں تمھیں یہاں تک بتا دوں گا کہ اس جماعت میں کون آواز دینے والا ہوگا۔ کون لیڈر ہوگا اور کون ہانکنے والا ہوگا۔ اور ان کی سواریاں کہاں بیٹھیں گی۔ ان کے کجاوے کہاں اتارے جائیں گے۔ کون کون ان میں قتل کیا جائے گا اور کون کون اپنی موت سے مرے گا...... الخ" ان لوگوں کا بیان ہے کہ انھوں نے حضرت حسینؓ کے قتل، واقعۂ کربلا، حجاج، خوارج اور ان کے انجام، بنوامیہ اور ان کی حکومت، بنو بویہ اور ان کے زمانۂ سلطنت وغیرہ تمام واقعات کی خبر دیدی تھی۔ انھوں نے عبد اللہ ابن عباسؓ کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ حکومت ان کی اولاد میں منتقل ہو جائیگی۔ چنانچہ عبد اللہ ابن عباسؓ کے ہاں ان کے بیٹے علی پیدا ہوئے تو حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ بچہ کو حضرت علیؓ کے پاس لے گئے حضرت علیؓ نے انھیں لے کر ان کے منہ میں اپنا لعاب دہن ڈالا اور ایک کھجور چبا کر ان کے تالو سے لگائی اور بچہ کو حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ کو دیتے ہوئے فرمایا ...... لو ...... بادشاہوں کے باپ! اسے لے لو![1] یہ اور اس قسم کی دوسری خبریں شیعوں میں پھیلیں۔ حتیٰ کہ انھوں نے کہنا شروع کر دیا کہ حضرت علیؓ نے جو کچھ ہو چکا تھا اور جو کچھ قیامت کے دن تک ہوگا سب واقعات کی خبر دیدی تھی۔ ان تمام باتوں کو جب تم اس کے ساتھ ملاؤ کہ شیعان علیؓ کی اکثریت عراق میں تھی جو مختلف عناصر پر مشتمل تھے۔ اور عراق قدیم زمانہ سے مختلف عجیب وغریب مذاہب و ادیان کا گہوارہ رہا ہے۔ ان لوگوں میں پہلے ہی سے مانی، مزدک اور ابن ایصان کی تعلیمات پھیلی ہوئی تھیں۔ ان میں نصاریٰ اور یہود بھی تھے۔ انھوں نے ان مختلف مذاہب کو سن رکھا تھا جو بعض انسانوں کے اندر خدا کے حلول کر جانے کے قائل تھے ...... ان تمام امور نے مل کر ان میں ایسے لوگ پیدا کر دیئے جنھوں نے حضرت علیؓ کو خدا بنا دیا۔ رہ گئے عرب تو وہ ان مقالات اور دینی مذاہب سے بہت دور تھے۔ ان کی زندگی سادہ تھی۔ ان کی عقلیت وہی تھی جو فطرت کے مطابق ہو سکتی تھی۔ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ الوہیت کو کیسے چسپاں

---

[1] مبرد کی الکامل۔

کر سکتے تھے جبکہ وہ قرآن کی اس آیت کو بار بار دہرا رہے تھے۔

إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ

حضرت علیؓ کے متعلق یہ عقیدہ اسلام کی اس سادہ اور صاف تعلیم کے بالکل خلاف ہے جو اس نے قدا ... ہو ... اور مادہ سے الگ کے منزہ ہونے کے متعلق پیش کیا ہے۔ خوش نصیبی ہے کہ حضرت علیؓ کے بارہ میں یہ عقیدہ تمام شیعوں یا ان کی اکثریت کا نہیں ہے بلکہ ایک چھوٹے سے فرقہ کا قول ہی ہے جو ان میں بہت ہی غلو پسند واقع ہوئے ہیں۔

## امامت

شیعہ نظریہ کی بنیاد ---- خلیفہ ہے جسے وہ "امام" کہتے ہیں۔ چنانچہ حضرت علیؓ ... صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امام ہیں اور یہ بہ ترتیب کے ساتھ ان اماموں کا سلسلہ خدا کی طرف سے چلتا ہے۔ امام کا اعتراف کرنا اور ... اطاعت کرنا ایمان کا جزو ہے۔ ... ان کی نظروں میں وہ حیثیت نہیں ہے جو اہل سنت کے نزدیک خلیفہ کی ہوتی ہے۔ اہل سنت ... کے نزدیک خلیفہ یا امام ... کی حفاظت ... شریعت کا نائب ہوتا ہے۔ وہ لوگوں کو خدا کے احکام پر عمل کرنے کی ترغیب دیتا ہے اور ... انتظامی اور جنگی سلطنت کا ... ہوتا ہے۔ لیکن اسے تشریعی تسلط حاصل نہیں ہوتا۔ وہ کسی امر کی تشریح و تفسیر کر سکتا ہے جہاں ... نص موجود نہ ہو وہاں اجتہاد کر سکتا ہے لیکن شیعوں کے ہاں امام کی ایک دوسری حیثیت ہے وہ ... سب سے بڑا معلم ہوتا ہے ... امام اول یعنی حضرت علیؓ نے امامت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے وراثتاً پائی تھی۔ امام کوئی معمولی شخصیت نہیں ہوتا بلکہ لوگوں ... حقیقتہً ... ہوتا ہے جو غلطی سے معصوم ہوتا ہے۔

## علم ظاہر و علم باطن

علم کی دو قسمیں ہیں، علم ظاہر اور علم باطن ... تھے، دونوں قسم کے علوم حضرت علیؓ کو سکھائے گئے تھے۔ چنانچہ وہ قرآن کا ظاہر اور باطن دونوں جانتے تھے۔ کائنات کے اسرار و رموز اور غیب کی مخفی باتیں ان کو رسول اللہ نے سکھائی تھیں۔ ہر امام اس علمی ثروت کو اپنے بعد آنے والے امام کو وراثۃً دیتا رہا ہے۔ ہر امام لوگوں کو اپنے زمانہ میں ... اسرار و رموز اتنی ہی تعلیم دیتا ہے جتنا لوگ سمجھ سکیں۔ اسی لئے امام سب سے بڑا معلم ہوتا ہے۔ شیعہ حضرات کسی علم اور کسی حدیث پر اس وقت تک ایمان نہیں لاتے جب تک وہ ان کے اماموں سے مروی نہ ہو۔

## فرقہ زیدیہ

اماموں اور ان کے سلسلہ کے بارہ میں ان میں بڑا اختلاف ہے جس کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ ان کے اہم ترین فرقے دو ہیں۔ زیدیہ اور امامیہ۔ زیدیہ فرقہ زید بن حسن بن علی بن الحسین بن علی بن ابی طالب کے متبعین کہلاتے ہیں۔ ان کا مذہب شیعوں کا معتدل ترین مذہب شمار کیا جاتا ہے ... اہل سنت سے قریب ترین ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ زید ... زیدیہ فرقہ کے امام ---- معتزلہ کے رئیس واصل بن عطاء کے شاگرد تھے۔ اور واصل کی تعلیمات کو انھوں نے بڑی حد تک اپنایا ہے۔ امام زید کا خیال ہے کہ افضل کے ہوتے ہوئے مفضول کی خلافت جائز ہو سکتی ہے۔ چنانچہ ان کا قول ہے کہ علی ابن ابی طالب ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے افضل تھے۔ لیکن ---- اس کے باوجود ---- ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی امارت صحیح ہے۔ امام کے متعلق ان کا

---

... قرآنی اصولوں کی روشنی میں جزئی احکام و قوانین مرتب کر سکتا ہے۔ (طلوع اسلام)

نظریہ کافی معتدل ہے۔ ان کے ہاں امامت نص کے ذریعہ سے نہیں ہوتی۔ نہ کوئی وحی نازل ہوتی ہے جو امام کی تعیین کرتی ہو بلکہ ہر فاطمی عالم زاہد بہادر سخی اور حق کے راستہ میں جہاد کی قوت رکھنے والا جو مطالبۂ امامت کے لئے خروج کرے وہ امام ہو سکتا ہے۔ لہٰذا وہ امام میں امراء اور سلاطین کے خلاف خروج کرنے کی شرط لگاتے ہیں جو خلافت کے مطالبہ کے لئے ہو۔ یہی وجہ ہے کہ امامت ان کے ہاں علانیہ چیز ہے سری چیز نہیں جیسا کہ امامیہ کے ہاں امام غائب پر ختم ہو جاتی ہے۔ وہ ان باتوں پر بھی یقین نہیں رکھتے جو امام کے ساتھ چسپاں کر دی گئی ہیں اور جنھوں نے ان کے لئے الوہی جزو کو ثابت کر دیا ہے۔ زید نے ہشام بن عبد الملک خلیفۂ اموی کے خلاف سنہ ۱۲۱ھ میں خروج کیا۔ ان کو قتل کر دیا گیا اور سولی دے دی گئی۔ ان کے بعد ان کے بیٹے یحییٰ نے سنہ ۱۲۵ھ میں خروج کیا۔ زیدیہ فرقہ آج تک یمن میں موجود چلا آتا ہے۔

امامیہ فرقہ کو امامیہ اس لئے کہتے ہیں کہ ان کے اہم ترین عقائد کی بنیاد امام پر ہی قائم ہوتی ہے۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ محمدؐ نے حضرت علیؓ کی خلافت پر نص فرمائی تھی۔ ابوبکرؓ و عمرؓ نے خلافت کو غصب کر لیا۔ چنانچہ یہ لوگ ان دونوں پر تبرا کرتے ہیں اور ان کی امامت پر اعتراض اور طعن کرتے ہیں۔ انھوں نے امام کے اعتراف کو ایمان کا جزو قرار دیا ہے۔ امامیہ کے بہت سے فرقے ہیں جن میں اماموں کی شخصیتوں پر اتفاق نہیں ہے

## اثنا عشریہ و اسماعیلیہ

ان میں کا مشہور ترین فرقہ "اثنا عشریہ" ہے۔ کیونکہ یہ لوگ اپنے اماموں کے سلسلہ کو بارہ اماموں پر ختم کر دیتے ہیں۔ ان کا یہ عقیدہ دولتِ ایران کا آج تک نافذ عقیدہ چلا آتا ہے۔ دوسرا فرقہ "اسماعیلیہ" ہے۔ کیونکہ وہ اپنے اماموں کے سلسلہ کو اسمٰعیل بن جعفر صادقؒ پر ختم کر دیتے ہیں۔ یہ اسمٰعیلیہ فرقہ تاریخ اسلام میں عرصہ دراز تک بہت کھیل کھیلتا رہا ہے۔ انھوں نے افلاطونیت جدیدہ کو لیا ہے اور عجیب و غریب طریقہ پر اسے اپنے شیعی مذہب پر منطبق کر لیا ہے۔ اس مذہب افلاطونی کا جس قدر حصہ اخوان الصفا نے اپنے رسالوں میں بیان کیا ہے۔ اس سے انھوں نے کام لیا ہے۔ بعض مورخین کا بیان ہے کہ اخوان الصفا نے ان کے لئے جو تعلیم مقرر کی ہے اس کے انھوں نے نو درجے رکھے ہیں۔ پہلے درجہ میں یہ چیز آتی ہے کہ اسلام کے بارہ میں شکوک و شبہات پیدا کئے جائیں۔ مثلاً اس قسم کے سوالات کرنے جائیں۔ جمرات پر کنکریاں مارنا کیا ہوتا ہے۔ صفا مروہ کے درمیان دوڑ لگانے سے کیا مقصد ہے؟ آخری درجہ میں پہنچ کر اسلام بالکل ختم ہو جاتا ہے اور اس کی تمام قیود ختم کر دی جاتی ہیں اور ہر چیز کی ایک تاویل پیش کر دی جاتی ہے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں۔ دین اس کے سوا اور کوئی چیز نہیں کہ دل کی صفائی کا نام ہے۔ دینی شعائر عوام کے لئے ہوتے ہیں۔ خواص کو ان کی کوئی ضرورت نہیں۔ ان کے انبیاء فلاسفہ ہوتے ہیں۔ قرآن کے الفاظ سے استدلال اور تمسک کرنے کے کوئی معنی نہیں۔ وہ تو دراصل کچھ اشیاء کے رموز ہیں جنھیں عارف لوگ ہی جانتے ہیں۔ قرآن کو تاویل اور مجاز کے طریقہ پر سمجھنا ضروری ہے۔ قرآن کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن ہے ہم پر واجب ہے کہ ہم مادی پردوں کو چاک کرتے جائیں تا آنکہ ہم پاکیزہ ترین ممکن روحانیت تک پہنچ سکیں۔ اس وجہ سے یہ اپنے کو "باطنیہ" بھی کہتے ہیں۔ یہاں اتنی گنجائش نہیں کہ ہم ان کی اہم ترین تعلیمات کو بیان کریں اور یہ بتائیں کہ وہ تعلیمات کس طرح افلاطونیت

جدیدہ سے مل گئی ہیں۔ ان کی دعوت کے آثار میں سے مغرب اور مصر میں دولت فاطمیین کا قیام تھا جن کے بقایا آج بھی شام، ایران اور ہندوستان میں پائے جاتے ہیں آج کل ان کے رئیس مشہور رہنما سر آغا خان[1] ہیں۔

امامیہ --- عموماً --- امام منتظر کے دوبارہ واپس آنے کے قائل ہیں اگرچہ --- مختلف فرقوں کے مطابق --- ان میں آپس

**امام منتظر**

میں اختلاف ہے کہ وہ امام منتظر کون ہے؟ ایک فرقہ امام جعفر صادقؒ کا منتظر ہے۔ دوسرا فرقہ محمد بن عبداللہ بن الحسن بن الحسین بن علیؓ بن ابی طالب کا منتظر ہے۔ تیسرا فرقہ محمد بن الحنیفہ کا منتظر ہے اور سمجھے بیٹھا ہے کہ وہ زندہ ہیں، مرے نہیں ہیں۔ اور کوہ رضوی میں چھپے ہوئے ہیں تاآنکہ خدا انہیں باہر نکلنے کی اجازت دے گا۔ چنانچہ کثیر عزہ (مشہور شاعر) اس کے بارہ میں کہتا ہے:

> حق کے محافظ امام قریش میں سے ہوتے ہیں اور وہ صرف چار ہیں۔ حضرت علیؓ اور تین ان کی اولاد میں سے۔ یہی اسباط ہیں جس میں کوئی خفا نہیں ایک تو ایمان اور بھلائی کا مالک حسن اور دوسرے وہ امام جسے کربلا نے غائب کر دیا اور تیسرے وہ جو موت کا مزہ اس وقت تک نہیں چکھے گا جب تک وہ فوجوں کی قیادت نہ کرے جس کے آگے آگے جھنڈے چل رہے ہوں گے۔

وہ رضوی میں غائب ہو گیا ہے۔ عرصہ تک نظر نہیں آئے گا۔ اس کے پاس شہد اور پانی کی نہریں ہیں۔

سید حمیری مشہور اموی شاعر کا بھی یہی عقیدہ تھا کہ محمد بن الحنیفہ مرے نہیں اور وہ جبل رضوی میں پوشیدہ ہیں۔ ایک شیر اور چیتا ان کی حفاظت کر رہا ہے۔ ان کے قریب ہی دو چشمے اُبل رہے ہیں ایک پانی کا چشمہ ہے اور دوسرا شہد کا۔ کچھ عرصہ غائب رہنے کے بعد وہ دوبارہ آئیں گے اور دنیا کو عدل و انصاف سے بھر دیں گے جیسا کہ وہ آج ظلم و جور سے بھری ہوئی ہے اسی قسم کی بہت سی باتیں ان کے ہاں مشہور ہیں جن کو بیان کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اس عقیدہ کی بنیاد وہی ہے جسے ہم ابن سبا کے قول میں پہلے بیان کر چکے ہیں کہ حضرت علیؓ دوبارہ واپس آئیں گے۔ اور اسے اس نے یہودیت سے لیا تھا۔ شیعوں کو ابتداً روئے زمین پر کوئی ظاہری مملکت قائم کرنے میں کامیابی نہ ہو سکی۔ ان کو تکلیفیں دی گئیں اور پراگندہ و منتشر کر دیا گیا تو انھوں نے ہمارے خیال کے مطابق؛ امام منتظر اور مہدی وغیرہ کے پُر امید عقائد ایجاد کئے تاکہ عوام کی ڈھارس بندھی رہے۔ ان دونوں فرقوں کا قدرے تفصیلی تذکرہ ہم آگے چل کر بھی کریں گے۔

---

**شیعہ اور بنو امیہ**

شیعہ اور خوارج کی تعلیمات اس امر پر متفق ہیں کہ خلفائے بنی اُمیہ غاصب اور ظالم تھے۔ لہٰذا یہ دونوں بنو اُمیہ سے مقابلہ کرنے میں متحد تھے۔ لیکن خوارج کھلم کھلا جنگ کرتے تھے۔ ان پر بدوی طبیعت ---

---

[1] اب ان مشہور آغا خان کے بیٹے عبدالکریم آغا خان ہیں۔ طلوعِ اسلام

صاف بیانی ـــــ غالب تھی۔ ان میں سے زیادہ تر لوگ تقیہ کے قائل نہیں تھے۔ لیکن شیعہ کھلم کھلا جنگ اس وقت کرتے تھے جب وہ اس کی قدرت دیکھتے تھے۔ اور جب انھیں قدرت نہیں ہوتی تھی تو اندر اندر ریشہ دوانیاں کرتے تھے۔ ان میں سے زیادہ لوگ تقیہ کے قائل تھے[1] اس لئے یہ لوگ بنی امیہ کے لئے شدید خطرہ بن گئے تھے اور وہ برابر ان سے چوکنے رہتے تھے۔ ہر طرف انھوں نے شیعوں کا پتہ لگانے کے لئے جاسوس پھیلا رکھے تھے۔ اور انھوں نے شیعوں کو بری طرح پامال کیا۔

بنو امیہ کے بعد عباسیوں کا دور آیا تو یہ شیعوں کے حق میں بنو امیہ سے بھی دس قدم آگے نکلے۔ مصیبت یہ تھی کہ عباسیوں کو ان کے پوشیدہ ٹھکانوں اور پناہ گاہوں تک کا پورا پورا علم تھا کیونکہ بنو امیہ کے دور میں یہ لوگ شیعوں کے ساتھ مل جل کر کام کرتے رہے تھے۔

## شیعوں کا خفیہ نظام

ان آزمائشوں نے شیعوں کے خفیہ نظام کو اور بھی مضبوط کر دیا۔ چنانچہ تمام اسلامی فرقوں میں یہ فرقہ پوشیدہ طور پر کام کرنے کی زیادہ قدرت رکھتا ہے یہ رازداری کا جذبہ ہی تھا جس کے ساتھ فریب، دھوکہ اور رموز و تاویل کی پناہ ان کے اندر آتی چلی گئی۔ انہی آزمائشوں کا اثر تھا کہ ان کا ادب گہرے حزن و الم، نوحہ و ماتم اور مصائب و آلام کے تذکرہ سے رنگین ہوتا چلا گیا۔

انھوں نے بنو امیہ کا مقابلہ ان تمام حربوں سے کیا جو وہ ان کے خلاف استعمال کرتے تھے۔ بنو امیہ نے حضرت علیؓ اور دیگر ہاشمی صحابہ کو چھوڑ کر تمام صحابہؓ کے فضائل میں اور خصوصاً حضرت عثمانؓ کے فضائل میں حدیثیں گھڑیں تو شیعوں نے حضرت علیؓ اور مہدی منتظر کی شان میں بھی حدیثیں گھڑیں بلکہ وہ تمام حدیثیں گھڑ دیں جو اُن کے مذہب کی تائید کر سکیں۔ اور سچ یہ ہے کہ اس خصوصیت میں وہ بنو امیہ پر بھی بازی لے گئے۔ ان کے علماء علم حدیث ہی کے پیچھے لگ گئے۔ ثقہ لوگوں سے انھوں نے حدیثیں سنیں صحیح اور معتمد سندوں کو انھوں نے یاد کر لیا اور پھر انہی سندوں سے ایسی ہزاروں حدیثیں پھیلا دیں جو ان کے مذہب کی تائید کرتی تھیں۔ انھوں نے بڑے بڑے علمائے حدیث کو گمراہ کر دیا۔ کیونکہ وہ لوگ ان سندوں سے دھوکہ کھا جاتے تھے۔ ان میں ایسے ایسے لوگ تھے جنھوں نے اپنا نام سُدّی اور ابن تقیہ رکھ لیا تھا اور پھر بس سُدّی اور ابن تقیہ سے روایتیں بیان کرتے تھے۔ اہل سُنّت سمجھتے تھے کہ یہ

---

[1] تقیہ سے مراد ظاہری مدارات ہے مثلاً کوئی شخص اپنی جان، آبرو اور مال کی حفاظت کے لئے بظاہر ایسا عقیدہ رکھتا یا ایسا عمل کرتا ہے جسے وہ صحیح نہیں سمجھتا۔ چنانچہ جو شخص کسی دین اور مذہب کا متبع ہو لیکن وہ اسے ظاہر نہ کرے تو تقیہ کے طور پر اس کے خلاف ظاہر کر سکتا ہے۔ کفار اور ظالم لوگوں کے ساتھ معاملات اور تبسم کے ساتھ پیش آنے کو یہ لوگ تقیہ شمار کرتے ہیں۔ شیعہ، خوارج اور اہل سنت کا اس بارہ میں اختلاف ہے۔ اکثر شیعہ اس کے قائل ہیں بلکہ بعض شیعوں نے تو یہاں تک کہا ہے کہ ادنیٰ خوف اور طمع کے لئے تقیہ کر لینا واجب ہے۔ ابوبکرؓ، عمرؓ اور عثمانؓ سے حضرت علیؓ کی بیعت کر لینے کو بھی انھوں نے تقیہ پر ہی حمل کیا ہے۔ اکثر شیعہ اپنے شیعہ ہونے کو چھپاتے تھے اور خفیہ طور پر کام کرتے تھے۔ لیکن اکثر خوارج کا یہ قول تھا کہ تقیہ جائز نہیں ہے۔ دین کے مقابلہ میں جان، آبرو اور مال کی کوئی قیمت نہیں۔ ان میں سے بعض لوگ یہاں تک کہتے ہیں کہ اگر چور آجائے اور سامان چرا کر لیجانے لگے اور یہ آدمی

باقی صفحہ ۹۶ پر

دونوں مشہور مصنف ہیں حالانکہ سدی اور ابن قتیبہ جن سے یہ لوگ روایتیں بیان کرتے تھے غلو پسند شیعہ تھے۔ آخر ان دونوں میں فرق کرنا پڑا کہ ایک سدی کبیر ہیں اور دوسرے سدی صغیر ہیں۔ پہلے ثقہ ہیں اور دوسرے شیعی وضاع ہیں۔ ایسے ہی ابن قتیبہ شیعی عبداللہ بن مسلم بن قتیبہ سے الگ ہیں۔ ان لوگوں نے کتابیں لکھیں اور انھیں اپنی تعلیمات سے بھر دیا اور انھیں اہل سنت کے اماموں کی طرف منسوب کر دیا۔ جیسے مثلاً کتاب "سر العارفین" جسے ان لوگوں نے غزالی کی طرف منسوب کر رکھا ہے۔ علاوہ ازیں مختلف کتابوں میں نظر آتا ہے کہ ان لوگوں نے ہر علم و فضل کی سند حضرت علی ابن ابی طالبؓ کی طرف جوڑ دی ہے کہ یا تو انھوں نے بذاتِ خود اس علم کو قائم کیا تھا یا ان کی ذریت میں سے کسی نے قائم کیا تھا۔ اب دیکھئے معتزلہ کا علم اس طرح آیا کہ دراصل ابن عطا ــــ معتزلہ کے امام ــــ نے علم کو ابو ہاشم عبداللہ بن محمد بن الحنفیہ سے حاصل کیا تھا اور ابو ہاشم اپنے باپ کے شاگرد تھے۔ اور ان کے باپ حضرت علیؓ کے شاگرد تھے۔ ایسے ہی امام اعظم ابو حنیفہؒ نے علم فقہ امام جعفر صادقؒ سے حاصل کیا تھا۔ مالک بن انس نے ربیعۃ الرائے سے پڑھا تھا اور ربیعہ نے عکرمہ سے اور عکرمہ نے عبداللہ بن عباس سے اور عبداللہ نے حضرت علیؓ سے پڑھا تھا۔ اس طریقہ سے امام شافعی کی فقہ کا جوڑ بھی حضرت علیؓ سے ہی ملا دیا جاتا ہے کیونکہ وہ بھی مشکل مسائل میں حضرت علیؓ ہی سے رجوع فرمایا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ اگر علیؓ نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو گئے ہوتے۔ قرآن کی تفسیر زیادہ تر حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے ملی گئی ہے اور حضرت عبداللہ نے تفسیر قرآن حضرت علیؓ سے پڑھی تھی۔ چنانچہ ابن عباسؓ سے پوچھا گیا کہ تمہارے چچیرے بھائی (حضرت علیؓ) سے تمہارے علم کی نسبت کیا ہے؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ وہی نسبت ہے جو بارش کے ایک قطرہ کو بڑے سمندر سے ہوتی ہے ــــ تصوف تو حضرت علی کی طرف منسوب ہے ہی۔ شبلی، جنید، سستری تفعلی، ابو یزید بسطامی سب نے حضرت علیؓ کی طرف نسبت کی ہے اس خرقہ کی نسبت بھی حضرت علیؓ ہی کی طرف کی جاتی ہے جو ان کا شعار کہلاتا ہے ــــ ابوالاسود دؤلی جس نے علم نحو کو وضع کیا تھا انھوں نے بھی علم نحو حضرت علی ہی سے سیکھا تھا۔ چنانچہ حضرت علی نے ہی انھیں لکھوایا تھا کہ کلام میں تین چیزیں ہوتی ہیں۔ اسم۔ فعل اور حرف۔ پھر اسم کی تقسیم معرفہ اور نکرہ کی طرف بھی انہی حضرت علی ہی نے بتائی تھی اور یہ بات بھی کہ اعراب چار طرح کے ہوتے ہیں۔ زبر۔ زیر۔ پیش اور جزم۔ حاصل یہ ہے کہ اسلام کا کوئی علم بھی ایسا نہیں جس کی بنیاد حضرت علیؓ نے ہی نہ رکھی ہو۔

واقعہ یہ ہے کہ شیعیت ہر اس شخص کی پناہ گاہ تھی جو عداوت اور کینہ کی وجہ سے اسلام کو منہدم کرنا چاہتا تھا۔ کچھ لوگ

---

؎ حتیٰ کہ امام طبری (جو سنیوں کے بہت بڑے امام شمار کئے جاتے ہیں) جنھوں نے سب سے پہلی مبسوط تفسیر اور سب سے پہلی تاریخ لکھی ہے وہ بھی (تحقیق جدیدہ کے مطابق) بہ باطن شیعہ تھے۔ (طلوعِ اسلام)

صفحہ ۹۵ کا بقیہ فٹ نوٹ) نماز پڑھ رہا ہو تو اس کے لئے نماز کی نیت توڑ دینا جائز نہیں ہے۔ اہل سنت نے درمیانی راہ اختیار کی۔ وہ کہتے ہیں کہ جسے اپنے عقیدہ کی وجہ سے اپنی جان یا مال کا خوف ہو تو اسے اس شہر سے ہجرت کر لینی چاہیئے۔ لیکن اگر ہجرت نہ کر سکتا ہو تو بقدر ضرورت تقیہ کر سکتا ہے لیکن اس پر یہ واجب ہے کہ اپنے دین کو لے کر یہاں سے نکل جانے کی برابر کوشش کرتا رہے۔ الخ

## تشیع تمام مخالفین اسلام کی پناہ گاہ

ایسے تھے جو اپنے آبا و اجداد کی تعلیمات ـــــ یعنی یہودیت، نصرانیت - زردشتیت اور ہندویت کو اس راستے سے اسلام میں داخل کرنا چاہتے تھے۔ کچھ ایسے تھے جو اسلامی مملکت کے خلاف خروج کر کے آزادی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ یہ سب کے سب اہل بیت کی محبت کا نقاب ڈال لیتے تھے اور اس کے اندر اپنی اپنی خواہشات کے ماتحت اسلام میں نئی نئی چیزیں داخل کرتے چلے جاتے تھے۔ یہودیت نے تشیع میں رجعت کا عقیدہ پیدا کر کے جنم لیا۔ شیعوں نے کہا کہ جہنم کی آگ شیعوں پر حرام ہے بجز چند دنوں کے۔ یعنی وہی بات جو یہودیوں نے کہی تھی کہ "لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَاتٍ" نصرانیت نے تشیع میں اس راستے سے ظہور کیا کہ امام کی نسبت خدا کے ساتھ وہی ہوتی ہے جو مسیح کی نسبت خدا کے ساتھ ہے۔ نیز شیعوں نے کہا کہ "امام کی ہستی میں لاہوت اور ناسوت دونوں متحد ہوتے ہیں" اور یہ کہ "نبوت اور رسالت کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔ جس ہستی میں لاہوت ناسوت کے ساتھ متحد ہو جائے وہ نبی کہلاتا ہے۔" تشیع کے ماتحت۔ روحوں کا تناسخ - خدا کا تجسم (جسم بن جانا) اور حلول وغیرہ اقوال جو برہمنوں۔ فلسفیوں اور مجوسیوں میں اسلام سے پہلے سے چلے آتے تھے اسلام میں داخل ہوتے چلے گئے۔ ایرانیوں نے تشیع کے پردہ میں دولت امویہ سے جنگ کی انکے دل میں سوائے عربوں اور عربوں کی حکومت کی ناپسندیدگی کے اور کوئی چیز نہیں تھی۔ وہ اپنی آزادی کے لئے اس راہ سے کوشش کر رہے تھے۔ مقریزی کا بیان ہے کہ "ایران کی سرزمین سے تو برنو اٹھنے والے "اکثر فرقوں کے دین اسلام سے نکل جانے کا سبب یہ تھا کہ ایرانی قوم جو وسیع سلطنت کی مالک تھی، جن کا ہاتھ دوسری قوموں سے ہمیشہ اونچا رہتا تھا، جنھیں اپنی عظمت و سطوت کا قلبی شعور بھی تھا۔ چنانچہ وہ خود کو آزاد اور سردار کہا کرتے تھے اور دوسرے لوگوں کو اپنا غلام سمجھتے تھے۔ جب وہ اس آزمائش میں مبتلا ہوئے کہ عربوں کے ہاتھوں ان کی سلطنت کا زوال عمل میں آ گیا جن سے انھیں کم سے کم اس کا اندیشہ ہو سکتا تھا۔ تو یہ بات ان کو بڑی ہی شاق گذری اور اس مصیبت نے ان کے گھروں میں کہرام مچا دیا۔ مختلف اوقات میں وہ اسلام کو شکست دینے کے لئے جنگ آزمائیاں کرتے رہے۔ مگر ہر میدان جنگ میں خدا نے حق ہی کو فتح دی ........ انھوں نے دیکھا کہ یوں کام نہیں چلیگا۔ اس لئے کہ کوئی خفیہ تدبیر کرنی چاہیئے۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے بظاہر مسلمان بن کر اور اہل بیت کی محبت ظاہر کر کے شیعوں کے دلوں کو اپنی طرف مائل کر لیا اور حضرت علیؓ پر جو ظلم ہوا تھا اس کی آڑ لے کر متفرق راہوں پر چل نکلے اور مسلمانوں کو صحیح راستہ سے بھٹکا کر گمراہی کے غار میں دھکیل گئے۔[1]

وِلہوسن (Well hausin) کا خیال ہے کہ شیعی عقائد نے ایرانی مذاہب کی نسبت یہودیت کا اثر زیادہ قبول کیا ہے۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ اس مذہب کا بانی عبد اللہ بن سبا یہودی تھا۔ لیکن ڈوزی (DOZY) کا رجحان اس طرف ہے کہ شیعیت کی بنیاد ایرانی ہے۔ عرب حریت پسند ہیں اور ایرانی شہنشاہیت کے پابند۔ وہ شاہی خاندان میں وراثت کے قائل ہیں۔ وہ خلیفہ کے انتخاب کا مطلب ہی نہیں سمجھتے تھے۔ محمد صلعم کی وفات ہوئی۔ آپ نے کوئی لڑکا نہیں چھوڑا تھا۔ لہذا آپ کے بعد آپ کے

---

[1] صفحہ ۳۶۲ جلد ۱ مختصراً

چچیرے بھائی علی بن ابی طالب ہی کو بادشاہ ہونا چاہیئے تھا۔ جن لوگوں ـــــ ابوبکرؓ عمرؓ عثمان اور دیگر اموی خلفاءـــــ نے ان سے خلافت لی تھی۔ انھوں نے ایک مستحق سے اس کا غصب کیا تھا۔ پھر ایرانی اس کے بھی عادی تھے کہ وہ اپنے بادشاہوں کو الوہیت کی نظر سے دیکھتے آئے تھے۔ اس نظر سے انھوں نے حضرت علی اور ان کی ذریت کو بھی دیکھا اور کہہ دیا کہ "امام کی اطاعت کرنا سب سے پہلا فریضہ ہے اور امام کی اطاعت در اصل خدا کی اطاعت ہوتی ہے:

جہاں تک میں سمجھا ہوں ـــــ جیسا کہ تاریخ ہماری رہنمائی کرتی ہے ـــــ شیعیتِ علیؓ ایرانیوں کے اسلام میں داخل ہونے سے پہلے ہی شروع ہو چکی تھی۔ لیکن بالکل سادہ طریقہ پر۔ یعنی یہ کہ حضرت علیؓ دو وجہوں سے دوسرے لوگوں کی بہ نسبت خلافت کے زیادہ حقدار تھے۔ ایک تو اپنی ذاتی خوبیوں کی وجہ سے اور دوسرے نبی صلعم کی قرابت کی وجہ سے۔ عرب قدیم الایام سے ریاست اور ریاست کے گھرانے پر فخر کرتے آئے تھے۔ یہ جنگ ـــــ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں ـــــ نبی صلعم کی وفات کے بعد سے شروع ہوئی اور جوں جوں زمانہ گزرتا گیا ـــــ مطاعن عثمانؓ کے ساتھ ـــــ یہ بڑھتی چلی گئی ـــــ لیکن اس شیعیت نے یہ جدید رنگ اس وقت اختیار کیا جب اسلام میں دوسرے عناصر یہودیت، نصرانیت، اور مجوسیت وغیرہ ـــــ داخل ہوتے چلے گئے۔ ان میں سے ہر قوم نے تشیع کو اپنے اپنے رنگ میں رنگا۔ یہودیوں نے اسے یہودیت کا بپتسمہ دیا اور نصرانیت نے نصرانیت کا۔ یہی کچھ دوسری قومیں کرتی رہیں۔ اور چونکہ وہ بڑا عنصر جو اسلام میں داخل ہوا تھا وہ ایرانی عنصر ہی تھا اس لئے تشیع میں بھی ایرانیوں ہی کا زیادہ اثر رہا۔

---

## شیعوں کے چند مشہور عقائد

جیسا کہ آپ دیکھ چکے ہیں، شیعوں کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ حضرت علی اور ان کی اولاد خلافت کی زیادہ حقدار ہے اور رسول اللہ صلعم نے اپنے بعد حضرت علی کی خلافت کی وصیت فرمائی تھی۔ شیعوں کے خیال میں چونکہ امام جمہور کے انتخاب سے مقرر نہیں ہوتا بلکہ امامت دین کا ایک رکن ہے اور ان عام مصالح میں سے نہیں ہے جن کو امت کی صوابدید پر چھوڑا جا سکے اس لئے یہ خود نبی کا فریضہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے بعد کے لئے ایک امام کو متعین کر جائے۔ پھر اسی طرح ہر امام اپنے بعد کے امام کو متعین کرتا رہے گا۔ شیعہ اس عقیدہ کے بھی قائل تھے کہ حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ اور تمام اموی اور عباسی خلفاء نے حضرت علیؓ اور ان کے خاندان کا حق غصب کر لیا تھا۔ کیونکہ خلافت صرف حضرت علیؓ اور ان کے خاندان کے لئے مخصوص تھی۔ ان کے عقیدہ کے مطابق چونکہ حضرات شیخین رضی اللہ عنہما وغیرہ نے حضرت علیؓ اور ان کی اولاد کا حق غصب کر لیا تھا اس لئے خلافت کے اصلی حقدار کو اس کا حق دلانے کے لئے کھلم کھلا یا خفیہ طریقہ پر جد و جہد کرتے رہنا واجب ہے۔

اگر تاریخی حقائق پر نظر ڈالی جائے تو یہ بات واضح طور پر سامنے آجاتی ہے کہ نبی کریم صلعم نے اپنے بعد کسی کو خلیفہ مقرر کرنے کی کوئی وصیت نہیں فرمائی تھی بلکہ خلیفہ کے انتخاب کے مسئلہ کو جمہور اُمت کے لئے چھوڑ دیا تھا۔ تاکہ وہ جس شخص کو بھی مناسب سمجھیں خلیفہ چن لیں۔ رسول اللہ صلعم جو کچھ چاہتے تھے وہ یہ تھا کہ ان کے بعد دین مبین کی حفاظت ہوتی رہے۔ اور ان تعلیمات کو پیش نظر

رکھا جائے جسے وہ لیکر دنیا میں آئے تھے۔

حضورؐ کی وفات کے بعد خلیفہ کے انتخاب کے سلسلہ میں ایک گروہ نے یہ بنیادی اصول یوں طے کر دیا کہ خلیفہ قریش میں سے ہونا چاہئے۔ کیونکہ قریش عرب میں سب سے باعزت اور بااثر قبیلہ تھا۔ دوسرے گروہ کا خیال تھا کہ خلافت کو قریش میں محصور کرنے کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ یہ عام مسلمانوں کا حق ہونا چاہیئے۔ جمہور ملت جس کو خلیفہ منتخب کر دے اس کی اطاعت سب پر فرض ہونی چاہیئے چاہے وہ خلیفہ حبشی ہی کیوں نہ ہو۔ موخر الذکر رائے خوارج کی تھی۔

## شیعیت کے عناصر

جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں شیعیت کی ابتدا صحابہ کے اس فرقہ سے ہوئی جو حضرت علیؓ کے ساتھ محبت اور خلوص رکھتے تھے۔ وہ حضرت علیؓ کو ان کی صفات کی وجہ سے خلافت کا زیادہ اہل اور حقدار سمجھتے تھے۔ ان صحابہ میں سلمان فارسیؓ ابو ذر غفاریؓ اور مقداد بن الاسود وغیرہ کے اسماء قابل ذکر ہیں۔

جیسا کہ ہر جماعت کا قاعدہ ہے ابتداً اس میں کچھ لوگ تو واقعی خلوص کے ساتھ مگر زیادہ تر لوگ اپنی کسی غرض یا منفعت حاصل کرنے کے لئے شریک ہوا کرتے ہیں بالکل اسی طرح شیعوں کی جماعت کا بھی حال تھا کہ اس میں ایک گروہ تو واقعی مخلص تھا جو کھلے دل سے حضرت علیؓ اور ان کی اولاد کو خلافت کا حقدار سمجھتا تھا۔ مگر دوسرا گروہ وہ تھا جو اموی اور عباسی حکومتوں سے خوش نہیں تھا۔ قبائل عرب کا وہ طبقہ بھی شیعوں کے ساتھ مل گیا جو قدیم سے بنو امیہ سے تعصب رکھتا تھا۔ اسی طرح غلاموں کا ایک گروہ اس بنا پر شیعوں کی جماعت میں شامل ہو گیا کہ اموی حکام ان کے ساتھ عربوں جیسا برتاؤ نہیں کرتے تھے۔

شیعوں کی جماعت میں سب سے زیادہ ایران کے لوگ شریک ہوئے۔ ان کو بنو امیہ سے یہ شکایت تھی کہ وہ ان کے ساتھ عربوں کے مساوی برتاؤ نہیں کرتے تھے بلکہ ان کو عربوں سے فروتر سمجھتے تھے۔ ان کے علاوہ شیعوں میں ایک ایسا طبقہ بھی شامل ہو گیا جو اسلام کا بدترین دشمن تھا۔ یہ اسلام سے انتقام لینا چاہتا تھا۔ انھوں نے شیعیت کا لبادہ اوڑھ کر سازشوں، ریشہ دوانیوں اور فتنہ انگیزیوں سے اسلام کو ناقابل تلافی نقصانات پہنچائے۔

اس جماعت میں یوں تو بہت سے فرقے ہوئے ہیں مگر ہم یہاں ان میں سے امامیہ کے دو مشہور فرقوں اثنا عشریہ اور اسماعیلیہ کے مختصر حالات وعقائد سے گفتگو کریں گے۔

## امامیہ

ان کا نام امامیہ اس لئے رکھا گیا کہ ان کی تمام مذہبی سرگرمیوں اور عقائد کا نقطۂ ماسکہ "امام" (خلیفہ) ہے۔ ان کی رائے میں نبی اکرم صلعم کے بعد خلافت حضرت علیؓ کا حق ہے۔ نہ صرف اہلبیت اور صلاحیت کی وجہ سے بلکہ رسولؐ کی نص صریح کے مطابق بھی وہ ایک متعین امام تھے۔ پھر ان کے بعد امامت" (یا خلافت) انہی کی فاطمی اولاد میں یکے بعد دیگرے منتقل ہوتی رہے گی۔ اس عقیدہ کی وجہ سے ان کے خیال میں حضرت ابو بکر اور حضرت عمر و عثمان رضی اللہ عنہم ظالم اور غاصب ہیں اس لئے ان سے تبرا واجب ہے۔

امامیہ کے دو فرقے ہیں اثنا عشریہ اور اسماعیلیہ۔ اسماعیلیہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ امام سادسؒ جعفر صادقؒ کے بیٹوں میں سے

**اسماعیلیہ** امامت موسیٰ کاظمؑ کی طرف منتقل نہیں ہوئی جیسا کہ اثنا عشریہ کا خیال ہے بلکہ ان کے بڑے بیٹے اسمٰعیل امام ہوئے اسماعیلیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ جب تک امام کے پاس قوت و شوکت نہ ہو وہ مستور رہتا ہے اور صرف اُس کے دعاۃ تبلیغ کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ یہ جماعت مستور رہی اور خفیہ طور پر کام کرتی رہی تا آنکہ عبداللہ المہدی نے قوت حاصل کر لی اور ۲۹۰ھ میں اس نے افریقہ میں فاطمی سلطنت کی بنیاد رکھ دی۔ اس جماعت کو باطنی بھی کہتے ہیں اسماعیلی فرقہ کے لوگ اس وقت تک دنیا کے مختلف علاقوں خصوصاً ہندوستان اور پاکستان میں کافی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔

**اثنا عشریہ** اثنا عشریہ کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ وہ حسب ذیل بارہ اماموں کی خلافت کے قائل ہیں جن کا سلسلہ حضرت علیؓ سے شروع ہو کر امام غائب تک ختم ہو جاتا ہے۔

(۱) حضرت علی ابن طالبؓ
(۲) حضرت امام حسنؓ متوفی ۵۰ھ
(۳) حضرت امام حسینؓ (۶۱ھ)
(۴) حضرت علی زین العابدینؒ متوفی ۹۴ھ
(۵) امام ابو جعفر محمد باقرؒ متوفی ۱۱۳ھ
(۶) امام ابو عبداللہ جعفر صادقؒ متوفی ۱۴۸ھ
(۷) امام موسیٰ کاظمؒ متوفی ۱۸۳ھ
(۸) امام ابوالحسن علی رضاؒ متوفی ۲۰۳ھ
(۹) امام ابو جعفر محمد جوادؒ متوفی ۲۲۰ھ
(۱۰) امام علی ہادیؒ متوفی ۲۵۴ھ
(۱۱) امام ابو محمد حسن (یا) عسکریؒ متوفی ۲۶۰ھ
(۱۲) امام محمد (مہدی منتظر) ۲۶۵ھ میں غائب ہوئے۔

**امامت** شیعوں کے فروعی عقائد کا مرکزی نقطہ "امام" ہے امام کی جانشین ان کے ہاں کیا ہوتی ہے اس کو سمجھنے کے لئے شیعوں کے عقائد کو تنقیدی طور پر سمجھ لینے کی ضرورت ہے۔ امام کے متعلق شیعوں کے مندرجہ ذیل عقائد ہیں جو ان کی مشہور کتاب اصول کافی مرتبہ محمد بن یعقوب کلینی سے نقل کئے جا رہے ہیں۔ کلینی کی حیثیت شیعوں کے نزدیک وہی ہے جو اہل سنت کے ہاں امام بخاریؒ کی ہے۔

رسول اور امام میں یہ فرق ہے کہ رسول کے پاس جبریل امین وحی لے کر آتے ہیں تو وہ انہیں دیکھتے ہیں اور ان سے بات چیت کرتے ہیں۔ لیکن امام کے پاس بھی فرشتے وحی لے کر آتے ہیں وہ ان سے باتیں کرتا ہے۔ مگر انہیں دیکھ نہیں سکتا۔

ابو حمزہ سے مروی ہے کہ امام جعفرؒ نے فرمایا کہ اللہ کی اطاعت وہی کرتا ہے جو اس کی معرفت رکھتا ہے اور جو معرفت نہیں رکھتا وہ یونہی گمراہی سے اس کا پرستار بنا ہوا ہے۔ میں نے پوچھا کہ گمراہی سے آپ کی مراد کیا ہے: انھوں نے جواب دیا کہ اللہ عزوجل کی تصدیق حضرت علیؑ کی موالات اور ان کی پیروی۔ ائمہ ہدیٰ کی پیروی اور اُن کے دشمنوں سے اللہ کے سامنے برأت ان چیزوں کا نام ہے اللہ کی معرفت۔

امام ابو جعفرؒ نے فرمایا کہ ہم علم الٰہی کے خزانہ دار ہیں اور وحی الٰہی کے ترجمان۔ جو لوگ زمین کے اوپر اور آسمان کے نیچے ہیں ان سب پر ہم اللہ کی حجت ہیں۔

امام گناہوں سے معصوم اور عیبوں سے بری ہوتا ہے۔ لوگوں نے سخت غلطی کی اور جھوٹ گھڑا کہ جان بوجھ کر اہل بیت کو چھوڑا اور اللہ و رسول کے انتخاب سے منہ موڑا۔

امام ابو جعفرؒ نے فرمایا کہ ہم شجر نبوت اور رحمت کا گھر ہیں۔ اور علم کا معدن، رسالت کا مقام اور ملائکہ کی آمد و رفت کا موقع ہیں۔ اللہ کے بندوں کے پاس ہم اللہ کی امانت ہیں۔ ہم اس کے حرم اکبر ہیں اور ہم اس کا ذمہ دار عہد ہیں۔ جس نے ہمارا عہد پورا کیا اس نے اللہ کا عہد پورا کیا اور جس نے ہمارا عہد توڑا اس نے اللہ کا عہد توڑا۔

ائمہ کے پاس وہ ساری کتابیں ہیں جو اللہ کی طرف سے نازل ہوئیں اور وہ ان سب کو باوجود زبانوں کے اختلاف کے سمجھتے ہیں پھر اللہ نے ائمہ کو اس کتاب کا وارث بنایا جس میں ہر شئے کی تصریح ہے۔ مکمل قرآن سوائے ائمہ کے کسی کے پاس نہیں ہے اور وہی اس کا پورا علم رکھتے ہیں۔ جو شخص یہ دعویٰ کرے کہ اس نے پورا قرآن جمع کر لیا ہے وہ جھوٹا ہے۔ کسی نے اس کو جس طرح پر وہ نازل ہوا نہ جمع کیا نہ حفظ کیا سوائے علی ابن ابی طالبؓ اور ان ائمہ کے جو ان کے بعد ہیں۔ ائمہ کے پاس اسم اعظم ہے اور وہ جفر بھی رکھتے ہیں جو چمڑے کا ایک تھیلا ہے جس میں انبیاء کرام و اولیاء عظام نیز گذشتہ انبیاء و علماء بنی اسرائیل کے تمام علوم ہیں۔ ان کے پاس مصحف فاطمہ ہے اور اس میں تمہارے قرآن کا ایک حرف بھی نہیں ہے۔

ائمہ جب کسی شے کا علم چاہتے ہیں تو اللہ ان کو بتلا دیتا ہے وہ جانتے ہیں کہ کب مریں گے اور جب مرتے ہیں تو اپنے اختیار سے مرتے ہیں۔

جو کچھ ہوا اور ہوگا ائمہ سب کا علم رکھتے ہیں اور ان کے سامنے کوئی چیز مخفی نہیں رہتی۔ اللہ نے اپنے رسول کو کوئی علم نہیں سکھلایا مگر یہ کہ ان کو حکم دیا کہ امیر المؤمنین علیؓ کو سکھلا دیں۔ اس لئے وہ علم میں نبی کے شریک تھے۔ پھر یہ تمام علوم ائمہ کو ملتے۔

اللہ نے ائمہ کی اطاعت کا حکم دیا ہے اور ان کی نافرمانی سے منع کیا ہے۔ وہ بمنزلہ رسولوں کے ہیں بجز اس کے کہ نبی نہیں ہیں۔

اللہ و رسول نے ہر ایک امام کی یکے بعد دیگرے تصریح کر دی ہے۔ ہر امام اپنے بعد کے امام کو امامت کے سپرد کر دیتا ہے اور اس کے لئے ایک مخصوص کتاب اور ایک وصیت نامہ چھوڑ جاتا ہے جس میں آدم کی تخلیق سے لیکر فنائے عالم تک جو خبریں پیش آنے والی ہیں سب کا

حل ہے۔ امام کے لئے غیبت بھی ہے جب اس کی غیبت کی خبر سنو تو انکار نہ کرو۔ اور یاد رہیں امام غائب ہیں وہی مہدی ہیں جو روئے زمین کو جب وہ ظلم و ستم سے بھر جائے گی عدل و انصاف سے بھر دیں گے۔

امام اور امامت کے بارے میں یہ مختصر سا خلاصہ پیش کیا گیا ہے جس کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شیعہ اپنے اماموں کی نسبت کیا عقیدہ رکھتے ہیں۔

## شیعہ اور اہلسنت کے عقائد کا اختلاف

اہلسنت اور شیعوں کے عقائد میں بڑا اختلاف ہے۔ امامت یعنی خلافت کے سلسلہ میں اہل سنت کا یہ طریق رہا ہے کہ وہ خلفائے وقت پر تنقید یں کرتے رہے۔ اور ان کے بھلے اور برے اعمال پر آزادانہ تنقید کرتے رہے ہیں۔ مگر شیعہ چونکہ اپنے اماموں کے تقدس بلکہ معصومیت کے قائل ہیں اس لئے ان کے نزدیک امام کے کسی قول و فعل پر تنقید نہیں کی جاسکتی۔ اس کے ہر قول و فعل کی اطاعت فرض ہے۔ ان کے ہاں امام کو روحانی جسمانی اور مذہبی ہر اعتبار سے عوام الناس پر پورا پورا اقتدار حاصل ہوتا ہے امام جس قسم کا بھی حکم دے اس کا ماننا ان کے ہاں واجب کے درجہ میں ہے۔ شیعوں کے ہاں امام کے کسی بھی غلط فعل پر کسی قسم کی بازپرس نہیں ہو سکتی۔ ان کے عقیدہ کے لحاظ سے سارے امام معصوم ہیں۔ ان سے کسی قسم کی غلطی کا امکان ہی نہیں۔

اماموں کی عصمت و صفت اور مہدی منتظر یا امام غائب کے عقیدوں کے علاوہ شیعوں میں تقیہ۔ رجعت اور تبری بھی بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔

### رجعت

اس کا مطلب یہ ہے کہ ظہور مہدی کے بعد حضرت علیؓ، حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ وغیرہ سارے ائمہ دوبارہ اس دنیا میں واپس آئیں گے اور ان کے سامنے ان کے مخالفین حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ حضرت عثمانؓ حضرت معاویہؓ اور یزید وغیرہ لائے جائیں گے۔ جنھیں یہ امام سزائیں دیں گے کیونکہ انھوں نے ان کی خلافت کا حق غصب کر لیا تھا۔ شیعوں کے ایک عالم شریف مرتضیٰ نے لکھا ہے کہ امام مہدی کے زمانہ میں ابوبکرؓ اور عمرؓ کو ایک درخت پر سولی دی جائے گی۔

### تبری

چونکہ اہل تشیع ائمہ اہل بیت کو خلافت کا حقدار سمجھتے ہیں اس لئے وہ خلفائے ثلاثہ خصوصاً حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو ظالم اور غاصب قرار دیتے اور ان سے نفرت اور عداوت رکھتے ہیں اور اس بناء پر تبرا کرتے ہیں۔ کلینی کی حدیث الکافی میں امام جعفر صادقؒ سے مروی ہے کہ تین قسم کے لوگ ہیں جن سے نہ اللہ کلام کرے گا اور نہ ان کے گناہ بخشے گا بلکہ ان کو دردناک عذاب دے گا۔ ایک تو وہ جس نے امامت کا دعویٰ کیا جبکہ وہ اس کا اہل نہیں تھا۔ دوسرے وہ جس نے اللہ کے متعین کئے ہوئے امام کا انکار کیا۔ تیسرے وہ جو یہ خیال رکھتا ہے کہ ابوبکرؓ اور عمرؓ میں اسلام کا شائبہ بھی تھا۔ ان کے عقیدہ کے مطابق سوائے شیعوں کے سارے مسلمان کافر ہیں۔ اور رسول اللہ کے بعد بجز چند صحابہ کے جو حضرت علیؓ کی خلافت کے قائل تھے جملہ صحابہ مرتد ہو گئے تھے۔ انہی وجوہات کی بنا پر وہ خلفائے ثلاثہ نیز ام المؤمنین حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ وغیرہ پر تبری کرتے ہیں اور اس کو قربت و ثواب کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ الکافی میں ان حضرات پر لعنت بھیجنے کے لئے خاص خاص ماثورہ دعائیں موجود ہیں۔

**تقیہ** اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے عقیدہ کو چھپائے رکھنا اور عمل سے اس کے خلاف ظاہر کرنا کہ کسی کو اس کا شیعہ ہونا معلوم نہ ہو سکے۔ امام جعفرؒ سے روایت ہے کہ دین کا ۹/۱۰ حصہ تقیہ میں ہے جو تقیہ کرے وہ بے دین ہے۔ جس میں تقیہ نہیں اس میں ایمان نہیں۔ بعض ائمہ اہل بیت سے مروی ہے کہ جس شیعہ نے تقیہ سے کسی سنی کے پیچھے نماز پڑھ لی اس نے گویا نبی کے پیچھے نماز پڑھی،

بہت سے تاریخی واقعات کو بھی اس جماعت نے تقیہ پر محمول کیا ہے مثلاً حضرت علیؓ کا حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عثمانؓ کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کرنا یا امام حسنؓ کا حضرت امیر معاویہ کے ساتھ صلح کر لینا وغیرہ۔

# خوارج

**خوارج کی ابتداء** جب حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہؓ کے مابین واقعہ صفین پیش آیا اور امیر معاویہؓ نے کتاب اللہ کو حکم بنانے کی پیش کش کی تو حضرت علیؓ کی جماعت میں اختلاف ہو گیا۔ ایک گروہ کا خیال تھا کہ انھیں کتاب اللہ کو حکم بنانے کی دعوت کو قبول کر لینا چاہیئے۔ کیونکہ وہ خدا کا بول بالا کرنے کے لئے ہی جنگ کر رہے ہیں اور اس پیش کش میں اسی کی طرف دعوت دی گئی ہے۔ دوسری جماعت کا خیال تھا کہ ہمیں یہ پیش کش رد کر دینی چاہیئے کیونکہ یہ درحقیقت ایک جنگی چال ہے جس کی آڑ امیر معاویہ اور ان کے ساتھیوں نے اس لئے لی ہے کہ وہ اپنی شکست کو محسوس کرنے لگے ہیں۔ کافی جھگڑے اور تردد کے بعد حضرت علیؓ نے یہ پیش کش قبول کر لی۔ امیر معاویہؓ نے اپنی طرف سے حضرت عمرو بن العاصؓ کو نمایندہ مقرر کیا اور حضرت علیؓ کے اصحاب نے حضرت ابو موسیٰ اشعری کو اپنا نمایندہ منتخب کیا۔ اس وقت حضرت علیؓ کی فوج میں ایک جماعت پیدا ہو گئی جن کی اکثریت قبیلہ بنو تمیم کے لوگوں پر مشتمل تھی۔ ان لوگوں کو اس سے ناگواری ہوئی کہ کتاب اللہ کے بارہ میں دو انسانوں کو حکم تسلیم کر لیا جائے۔ ان کی رائے یہ تھی کہ کسی کو حکم بنانا ہی غلط ہے کیونکہ اس معاملہ میں خدا کا فیصلہ واضح اور ظاہر ہے اور کسی کو اس بارہ میں حکم مان لینا اس بات کا اعتراف ہے کہ جنگ جو فریقین میں سے ہر فریق کو اس میں شک ہے کہ وہ حق پر ہے یا نہیں حالانکہ اس قسم کا شک کرنا کسی صورت میں بھی درست نہیں ہے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ انھوں نے اور ان کے مقتولین و شہداء نے محض اس بنیاد پر جنگ کی ہے کہ بغیر کسی شک و شبہ کے ان کا یہ ایمان تھا کہ حق خود ان کے ساتھ ہے۔ انہی باتوں کو جو ان کے دلوں میں کھٹک رہی تھیں کسی نے اس ایک جملہ میں بیان کر دیا۔ "لَا حُکْمَ اِلَّا لِلّٰہِ" یہ جملہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ان لوگوں میں پھیل گیا جو اس خیال سے وابستگی رکھتے تھے اور چاروں طرف سے اس کی تائید میں آوازیں بلند ہونے لگیں اور بالآخر اس جماعت کا یہی شعار قرار پا گیا۔

**لا حکم الا للّٰہ**

انھوں نے حضرت علیؓ سے مطالبہ کیا کہ وہ اس کا اقرار کریں کہ انھوں نے اس باب میں غلطی کی ہے ۔ یہی نہیں بلکہ اپنے کفر کا اعتراف کریں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور ان تمام شرائط سے رجوع کریں جو وہ حضرت امیر معاویہ سے طے کر چکے تھے ۔ اگر حضرت علیؓ اس مطالبہ کو پورا کر دیں تو یہ لوگ ان کی طرف لوٹ آئیں گے اور ان کے ساتھ ہو کر شریک جنگ ہوں گے ۔ حضرت علی نے اس مطالبہ کو ٹھکرا دیا ۔ حضرت علیؓ کا موقف اس بارہ میں نہایت باریک بینی پر مبنی تھا ۔ وہ ایک ایسی بات سے کیسے رجوع کر لیتے جسے وہ تسلیم کر چکے تھے ۔ دین تو معاہدوں کی پابندی کا حکم دیتا ہے ۔ پھر فوج میں ایک طبقہ ایسا بھی موجود تھا جو اس معاہدہ کے حق میں تھا ۔ اگر وہ اس سے رجوع کر لیتے تو وہ دوسرا طبقہ ان سے الگ ہو جاتا ۔ اور یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ اپنے متعلق کفر کا اعتراف کرتے حالانکہ جس دن سے وہ ایمان لائے تھے اس دن سے لے کر آج تک انھوں نے خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کیا تھا ۔ مگر یہ لوگ بار بار "لَا حُكْمَ اِلَّا لِلّٰهِ" کے نعرے لگاتے تھے کہ حضرت علیؓ جب مسجد میں خطبہ دیتے ۔ اس وقت بھی یہ لوگ "لَا حُكْمَ اِلَّا لِلّٰهِ" کا شور مچاتے اور مسجد کے ہر کونہ سے اس کی تائید میں آوازیں بلند ہونے لگتیں ۔ حتیٰ کہ حضرت علیؓ کو بسا اوقات اپنا خطبہ بند کر دینا پڑتا ۔ ان میں اگر کوئی حضرت علیؓ کو آتا دیکھتا تو بلند آواز سے یہ یہ آیت تلاوت کرنے لگتا ۔

وَلَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ
وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝

اے پیغمبر! خدا نے تمھاری طرف اور تم سے پہلے رسولوں کی طرف یہی وحی بھیجی ہے کہ اگر تم نے شرک کیا تو وہ تمھارے اعمال کو اکارت کر دے گا اور پھر تم خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہو جاؤ گے ۔

اس سے مقصد حضرت علیؓ کی طرف تعریض کرنا ہوتا تھا ۔ اس گروہ کی جمعیت اس وجہ سے اور بھی بڑھتی چلی گئی کہ جن لوگوں کو حکم بنایا گیا تھا انھوں نے کمزوری کا ثبوت دیا اور ان لوگوں کو ناکام و نامراد ہونا پڑا جو اس تحکیم سے کسی نتیجہ کی آس لگائے بیٹھے تھے ۔ چنانچہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ حضرت علیؓ کی فوج کے بعض قرا بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئے ۔ جب ان لوگوں کو حضرت علیؓ کے رجوع کر لینے سے مایوسی ہو گئی تو بالآخر یہ لوگ ایک مکان میں جمع ہوئے اور ان کے خطیب نے یہ خطبہ دیا ۔

اما بعد! ان لوگوں کے لئے یہ ہرگز ہرگز زیبا نہیں جو خدائے رحمٰن پر ایمان رکھتے ہوں اور قرآن کے فیصلوں کی طرف رجوع کرتے ہوں کہ دنیا کے مفادات عاجلہ ان کے نزدیک امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور حق بات کا اعلان کرنے سے کسی طرح راجح قرار پا جائیں ۔ خواہ اس پر کتنے ہی احسانات کیوں نہ کئے جائیں اور خواہ ان کو کتنی ہی ایذائیں کیوں نہ پہنچائی جائیں ۔ جن لوگوں پر اس دنیا میں احسان جتلائے جاتے اور ایذائیں دی جاتی ہیں تو قیامت کے دن ان کا ثواب ان لوگوں کو رضائے الٰہی کی شکل میں حاصل ہوگا اور وہ جنت میں ہمیشہ ہمیشہ آرام اور چین کریں گے ۔

بھائیو! آؤ اس آبادی سے نکل چلیں جس کے باشندے ظالم ہیں اور آؤ کسی پہاڑ کی کھوہ کی طرف چلدیں یا کسی دوسرے

شہر کی طرف ہجرت کر جائیں جہاں جا کر ہم ان بدعات کا انکار کر سکیں۔

## حضرت علیؓ سے خوارج کی علیحدگی

اس کے بعد یہ لوگ کوفہ کے قریب ایک آبادی کی طرف نکل گئے جس کا نام "حرورا" تھا اسی زمانہ سے خوارج کا نام "حروریہ" بھی پڑ گیا جو اس آبادی کی طرف ان کی نسبت کے لحاظ سے تھا۔ ان لوگوں کا ایک تیسرا نام مُحَکِّمَۃٌ بھی تھا یعنی وہ لوگ جو "لَا حُکْمَ اِلَّا لِلّٰہِ" کے قائل تھے۔ خارجیوں کو اکثر انہی ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنے میں سے ایک شخص عبداللہ ابن وہب راسبی کو اپنا امیر مقرر کر لیا ان کو خارجی اس لئے کہتے ہیں کہ انھوں نے حضرت علیؓ کے خلاف خروج کیا تھا۔ اگرچہ بعض لوگوں کا یہ خیال بھی ہے کہ خوارج کا لفظ "خرج فی سبیل اللہ" سے ماخوذ ہے جو اس آیت کریمہ سے لیا گیا ہے۔

وَ مَنْ یَّخْرُجْ مِنْ بَیْتِہٖ مُھَاجِرًا اِلَی اللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖ ثُمَّ یُدْرِکْہُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُہٗ عَلَی اللّٰہِ

جو شخص خدا اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کر کے نکلتا ہے اور پھر اسے موت آجاتی ہے تو اس کا اجر خدا کے ذمہ واجب ہو گیا۔

ان لوگوں کا ایک نام "شُرَاۃٌ" بھی ہے یعنی وہ لوگ جنھوں نے اپنی جانوں کو فروخت کر دیا ہے جو قرآن کریم کی اس آیت سے ماخوذ ہے۔

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْرِیْ نَفْسَہُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰہِ

ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنی جانیں خدا کی رضا کی طلب میں فروخت کر دیتے ہیں۔

حضرت علیؓ نے ان سے ایک فیصلہ کن جنگ کی جو جنگ نہروان کے نام سے مشہور ہے اور ان کو شکست فاش دی جس میں ان کے بہت سے بہادر سردار مارے گئے لیکن اس کے باوجود وہ انھیں اور ان کی فکر کو ملیامیٹ نہ کر سکے۔ اس شکست نے خارجیوں میں حضرت علیؓ کی ناپسندیدگی کو اور بھی شدید کر دیا حتیٰ کہ ان لوگوں نے حضرت علیؓ کو قتل کر ڈالنے کی سازش کی اور آپ کو عبدالرحمٰن بن ملجم نے شہید کر ڈالا۔ عبدالرحمٰن بن ملجم ایک ایسی عورت کا شوہر تھا جس کے قبیلہ کے بہت سے افراد جنگ نہروان میں قتل کر دیئے گئے تھے۔

## خوارج کی قوت و شوکت

رفتہ رفتہ خارجیوں کی قوت و شوکت اس قدر بڑھتی چلی گئی اور وہ اموی دولت کے مقابلہ میں ایسی طاقت بنتے چلے گئے جو حکومت کو دھمکیاں دیتے اور اس سے جنگ کرتے تھے۔ یہ جنگیں اپنی عجیب و غریب شدت و شجاعت کے ساتھ مسلسل لڑی جا رہی تھیں اور بعض مقامات پر تو وہ قریب قریب حکومت کا تختہ الٹ دینے میں کامیاب ہوتے ہوتے رہ گئے۔ مہلب ابن ابی صفرہ پوری جانبازی کے ساتھ سالہائے دراز تک ان سے برسرِ پیکار رہے اور انواع و اقسام کی مصیبتیں اٹھاتے رہے جن کے بیان کرنے کا یہ موقعہ نہیں[1]۔ اشارۃً ہم اتنا بتا سکتے ہیں کہ ان کی دو شاخیں تھیں۔

---

[1] متقدمین نے خوارج کے حالات کے بارہ میں خصوصیت کے ساتھ بہت سی کتابیں لکھی ہیں مثلاً مدائنی وغیرہ لیکن افسوس ہے کہ یہ کتابیں ہم تک نہیں پہنچ سکیں۔ ابن ابی الحدید نے شرح نہج البلاغۃ میں ان کے کچھ واقعات لکھے ہیں جو ان کی کتاب میں دو جگہوں پر تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں اس لئے وہاں ان کا سطور کر لیا جائے

ایک شاخ عراق کے آس پاس کے علاقوں میں پھیلی ہوئی تھی ان لوگوں کا اہم ترین مرکز "بطائح" تھا جو بصرہ سے قریب ہے۔ یہ لوگ کرمان اور ایرانی شہروں پر قابض ہو چکے تھے اور بصرہ پر لگاتار حملے کرتے رہتے تھے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن سے مہلب ابن ابی صفرہ نے جنگ کی تھی۔ ان کے سرداروں میں سے مشہور ترین سردار نافع بن الازرق اور قطری بن الفجاءۃ بیان کیے جاتے ہیں۔

ان کی دوسری شاخ خود جزیرۂ عرب میں تھی جو یمامہ، حضرموت، یمن اور طائف پر قابض تھے۔ ان کے امراء میں سے مشہور ترین طالوت، سجدہ بن عامر، اور ابو فدیک ہیں۔

اموی خلفاء ان دونوں شاخوں پر بڑی ہی طویل و شدید جنگوں کے بعد قابو پا سکے جو اس وقت تک برابر جاری رہیں جب تک دولت امویہ قائم رہی۔

دولت عباسیہ کے دور میں بھی یہ لوگ اسی طرح رہے لیکن اب ان میں وہ قوت باقی نہیں رہی تھی جو اموی دور حکومت میں ان کا طغرائے امتیاز تھی۔ ان کی طاقت کمزور اور جمعیت پراگندہ ہو چکی تھی۔ ان کے قائدین کچھ بلند مرتبہ لوگ نہیں رہے تھے۔

## خارجیوں کی تعلیمات

خارجیوں نے ابتداءً اپنی امور میں کلام کیا جو خلافت سے متعلق تھے۔ چنانچہ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ کی خلافت بالکل صحیح تھی اور ابتدائی سالوں میں حضرت عثمانؓ کی خلافت بھی۔ لیکن جب انھوں نے تغیر و تبدل سے کام لیا اور ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی پیروی نہیں کی اور نئی نئی باتیں کرنی شروع کر دیں تو ان کو معزول کر دینا واجب ہو گیا تھا۔ یہ لوگ حضرت علیؓ کی خلافت کو بھی صحیح تسلیم کرتے تھے۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی کہتے تھے کہ انھوں نے تحکیم کے معاملہ میں غلطی کی اور جب انھوں نے حکم مقرر کر دیئے تو وہ کافر ہو گئے۔ اصحاب جمل یعنی حضرت طلحہؓ حضرت زبیرؓ اور حضرت عائشہؓ کے بارہ میں بھی یہ لوگ طعن کرتے تھے۔ جیسا کہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ کے کافر ہو جانے کا اعلان کرتے تھے۔ ان میں سے کسی آدمی کو گرفتار کر کے عراق کے گورنر زیاد کے سامنے پیش کیا گیا۔ زیاد نے اس سے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے متعلق دریافت کیا تو ان دونوں کے بارہ میں اس نے بڑے اچھے کلمات کہے۔ اس کے بعد زیاد نے حضرت عثمانؓ کے متعلق دریافت کیا تو اس نے کہا کہ میں حضرت عثمانؓ سے محبت کرتا تھا مگر ان حالات میں جو ان کی خلافت میں چھ سال تک گزرے۔ پھر اس کے بعد میں نے ان سے برأت کر دی۔ اس نے ان کے کفر کی شہادت دی اس کے بعد زیاد نے امیر المومنین حضرت علیؓ کے متعلق اس سے سوال کیا تو اس نے کہا کہ میں ان سے اس وقت تک محبت کرتا تھا جب تک انھوں نے حکم نہیں بنائے۔ اس کے بعد میں ان سے اپنی برأت کرتا ہوں اس نے حضرت علیؓ پر بھی کفر کی شہادت دی۔ اس کے بعد زیاد نے حضرت امیر معاویہؓ کے بارہ میں اس کی رائے دریافت کی تو اس نے حضرت امیر معاویہ کو بڑی بڑی گالیاں دیں[1]۔

اس سے نظر آتا ہے کہ ان کا کلام خلفاء اور ان کے اعوان و انصار کے اعمال کی تشریح کے گرد گھومتا تھا، وہ اس کی

[1] شہرستانی صفحہ ۱۶۱ جلد ۱

کھوج لگاتے تھے کہ کون شخص خلیفہ بننے کا مستحق ہے اور کون مستحق نہیں ہے۔ کون شخص مؤمن ہے اور کون مومن نہیں ہے

انھوں نے خلافت کے لئے الگ نظریہ قائم کیا تھا جو یہ تھا کہ خلافت کے لئے واجب ہے کہ مسلمانوں میں سے کسی آزاد مسلمان کو چن لیا جائے اور جب اس کا انتخاب ہو جائے تو پھر یہ صحیح نہیں ہے کہ وہ معزول ہو جائے یا حکم بنائے۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ خلیفہ قریشی ہی ہو۔ قریشی اور غیر قریشی دونوں میں سے خلیفہ کا انتخاب ہو سکتا ہے۔ جب انتخاب مکمل ہو جائے تو وہ مسلمانوں کا رئیس ہو جاتا ہے اس کے لئے واجب ہے کہ وہ مکمل طور پر خدا کے احکام کی پیروی کرے۔ اگر وہ خدا کے احکام کی پیروی نہیں کرتا تو اسے معزول کر دینا واجب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے میں سے جسے چاہا منتخب کر لیا اور اپنا امیر بنا لیا۔ چنانچہ عبداللہ بن وہب راسبی کو وہ لوگ امیرالمومنین کہتے تھے حالانکہ وہ قریشی نہیں تھا بلکہ قبیلہ راسب کا فرد تھا جو قبیلہ ازد کی ایک شاخ ہے۔ ایسے ہی اس کے بعد ان کے دوسرے امراء بھی ایسے ہی ہوتے رہے۔ اس طرح ان لوگوں نے شیعوں کے نظریہ کی مخالفت کی جو اس کے قائل ہیں کہ خلافت نبی اکرم صلعم کے اہل بیت میں منحصر ہے یعنی حضرت علیؓ اور ان کی اولاد میں۔ ایسے ہی ان لوگوں نے اہل سنت کے نظریہ کی بھی مخالفت کی جو اس کے قائل ہیں کہ خلافت قریش ہی میں ہونی چاہیئے۔ یہی وہ نظریہ تھا جس نے ان کو خلفائے بنو امیہ کے خلاف خروج کی دعوت دی اور پھر خلفائے بنو عباس کے خلاف بھی۔ کیونکہ ان کا عقیدہ تھا کہ یہ لوگ ظالم ہیں۔ عادل نہیں ہیں اور ان کی نظر میں خلافت کی جو شرائط ہونی چاہئیں وہ ان پر مطلقاً منطبق نہیں ہوتیں۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ خوارج اپنی ابتداء میں محض ایک سیاسی رنگ کی تحریک تھی لیکن عبدالملک بن مروان کے زمانہ میں ہمیں نظر آتا ہے کہ انھوں نے اپنی سیاسی تعلیمات کو لاہوتی ابحاث کے ساتھ خلط ملط کر دیا۔ ان میں سے جس فرقہ نے اس میں زیادہ اثر ڈالا ہے وہ "فرقہ ازارقہ" ہے جو نافع ابن الازرق کے متبعین تھے۔ ان میں سے جو اہم ترین عقیدہ خوارج نے ثابت کیا ہے وہ یہ ہے کہ دین کے اوامر پر عمل ـــ نماز، روزہ، صدق، عدل وغیرہ ـــ ایمان کا جز ہیں اور تنہا اعتقاد کا نام ایمان نہیں ہے۔ لہٰذا جو شخص یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ خدا کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے اور محمد اللہ کے رسول ہیں (لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ) اور اس کے بعد دین کے فرائض پر عمل نہیں کرتا اور کبائر کا ارتکاب کرتا ہے تو وہ کافر ہے۔

## خوارج کی بدتنظیمی

خوارج نہ تو ایک وحدت تھے اور نہ ہی ایک منظم جماعت تھے۔ ان میں عربی اور بدوی طبیعت کا رنگ علانیہ جھلکتا تھا۔ ان میں آپس میں بہت جلد اختلاف ہو جاتا تھا۔ مختلف جتھوں کے نیچے جمع ہو جاتے تھے اور آپس ہی میں ایک دوسرے کو قتل کرنے لگتے تھے۔ اگر کہیں یہ واقعی طور پر متحد اور منظم ہو جاتے تو حکومت امویہ کے خلاف ایک ایسی بے پناہ قوت بن سکتے تھے جو انتہائی خطرہ کا باعث بن جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ان کی وہ تعلیمات جو ان کے تمام فرقوں میں قدر مشترک ہوں بیان نہیں کر سکتے۔ صرف وہی دونوں نظریئے بیان کئے جا سکتے ہیں جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ یعنی خلافت کا نظریہ اور یہ نظریہ کہ اعمال ایمان کا جز ہوتے ہیں۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ تھوڑی سی چشم پوشی اور تسامح کے بغیر شاید ان دونوں نظریوں کے متعلق بھی یہ کہنا صحیح نہ ہو کہ یہ تمام خارجیوں کے نظریئے تھے۔ کیونکہ ان میں ایسے لوگ بھی ملتے ہیں جو اس کے قائل ہیں کہ امت کو

امام کی ضرورت ہی نہیں۔ لوگوں کے ذمہ صرف اتنا ہی واجب ہے کہ وہ کتاب اللہ پر عمل کرتے رہیں۔ بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ ان میں سے بعض لوگ اپنے مشہور جملہ "لَا حُكْمَ إِلَّا لِلّٰهِ" کا مفہوم یہی سمجھتے تھے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ جب حضرت علیؓ نے ان لوگوں کو لَا حُكْمَ إِلَّا لِلّٰهِ کہتے ہوئے سنا تو انھوں نے فرمایا کہ "یہ کلمہ تو حق ہے مگر اس سے جو کچھ ان کا مقصد ہے وہ باطل ہے۔ یہ صحیح ہے کہ حکومت خدا کے سوا کسی اور کی نہیں ہو سکتی۔ فیصلہ اس کے سوا کسی اور کا نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ لوگ تو ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ امارت بھی خدا کے سوا کسی اور کی نہیں ہو سکتی۔ حالانکہ لوگوں کے لئے ایک امیر کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ خواہ وہ امیر نیک ہو یا بد تاکہ مومن اس کی امارت میں کام کر سکے اور کافر اس کی امارت سے متمتع ہو سکے اور خدا اس کی امارت ہی میں اسے موت دے۔ ایک امیر کی اس لئے بھی ضرورت ہوتی ہے کہ اس کے حکم کے ماتحت مال غنیمت جمع کیا جا سکے۔ اس کے جھنڈے کے نیچے جنگ کی جا سکے۔ قوی سے ضعیف کا انتقام لیا جا سکے۔ تاکہ نیک آدمی راحت کی زندگی بسر کر سکیں اور فساق و فجار سے محفوظ و مامون رہ سکیں۔

ابن ابی الحدید نے کہا ہے کہ خوارج شروع شروع میں یہی کچھ کہتے تھے اور ان کا یہی خیال تھا کہ امام کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے لیکن بعد میں انھوں نے اپنے اس قول سے رجوع کر لیا تھا۔ چنانچہ اس رجوع کے بعد ہی انھوں نے عبد اللہ بن وہب راسبی کو اپنا امیر بنایا تھا۔[1]

## خوارج کے فرقے

بہر حال جمہور خوارج مذکورہ بالا دونوں نظریوں پر متفق ہو جانے کے بعد بھی بہت سے فرقوں میں بٹ گئے جن کی تعداد بیس تک پہنچتی ہے۔ ہر فرقہ دوسرے فرقہ سے بعض تعلیمات میں اختلاف رکھتا ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ ان فرقوں کی تفصیل یہاں نہیں دی جا سکتی البتہ ہم اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ ان فرقوں میں سے مشہور ترین فرقہ

## ازارقہ

"ازارقہ" کا تھا جو نافع بن الازرق کے متبع تھے۔ یہ ان کا بہت بڑا فقیہہ اور عالم تھا۔ اس نے اپنی جماعت کے سوا باقی تمام مسلمانوں کو کافر قرار دیا اور کہا کہ اس کے مؤمن ساتھیوں کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ کسی غیر خارجی کے ساتھ نماز پڑھے اور نہ ہی یہ جائز ہے کہ غیر خارجیوں کے ذبیحے کھائے یا ان میں شادی بیاہ کرے۔ ایسے ہی ایک خارجی مؤمن غیر خارجی مؤمن کا وارث نہیں ہو سکتا۔ غیر خارجی لوگ کفار عرب اور بت پرستوں کی طرح ہیں جن سے بجز اسلام یا تلوار کے کوئی دوسری چیز قبول نہیں کی جا سکتی۔ ان کا ملک دار الحرب ہے اور ان کی عورتوں اور بچوں تک کو قتل کر دینا جائز ہے۔ تقیہ کرنا حلال نہیں ہے کیونکہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

إِذَا فَرِيقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ أَوْ أَشَدَّ خَشْيَةً

ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو انسانوں سے اس طرح ڈرتے ہیں جیسے کوئی خدا سے ڈرتا ہو بلکہ اس سے بھی زیادہ

مخالفین کے ساتھ عہد شکنی کرنے کو اس نے ناجائز قرار دیا ہے اور ان لوگوں کو جو باوجود قدرت کے جنگ کرنے سے جی چراتے ہیں اس نے کافر قرار دیا ہے۔ خواہ یہ جی چرانے والے لوگ خارجی مذہب کے پیروکار ہی کیوں نہ ہوں۔

---

[1] اس کے لئے شہرستانی کی "الملل والنحل" اور اشعری کی "المقالات الاسلامیہ" اور بغدادی کی "الفرق بین الفرق" ملاحظہ فرمائیں۔

**نجدات**

ان کا ایک دوسرا فرقہ "نجدات" کہلاتا ہے جو نجدہ بن عامر کے متبعین ہیں - اس فرقہ کی اہم ترین تعلیمات میں سے ایک چیز یہ ہے جس میں یہ فرقہ منفرد ہے کہ خطاکار آدمی کوشش کر لینے کے بعد معذور ہے۔ نیز یہ کہ دین دو چیزوں کا نام ہے۔ خدا کی معرفت اور رسول کی معرفت - ان کے علاوہ دیگر امور میں لوگ اپنی جہالت کی وجہ سے معذور ہیں تا آنکہ ان پر کوئی دلیل واضح نہ ہو جائے - ایسے ہی جس شخص کا اجتہاد کسی حرام چیز کو حلال کر دینے پر یا حلال چیز کو حرام کر دینے پر منتج ہو تو وہ بھی معذور ہے ان لوگوں نے جھوٹ بولنے کے جرم کو زنا کرنے اور شراب پینے کے جرم سے زیادہ بڑا جرم قرار دیا ہے۔

نافع بن الازرق اور نجدہ بن العامر کے مابین انہی مسائل کے متعلق طویل مباحثے بھی ہوئے ہیں - جن کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہ ہوگا[1] - ان کے مشہور فرقوں میں سے تیسرا مشہور فرقہ "رَبَاضیہ" کہلاتا ہے جو اپنے رئیس عبداللہ ابن ربَاض تمیمی کی طرف منسوب ہے - اس کے متبعین بلاد مغرب وغیرہ میں پائے جاتے ہیں جو آج تک موجود ہیں - ان لوگوں نے اپنے

**رباضیہ**

مخالفین کے خلاف حکم لگانے میں ازارقہ کی طرح غلو سے کام نہیں لیا بلکہ یہ کہتے ہیں کہ غیر خارجیوں میں شادی بیاہ کرنا جائز ہے اور خارجی مسلمان غیر خارجی مسلمان کا وارث ہو سکتا ہے - ان لوگوں کا رجحان صلح جویانہ ہے - ان لوگوں کا یہ بھی قول ہے کہ غیر خوارج پر دھوکہ سے چھپ کر حملہ کر دینا اور ان لوگوں کو گرفتار کر دینا جائز نہیں ہے - نیز غیر خارجیوں سے جنگ کرنا اس وقت تک جائز نہیں ہے جب تک ان کو دعوت نہ دیدی جائے اور ان پر حجت قائم نہ کر دی جائے - عبداللہ ابن ربَاض کا ظہور پہلی صدی ہجری کے نصف ثانی میں ہوا تھا - اس کے اکثر متبعین اکثر حالات میں خلفائے وقت کے ساتھ مصالحت کے ساتھ رہے۔

**صُفریہ**

ان کا ایک چوتھا فرقہ صُفریہ بھی ہے جو زیاد بن الاصفر کے متبعین ہیں - یہ لوگ اپنی تعلیمات میں ازارقہ سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہیں - یہ چاروں فرقے ازارقہ، نجدات، ربَاضیہ اور صفریہ، ہی خوارج کے مشہور ترین فرقے ہیں جن کا تذکرہ اکثر کتابوں میں آتا رہتا ہے۔

خوارج کہتے ہیں کہ جن لوگوں نے ان کے مذہب سے وابستگی قبول کر لی تھی ان میں سے عکرمہ مولیٰ ابن عباسؓ اور مشہور صحابی حضرت انس بن مالکؓ قابل ذکر ہیں جسن بصریؒ کو خارجیوں کی اس رائے سے اتفاق تھا کہ حضرت علیؓ نے تحکیم کے معاملہ میں غلطی کی تھی لیکن وہ ان کے مذہب سے وابستہ نہیں ہوئے - حسن بصریؒ جب اپنی مجلس میں اچھی طرح جم کر بیٹھ جاتے تھے تو حضرت عثمانؓ کا تذکرہ فرماتے اور تین مرتبہ ان پر رحمت بھیجنے کی دعا مانگتے" اور پھر قاتلین حضرت عثمانؓ پر تین مرتبہ لعنت بھیجتے اور کہتے کہ اگر ہم ان پر لعنت نہ بھیجیں گے تو خود ہم پر لعنت بھیجی جائے گی - پھر حضرت علیؓ کا تذکرہ فرماتے اور کہتے کہ فتح و ظفر ہمیشہ امیرالمومنین حضرت علیؓ کے ہمرکاب رہی حتیٰ کہ انھوں نے حکم بنانا منظور فرما لیا - تم حَکَم کس لئے بناتے ہو؟ حق تو تمھارے ساتھ ہے - تم آگے،

[1] مبرد کی الکامل جلد دوم اور ابن ابی الحدید کی جلد اول ملاحظہ کیجئے

قدم کیوں نہیں بڑھاتے ؟ تم تو حق پر ہو۔

## خوارج کے خلاف وضعِ حدیث کی گرم بازاری

مہلب بن ابی صفرہ نے خارجیوں کے خلاف جن ہتھیاروں سے جنگ کی تھی ان میں سے ایک ہتھیار یہ بھی تھا کہ ان کے خلاف زور شور سے حدیثیں گھڑی گئیں۔ وہ خود بھی ان کے خلاف حدیثیں گھڑا کرتا تھا۔ تاکہ اس طرح اپنی قوم کی ہمت ان حدیثوں سے بلند کرسکے۔ اور خارجیوں کی قوت وشوکت کو ضعیف اور کمزور بنا سکے۔ وہ کہا کرتا تھا کہ جنگ تو محض ایک فریب اور چال بازی کا نام ہے۔ ازد کا قبیلہ جب مہلب بن ابی صفرہ کو باہر نکلتا ہوا دیکھتا تو برملا کہہ دیا کرتا تھا کہ اب کوئی تازہ جھوٹ بولے گا۔ چنانچہ کسی ازدی شاعر کا یہ شعر مہلب کے بارہ میں بہت مشہور ہے

یقیناً تو ایک بہادر نوجوان ہے۔ مگر اے کاش تو جو کچھ کہتا ہے اس میں سچائی سے کام لیتا۔

شاید یہ اور اس جیسے دوسرے لوگ ہی تھے جو ان کثیر موضوع احادیث کے ذمہ دار ہیں جو خوارج کی مذمت میں کتب تاریخ وادب کے ایک بڑے حصہ پر حاوی ہیں۔

## خوارج کی بدویت

زیادہ تر جن لوگوں نے خارجی مذہب کو قبول کیا تھا وہ عرب کے بدو تھے۔ ان کے ساتھ کچھ عرب کے موالی بھی مل گئے تھے کیونکہ خلافت کے بارہ میں ان کا جمہوری نظریہ ان لوگوں کو پسند آتا تھا کہ ان کے نظریہ کے مطابق خلیفہ کے لئے یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ قریشی ہی ہو یا عربی ہی ہو۔ خارجی اپنے نقطۂ نظر کے مطابق خلافت کے مسئلہ میں عوامی مسلک کے حامی تھے۔ لیکن اس کے باوجود عجم کے موالی بہت ہی کم ان کے ساتھ شریک ہوسکے کیونکہ خود یہ لوگ ۔ جن کی اکثریت بدوی تھی ۔ اپنی جنس کے لئے علانیہ شدید تعصب رکھتے تھے۔ ابن ابی الحدید کا بیان ہے کہ موالی کو یہ لوگ نہایت حقیر سمجھتے اور ان کی تذلیل کرتے تھے۔

ابن ابی الحدید نے لکھا ہے کہ موالی میں سے ایک آدمی نے کسی خارجی عورت کو شادی کا پیغام دیدیا تو خارجیوں نے اس عورت سے کہا کہ تو نے تو ہمیں کہیں کا بھی نہ رکھا۔ ساری قوم میں ذلیل ورسوا کردیا۔ اگر ان لوگوں میں عربوں کی یہ خشک عصبیت نہ ہوتی تو موالی میں سے بہت سے لوگ ان کے پیچھے ہو لیتے۔

## خوارج کی خصوصیات

تاریخ میں خارجیت کا مطالعہ کرنے والے شخص کو واضح طور پر ان کی چند خصوصیات نظر آتی ہیں جن میں سے اہم ترین خصوصیات یہ ہیں۔

(۱) عبادت میں زیادہ انہماک۔ شہرستانی نے ان کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ لوگ روزہ اور نماز کے سختی سے پابند ہوتے ہیں۔ مبرد ان کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ان کے تمام فرقے نہایت سچے اور صادق ہوتے ہیں۔ جھوٹے آدمی سے اپنی برأت کرتے نیز ظاہری معصیت والوں سے بھی ان میں سے کسی خارجی کو زیاد نے قتل کرایا، پھر اس کے غلام سے بلا کر پوچھا کہ ذرا اس کے اوصاف بیان کرو۔ تو غلام نے بتایا کہ میں اس کے لئے کبھی دن کے وقت کھانا لے کر نہیں گیا کیونکہ وہ ہمیشہ روزے رکھتا تھا اور نہ ہی رات کو

ہیں نے کبھی اس کے لئے بستر بچھایا ہے کیونکہ وہ رات بھر عبادت الٰہی میں مصروف رہتا تھا۔

حضرت علی نے جب حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کو اہل نہروان کے پاس بھیجا (جو خارجی تھے) تو حضرت ابن عباسؓ نے وہاں جاکر دیکھا کہ ان کی پیشانیاں طویل طویل سجدوں کی وجہ سے زخمی ہو چکی تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں اونٹوں کے گھٹنوں کی طرح گٹے پڑے ہوئے تھے۔ اس بارہ میں سب سے بہتر قول

## خوارج کی بسالت و عبادت

ابو حمزہ خارجی کا ہے جو اس نے اپنے ساتھیوں کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا۔ وہ لوگ نوجوان ہیں مگر اپنی جوانی میں شب بیداریاں کرنے والے۔ برائی سے حیا اتنی کہ ان کی آنکھیں جھکی ہوئی، باطل سے ان کے پاؤں بوجھل رہتے ہیں۔ عبادت میں ہر دم مشغول رہنے والے اور شب بیداری میں شیر۔ خدا آدھی رات کے وقت جب بھی ان کو دیکھتا ہے تو قرآن کے اجزا کی تلاوت کرتے ہوئے اور ان کے پہلوؤں کو بستروں سے علیحدہ دیکھتا ہے۔ جب ان میں سے کوئی آدمی کسی ایسی آیت کی تلاوت کرتا ہے جس میں جنت کا تذکرہ ہوتا ہے تو غلبۂ اشتیاق سے آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں اور جب کسی ایسی آیت سے گذرتا ہے جس میں جہنم کی آگ کا تذکرہ ہوتا ہے تو وہ یوں بلک بلک کر روتا ہے کہ شاید جہنم کی آگ کی گونج اس کے کانوں میں آرہی ہے۔ مسلسل جفاکشی کی زندگی بسر کرنے والے ان کے دن کی جفاکشی، رات کی جفاکشی سے پیوست ہو جاتی ہے۔ زمین نے اُن کے گھٹنوں، ہاتھوں، ناکوں اور پیشانیوں کو کثرتِ سجود کی وجہ سے کھالیا ہے۔ خدا کے حقوق و واجبات کے مقابلہ میں وہ اپنی عبادتوں اور ریاضتوں کو ہیچ سمجھتے ہیں اور جب میدانِ جنگ میں وہ دیکھتے ہیں کہ ہر طرف سے تیروں کی بارش ہو رہی ہے، سامنے نیزے تنے ہوئے ہیں، تلواریں سونت لی گئی ہیں اور مقابل فوج موت کی کڑک اور گرج کے ساتھ جھکتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے تو وہ خدا کی وعید کے مقابلہ میں مقابل فوج کی دھمکیوں کا مضحکہ اڑاتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ ان میں کا ہر نوجوان آگے بڑھتا ہے حتیٰ کہ اس کے پاؤں اپنے گھوڑے کی گردن پر ادھر سے اُدھر ہو جاتے ہیں اور اپنے چہرہ کے محاسن پر خون کا خضاب لگا کر زمین پر گر پڑتا ہے۔ زمین کے درندے اس کی طرف لپکتے ہیں۔ آسمان کے پرندے اس پر منڈلانے لگتے ہیں۔ کتنی انسانی آنکھیں ہیں جو ان پرندوں کی چونچوں میں لٹکتی نظر آئیں گی جو طویل عرصہ تک خدا کے خوف سے راتوں کو روتی رہی ہیں۔ کتنی ہتھیلیاں اپنے پہنچوں سے اُتر گئی ہوں گی جن پر طویل زمانہ تک وہ راتوں کو سہارا لے کر سجدہ کرتے رہے ہوں گے۔

## خارجیوں کا غلو

ان کی نگاہوں میں غلو تھا۔ حتیٰ کہ وہ کسی بڑے گناہ (کبیرہ) کا ارتکاب کرنے والے کو اور بعض اوقات چھوٹے چھوٹے گناہ (صغیرہ) کا ارتکاب کرنے والے کو بھی کافر شمار کرنے لگتے تھے۔ انھوں نے اپنے اماموں کے خلاف معمولی معمولی غلطیوں اور لغزشوں کی وجہ سے خروج کیا ان میں سے زیادہ تر لوگ غیر خارجی مسلمانوں کے خلاف بڑا تشدد برتتے تھے اور ان کو کافر سمجھتے تھے بلکہ ان کے ساتھ کافروں سے بھی زیادہ بُرا معاملہ کرتے تھے۔ لوگوں نے نقل کیا ہے کہ واصل ابن عطاء (رئیس معتزلہ) ایک مرتبہ کسی طرح ان کے ہاتھوں میں پڑ گئے تو انھیں یہ کہنا پڑا کہ وہ ایک پناہ گزیں مشرک ہیں کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ان کے ہاتھوں سے نجات پانے کی صرف یہی ایک صورت ہو سکتی ہے۔ اس کے برعکس اگر وہ بتا دیتے کہ

وہ مسلمان ہیں اور غیر خارجی ہیں تو ان کے بچنے کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی تھی۔ چنانچہ ان کا خیال صحیح ثابت ہوا۔ جو مسلمان ان کے خلاف ہوتے تھے ان کے بارہ میں ان کا تشدد ضرب المثل ہو چکا تھا۔ حتیٰ کہ عورتوں، دودھ پیتے بچوں، بوڑھے پھونس آدمیوں تک پر رحم نہیں کرتے تھے۔ وہ اپنے مخالفین سے یہ اقرار کرا کر بھی مطمئن نہیں ہوتے تھے کہ حضرت علیؓ نے تحکیم کے معاملہ میں غلطی کی تھی اور حضرت عثمانؓ نے اپنے آخری عہد میں کچھ نئی نئی باتیں نکالنے میں غلطی کا ارتکاب کیا تھا۔ بلکہ ان کو صاف اور واضح الفاظ میں یہ اقرار کرنا پڑتا تھا کہ یہ دونوں حضرات کافر ہیں اور ان کے تمام معین و مددگار بھی کافر تھے۔ انھوں نے حضرت عبداللہ ابن الزبیرؓ سے یہ مطالبہ کیا تھا کہ وہ اپنے باپ حضرت زبیر ابن العوامؓ سے اپنی برأت کریں۔ انھوں نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے عدل اور حسن سیرت کو بھی کافی نہیں سمجھا بلکہ ان سے بھی یہ مطالبہ کیا تھا کہ جن جن صحابہ سے خارجی لوگ اپنی برأت کرتے ہیں وہ بھی ان سے برأت کریں اور بنی امیہ کے اپنے اسلاف پر لعنت بھیجیں۔ شاید ان لوگوں کا یہ تشدد اور اپنے مخالفین کی بے تحاشا خوں ریزی ہی سب سے بڑا سبب تھا کہ ان کی تحریک کامیاب نہ ہو سکی۔

**خوارج کا خلوص** یہ لوگ اپنے عقیدہ میں بڑے مخلص تھے حتیٰ کہ اپنے عقائد کی مدافعت میں جان تک کی بازیاں کھیل جاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے نیک اور مرتاض لوگوں نے ان کی طرف شفقت اور مہربانی کی نظر سے دیکھا ہے۔ حضرت علیؓ نے اپنے آخری دنوں میں فرمایا تھا کہ خوارج سے میرے بعد ہرگز جنگ نہ کرنا کیونکہ جو شخص حق کا طلبگار ہو اور غلطی سے حق کو نہ پا سکے وہ ان لوگوں کے برابر نہیں ہو سکتا جو باطل کے طلبگار ہوں اور اسے حاصل کر لیں۔ حضرت علیؓ کا مطلب غالباً یہ تھا کہ خوارج نے حق کو طلب کیا ہے اور جو عقیدہ انھوں نے قائم کر لیا ہے وہ اس کی حمایت کر رہے ہیں۔ اگرچہ ان سے غلطی ہوئی ہے مگر ان کی نیت نیک ہے۔ ان کے برعکس امیر معاویہؓ حق کے طلبگار نہیں ہیں۔ وہ باطل کے طلبگار ہیں اور باطل ہی کی حمایت کر رہے ہیں۔ اور انھوں نے اس باطل کو حاصل بھی کر لیا ہے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے کسی خارجی سے فرمایا تھا کہ "میں خوب جانتا ہوں کہ تمہارا خروج اور بغاوت دنیا یا سامانِ دنیا کی خواہش کے ماتحت نہیں ہے۔ میں بخوبی جانتا ہوں کہ تم لوگ آخرت کے طلبگار ہو اور اسی کے لئے تم نے خروج کیا ہے لیکن تم نے آخرت کا راستہ پانے میں غلطی کی ہے۔

**خوارج کی ایمانی پختگی** ان کی ایمانی پختگی انھیں ابھارتی رہتی تھی کہ وہ اپنے مسلک کے اصول کی طرف علانیہ دعوت دینے کا خاص طور پر خیال رکھیں۔ وہ ہر موقع کو غنیمت شمار کرتے تھے۔ وہ خلفائے بنو امیہ کے پاس بھی اپنے ایلچی بھیجتے تھے اور انھیں دعوت دیتے تھے۔ اس کے لئے کسی قسم کی قربانی دینے میں کبھی کوئی دریغ نہیں کیا۔ ان کی تاریخ بے نظیر شجاعت و بسالت کی ایک مسلسل داستان ہے۔ العقد الفرید کے مصنف کا بیان ہے کہ تمام اسلامی فرقوں میں خوارج سے زیادہ شدید ترین بصیرت کسی دوسرے فرقہ میں نہیں تھی اور نہ ان سے بڑھ کر کوئی اور فرقہ زیادہ جانکاش تھا اور نہ ہی ان سے بڑھ کر کوئی موت کا اتنا والہ و شیدا تھا۔

ان میں ایسے لوگ بھی تھے کہ مخالف نے میدان جنگ میں اس کے نیزہ مارا اور آر پار کر دیا تو وہ اپنے قاتل کے پیچھے یہ کہتے ہوئے دوڑتا تھا وَ عَجِلْتُ اِلَیْكَ رَبِّ لِتَرْضٰی ۔ میرے پروردگار! میں تیری طرف جلد چلا آیا ہوں تاکہ راضی ہو جائے۔

امیر معاویہؓ نے کسی خارجی کے باپ کو اسکے بیٹے کو نصیحت کرنے کے لئے بھیجا کہ وہ امیر معاویہؓ سے جنگ کرنے سے باز آجائے۔ باپ نے بیٹے کو بہت سمجھایا مگر بیٹے نے انکار کر دیا۔ امیر معاویہؓ نے اس کے باپ کو دوبارہ بھیجا۔ اس مرتبہ باپ نے شدت کے ساتھ اصرار کیا اور اس سے کہا بیٹا! میں تیرے سامنے تیرے بیٹے (یعنی اپنے پوتے) کو لے کر آتا ہوں۔ شاید بیٹے کو دیکھ کر تجھے اس پر کچھ ترس آجائے تو بیٹے نے جواب دیا۔ ابا جان! خدا کی قسم مجھے اپنے بیٹے سے زیادہ نیزہ کے اس زخم کا اشتیاق ہے جو آرپار ہو جائے اور میں خدا کی راہ میں تڑپ تڑپ کر جان دے رہا ہوں۔

ایک خارجی سے اگر کوئی شخص اس کا کوڑا چھین لیتا تھا تو وہ اس کوڑے کے لئے بھی لڑنے مرنے کے لئے تیار ہو جاتا تھا کسی نے کہا ہے کہ ایک خارجی کو قتل کر دینا دس غیر خارجیوں کو قتل کر دینے سے کہیں افضل ہے۔

ابن زیاد نے اسلم بن زرعہ کو دو ہزار سپاہیوں کے ساتھ خارجیوں کے ایک فرقہ سے جنگ کرنے کے لئے بھیجا۔ ابو بلال خارجی نے محض اپنے چالیس ساتھیوں کی مدد سے دو ہزار کی اس فوج کو شکست فاش دیدی تو ابن زیاد نے اسلم بن زرعہ سے کہا۔ تیرا ناس ہو جائے تو دو ہزار سپاہیوں کے ساتھ جاتا ہے اور محض چالیس آدمیوں کے حملہ کی تاب نہیں لا سکتا۔ حالت یہ ہو گئی تھی کہ اسلم اگر کہیں بازار میں نکل جاتا تھا یا بچوں کے پاس سے گذر جاتا تھا تو بچے تک صدائیں لگاتے تھے۔

اسلم! دیکھ تیرے پیچھے ابو بلال آرہا ہے۔

## خوارج کی عورتیں اور میدان جنگ

خوارج کی عورتیں بھی جنگوں میں اپنے مردوں کے دوش بدوش شریک جنگ ہوتی تھیں۔ مؤرخین نے بہت سی عورتوں کا ذکر کیا ہے جنھوں نے میدان جنگ میں مردوں کے چھکے چھڑا دیئے تھے۔ ابو الفرج اصفہانی نے "کتاب الاغانی" میں لکھا ہے کہ ایک خارجی عورت قطری ابن الفجاءۃ کے ساتھ تھی جس کا نام ام حکیم تھا۔ یہ عورت نہایت بہادر اور نہایت ہی حسین و جمیل تھی۔ ساتھ دینداری میں بھی بے نظیر تھی۔ بہت سے خارجیوں نے اسے شادی کا پیغام دیا مگر اس نے ہر پیغام رد کر دیا۔ جن لوگوں نے اسے میدانِ جنگ میں دادِ شجاعت دیتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے ان کا بیان ہے کہ وہ لوگوں پر بھرپور وار کرتی تھی۔ جو اس کی زد پر آجاتا تھا بمشکل ہی جانبر ہو سکتا تھا۔ وہ رجز کے طور پر یہ اشعار پڑھا کرتی تھی۔

میرے جسم پر میرا سر ایک ایسا بوجھ ہے جسے اٹھاتے اٹھاتے میں اکتا گئی ہوں۔ میں اس سر میں تیل لگاتے اور دھوتے دھوتے تھک چکی ہوں۔ کیا دنیا میں کوئی بھی ایسا نوجوان نہیں رہا جو میرے جسم سے اس بوجھ کو اتار دے۔

## خارجی ادب

یہی صفات ـــــ یعنی دین میں شدت، عقیدہ میں اخلاص بے نظیر شجاعت اور ان سب پر مستزاد ان کی خالص عربیت ـــــ تھیں جنھوں نے خوارج کا ایک خاص ادب پیدا کر دیا تھا جو نظم و نثر دونوں میں

زور بیان، انتخاب الفاظ، سلاست، فصاحت و بلاغت اور اسلوب بیان کے لحاظ سے تنا درجہ کا مالک تھا۔ عبید اللہ ابن زیاد نے خارجیوں کو قید کرنے اور قتل کرنے میں نہایت مبالغہ سے کام لیا تھا۔ لوگوں نے عبید اللہ ابن زیاد سے خارجیوں کی سفارش کی تو اس نے سفارش کو رد کرتے ہوئے کہا تھا کہ میں نفاق کا قلع قمع اس سے پہلے ہی کر دینا چاہتا ہوں کہ وہ کوئی پودا بن سکے۔ ان لوگوں کی باتیں دلوں میں اتنی جلدی اثر کر جاتی ہیں کہ پھونس میں آگ بھی اتنی جلدی اثر نہیں کرتی۔

کسی خارجی کو عبد الملک بن مروان کے سامنے پیش کیا گیا۔ عبد الملک نے اسے دعوت دی کہ وہ اپنے مسلک سے رجوع کرلے۔ اس نے انکار کر دیا۔ عبد الملک نے دوبارہ لجاجت اور نرمی کے ساتھ اصرار کیا تو خارجی نے جواب دیا۔ ایک بار انکار کے بعد دوبارہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ تم کہہ چکے میں نے سن لیا۔ اب میں کہتا ہوں، تم سنو! عبد الملک نے کہا۔ "اچھا کہو میں سنتا ہوں، خارجی نے شرح و بسط کے ساتھ خارجیوں کے اقوال بیان کرنا شروع کئے اور طلاقت لسانی کے ساتھ اپنے مذہب کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے اس نے ایک سماں باندھ دیا۔ زبان صاف۔ الفاظ واضح۔ مضامین دل نشین۔ عبد الملک کہنے لگا کہ اس نے میرے دل میں یہ بات جما دی تھی کہ جنت صرف انہی لوگوں کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ اور ان تصورات کے لئے جہاد کرنا مجھ پر جان سے کہیں زیادہ فرض ہے۔ مگر پھر خدا ہی نے میرے دل کو دلائل و براہین کے ذریعہ سے سکون عطا فرمایا اور حق بات میرے دل میں ڈال دی۔

**خارجی خطیب و شاعر** ان میں بہت سے فصیح و بلیغ خطیب گزرے ہیں۔ مثلاً ابو حمزہ۔ قطری بن الفجاۃ وغیرہ۔ بلند پایہ شعراء کی بھی خارجیوں میں کمی نہیں۔ مثلاً عمران بن حطان اور طرماح وغیرہ۔ لغت و ادب میں ان کے مشہور ترین عالم ابو عبیدہ معمر المثنی گذرے ہیں۔ لغت و ادب، صرف و نحو، اخبار عرب اور ایام عرب کا واقف پورے بصرہ میں اس کی ٹکر کا کوئی دوسرا آدمی نہیں تھا۔ دولت عباسیہ کے ابتدائی دور میں اس سے زیادہ تصنیفات کسی دوسرے عالم کی نہیں ہیں۔ اس کی تصانیف کی تعداد تقریباً دو سو بیان کی جاتی ہے یہ ان چند گنتی کے موالی میں سے ایک ہے جس نے خارجیوں کا مسلک اختیار کر لیا تھا۔

یہاں اس کا موقعہ نہیں کہ خوارج کا ادب اور ان کی نظم و نثر کے منتخب نمونے پیش کئے جائیں اور یہ بتایا جائے کہ ادب میں غیر خارجیوں کے مقابلہ میں ان کی خصوصیات اور امتیازات کیا تھے۔

---

# مرجئہ

اس سے پہلے ہم دیکھ چکے ہیں کہ خوارج اور شیعہ ابتداءً سیاسی فرقے تھے جو مسئلہ خلافت کی وجہ سے پیدا ہوئے تھے۔ ان کی

طرح مرجیہ بھی ابتداءً ایسے ہی تھے۔ یعنی وہ بھی ایک ممتاز سیاسی جماعت تھی۔

## مرجیہ کی ابتداء

مسلمانوں کے مابین جو اختلافات پیدا ہو چکے تھے ان کے بارہ میں ان کی ایک علیحدہ رائے تھی۔ ابن عساکر ان لوگوں کی رائے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ دراصل شک کرنے والے لوگ تھے جو شک و تذبذب میں مبتلا تھے۔ یہ لوگ مختلف جگہوں میں متردد تھے اور مختلف جنگی محاذوں پر داد شجاعت دیتے رہے تھے۔ جب یہ لوگ شہادت حضرت عثمانؓ کے بعد مدینہ منورہ میں آئے تو انہوں نے لوگوں میں عجب خلفشار دیکھا۔ یہ لوگ باہمد گر اختلافات کا شکار ہو رہے تھے حالانکہ جب یہ لوگ مدینہ منورہ سے جنگی محاذوں پر گئے تھے تو سب لوگ باہمد گر متفق تھے۔ ان میں کسی قسم کا نمایاں اختلاف موجود نہیں تھا۔ ان لوگوں نے مدینہ والوں سے کہا کہ ہم تمہیں چھوڑ کر گئے تھے تو تم سب متحد و متفق تھے۔ تم میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ لیکن اب ہم واپس آئے ہیں تو تم میں اختلاف ہی اختلاف ہے۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ ظلماً شہید کئے گئے ہیں۔ وہ اور ان کے اصحاب عدل و انصاف کی راہ سے زیادہ قریب تھے۔ لیکن دوسرے لوگ کہتے ہیں کہ حضرت علی اور ان کے اصحاب حق سے زیادہ قریب ہیں۔ ہمارے نزدیک تم سب ثقہ اور قابل اعتماد ہو۔ نہ تو ہم ان دونوں سے برأت کرتے ہیں اور نہ ہی ان پر لعنت بھیجتے ہیں۔ اور نہ ان کے خلاف شہادت دیتے ہیں۔ ہم ان کا معاملہ خدا کے سپرد کرتے ہیں۔ خدا ہی ان دونوں یعنی حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے درمیان فیصلہ کرے گا۔ (یہ لوگ مرجیہ کہلائے)

اس سے یہ پتہ چل گیا کہ یہ بھی ایک سیاسی فرقہ ہی تھا مگر ان فتنوں میں اپنے ہاتھ رنگین کرنا نہیں چاہتا تھا، وہ کسی جماعت کا خون بہانا نہیں چاہتا تھا بلکہ وہ یہ فیصلہ کرنا بھی پسند نہیں کرتا تھا کہ کون سا فریق حق پر تھا اور کونسا باطل پر۔ اس فرقہ کو پیدا کرنے میں لوگوں کے باہمی اختلاف رائے نے امداد بہم پہنچائی۔ تصریحات بالا سے آپ نے دیکھ لیا کہ اس فرقہ کی پیدائش کا سبب بعید بھی وہی خلافت کا مسئلہ تھا۔ چنانچہ اگر خلافت کا مسئلہ پیدا نہ ہوتا تو نہ خارجی پیدا ہوتے، نہ شیعہ پیدا ہوتے اور نہ ہی مرجیہ۔

## مرجیہ کی وجہ تسمیہ

مرجیہ کا لفظ "اِرْجَاءٌ" سے ماخوذ ہے جس کے معنی "مہلت دینا" اور "مؤخر کرنا" ہوتے ہیں۔ انہیں "مرجیہ" اس لئے کہتے تھے کہ انہوں نے ان لوگوں کے معاملات کو جنہوں نے آپس میں ایک دوسرے کا خون بہایا تھا قیامت کے دن پر مؤخر کر چھوڑا تھا۔ یہ ان لوگوں کے خلاف کوئی فیصلہ نہیں دیتے تھے۔ بعض علماء نے "مرجیہ" کے لفظ کو اس "اِرْجَاءٌ" سے ماخوذ مانا ہے جس کے معنی رجاء اور امید پیدا کرنے کے آتے ہیں۔ کیونکہ ان لوگوں کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ ایمان کے ساتھ کوئی معصیت نقصان نہیں پہنچاتی جیسا کہ کفر کے ساتھ کوئی اطاعت اور فرمانبرداری نفع نہیں دیتی۔ چنانچہ یہ لوگ ہر گناہ گار مومن کو نجات کا امیدوار بنا دیتے ہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک پہلا قول ہی صحیح ہے جسے ابن عساکر نے بھی نقل کیا ہے اور جو ہمیں زیادہ انسب اور موزوں نظر آتا ہے۔

فرقہ مرجیہ اس دور میں پیدا ہوا جب لوگوں نے دیکھا کہ خوارج حضرت علی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما اور تحکیم کے قائل لوگوں کو

سب تکاھت کا فر بنا رہے ہیں اور دوسری طرف شیعہ فرقہ حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ حضرت عثمانؓ اور ان کے تمام مددگاروں کو کافر قرار دیتے ہیں اس کے ساتھ ہی یہ دونوں فرقے خلفائے بنوامیہ کی تکفیر کر رہے تھے اور ان پر لعنت بھیج رہے تھے۔ ان کے برخلاف خلفائے بنوامیہ ان سے مصروف جنگ تھے اور سمجھ رہے تھے کہ یہ دونوں فرقے باطل پر ہیں۔ ہر فرقہ اس کا مدعی تھا کہ تنہا وہی حق پر ہے اور جو لوگ ان کے فرقہ سے باہر ہیں وہ کافر ہیں اور کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا ہیں۔ ان حالات وکوائف میں مرجیہ فرقہ نے جنم لیا جو تمام فرقوں سے صلح جویانہ معاملہ کرنے کا قائل تھا اور کسی کو کافر قرار نہیں دیتا تھا۔ اس فرقہ کے متبعین کا خیال تھا کہ تینوں فرقے یعنی خارج، شیعہ اور امرار بنوامیہ سب مسلمان ہیں۔ ان میں سے ہو سکتا ہے کہ کوئی فرقہ خطا کار ہو اور کوئی فرقہ صحیح راستہ پر ہو مگر ہمیں اس چیز کو متعین کرنے کی ضرورت نہیں کہ کون فرقہ حق پر ہے۔ ہم ان کے معاملات کو خدا کے حوالہ کرتے ہیں۔ بنوامیہ کے امرار وسلاطین بھی مسلمان ہیں جو اس کی شہادت دیتے ہیں کہ خدا کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ لہذا نہ وہ کافر کہلا سکتے ہیں نہ مشرک بلکہ وہ مسلمان ہی ہیں۔ ہم ان کا معاملہ بھی خدا کے حوالے کرتے ہیں جو دل کی چھپی ہوئی باتوں تک کو جانتا ہے اور ان سب سے وہ ان تمام باتوں کا حساب لے گا جو وہ اپنے دلوں میں چھپائے ہوئے ہوں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ بنوامیہ کی سلطنت وحکومت کے معاملہ میں مرجیہ فرقہ کا موقف بڑی حد تک تائید ونصرت کا موقف تھا، لیکن یہ تائید سلبی تھی، ایجابی نہیں تھی۔ یہ لوگ بنوامیہ کے ہوا خواہوں میں داخل نہیں تھے اور نہ ہی تلواریں حمائل کر کے بنوامیہ کی فوجوں کے ساتھ ہو کر شریک جنگ ہوتے تھے۔ یہ لوگ بنوامیہ کے مقابلہ میں ایسے ہی غیر جانبدار تھے جیسا کہ شیعوں اور خارجیوں کے مقابلہ میں غیر جانبدار رہتے تھے۔ یہ لوگ — بظاہر ایسا ہی نظر آتا ہے کہ — بنوامیہ کی حکومت کو ایک شرعی اور قانونی حکومت تسلیم کرتے تھے اور یہ خود ایک بہت بڑی تائید تھی۔

**عقیدۂ ارجاء اور عہد صحابہؓ** صدر اول کے صحابہؓ میں اس جماعت کا بیج موجود تھا۔ ہم جانتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں ایک بڑی جماعت ایسی موجود تھی جو اس نزاع سے بالکل الگ تھلگ رہی جو حضرت عثمانؓ کے آخری عہد میں پیش آیا تھا۔ مثلاً ...... حضرت عبداللہ ابن عمرؓ حضرت عمران بن الحصینؓ، حضرت اسامہ ابن زیدؓ وغیرہ قطعاً اس نزاع سے کنارہ کش رہے۔ حضرت ابوبکرہؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلعم نے ارشاد فرمایا تھا کہ ایسے فتنے آنے والے ہیں جن میں بیٹھ جانے والا چلنے والے سے بہتر ہوگا اور چلنے والا دوڑنے والے سے بہتر ہوگا۔ جب یہ فتنے بیدار ہو جائیں تو یاد رکھو جس کے پاس اونٹ ہوں وہ اپنے اونٹوں کو لے کر کہیں نکل جائے، جس کے پاس بکریاں ہوں وہ اپنی بکریاں لے کر کہیں چلا جائے۔ جس کے پاس زمین کا کوئی ٹکڑا ہو وہ اپنی زمین میں لگ جائے۔ اس پر کسی آدمی نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ: جس کے پاس نہ اونٹ ہوں، نہ بکریاں ہوں اور نہ زمین ہو تو وہ کیا کرے۔ آپ نے فرمایا کہ اسے چاہیئے کہ اپنی تلوار لے کر پتھروں پر مار مار کر اسے توڑ ڈالے اور اس کے بعد کسی طرف سے بھی ان فتنوں میں حصہ نہ لے اور جس طرح بھی نجات حاصل کر سکتا ہو ان فتنوں سے نجات حاصل کر لے۔

یہ رجحان ہی کہ مسلمانوں کی باہمی جنگ و جدال میں جس میں وہ ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہے ہوں تعقاد خل نہیں ہونا چاہیئے وہ بنیاد ہے جس پر آگے چل کر مذہب ارجاء کی عمارت استوار ہوئی۔ لیکن جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں ـــــ اس رجحان نے ایک مسلک کی شکل اس وقت تک اختیار نہیں کی جب تک شیعوں اور خارجیوں کے دو متحارب کیمپوں کا ظہور نہیں ہو چکا۔

## مرجئہ سیاسی فرقہ تھا

ابتداءً یہ محض ایک سیاسی مسلک تھا مگر آہستہ آہستہ یہ لوگ بھی لاہوتی مسائل کی تحقیق و تدقیق اور بحث و مناظرہ میں مشغول ہوتے چلے گئے۔ ان کی تحقیقات کے نتائج ان کے سیاسی نظریات سے متفق ہوتے تھے۔ ان کی اہم تحقیق ایمان، کفر، مومن۔ کافر وغیرہ کی منطقی تعریفات ہیں۔ اس تحقیق کا باعث یہ چیز تھی کہ وہ خوارج کو دیکھ رہے تھے کہ وہ غیر خارجی مسلمانوں کو بلا تکلف کافر بنا رہے ہیں۔ دوسری طرف شیعوں کا مسلک بھی یہی تھا۔ خوارج نے ذرا غلو سے کام لیا اور انھوں نے گناہ کبیرہ کے ارتکاب کو کفر قرار دیدیا۔ اِدھر شیعوں نے بھی کچھ کم غلو سے کام نہیں لیا۔ انھوں نے امامت کے عقیدہ کو ارکانِ ایمان میں سے ایک بنیادی رکن قرار دیدیا جس کا طبعی نتیجہ یہی نکلتا تھا کہ تحقیق کی لب طر پر یہ مسئلہ رکھا جائے کہ کفر اور ایمان کیا ہوتا ہے۔ چنانچہ اکثر مرجئہ کی رائے یہی ہوئی کہ ایمان درحاصل اللہ اور اس کے رسولوں کی معرفت کا نام ہے۔ جس نے لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه وَ مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ کی معرفت حاصل کرلی وہ مؤمن ہے۔ اس طرح مرجئہ نے ایک طرف خوارج کے اس خیال کی تردید کردی کہ ایمان ـــ خدا اور اس کے رسولوں کی معرفت، فرائض و واجبات کی ادائیگی اور کبائر سے مجتنب رہنے کا نام ہے۔ لہذا جو شخص خدا اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھے اور فرائض و واجبات کو چھوڑ بیٹھے یا کبائر کا ارتکاب کرے وہ مرجئہ کے نزدیک مؤمن ہوتا تھا اور خارجیوں کی نظر میں کافر ہوتا تھا۔ ساتھ ہی ان لوگوں نے ایمان کی یہ تعریف کرکے شیعوں کے اس عقیدہ کی بھی تردید کردی کہ امام پر ایمان لانا اور اس کی اطاعت کرنا بھی ایمان کا جزو ہے۔

## مرجئہ کا غلو

بلکہ بعض مرجئہ نے تو اس سے بھی زیادہ غلو سے کام لیا اور انھوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ ایمان صرف اعتقاد قلبی کا نام ہے۔ چاہے کوئی شخص اپنی زبان سے علانیہ کفریہ کلمات ہی کیوں نہ بکتا پھرتا ہو اور بتوں کی پرستش کرتا ہو یا یہودیت، مجوسیت اور نصرانیت کا اعلان کرتا پھرتا ہو۔ اگر وہ اسی حالت میں مرجائے تو وہ مؤمن ہے۔ اس کا ایمان اللہ کی میزان میں کامل ہے۔ وہ اللہ عزوجل کا ولی اور دوست ہے اور جنتی لوگوں میں اس کا شمار ہوگا۔[۲]

اس سے صاف ظاہر ہے کہ ان لوگوں کے نزدیک ایمان محض اللہ اور رسول پر دل سے اعتقاد رکھنے کا نام ہے اور

---

[۱] علامہ نوویؒ نے شرح مسلم میں لکھا ہے کہ وہ قضیئے (یعنی وہ فتنے جو صحابہؓ کے درمیان ظاہر ہوئے) مشتبہ سے تھے۔ حتیٰ کہ صحابہ کی ایک جماعت ان کے بارہ میں متحیر رہی اور وہ دونوں جماعتوں سے الگ تھلگ رہے اور کسی میں بھی شریک نہیں ہوئے کیونکہ انھیں یہ یقین حاصل نہیں ہوسکا کہ صواب کی راہ کونسی ہے؟ [۲] ابن حزم صفحہ ۲۰۴ جلد ۴

ظاہری اعمال قطعاً ایمان کا جزو نہیں ہیں بلکہ ان کا اعتبار بھی نہیں ہے۔

ان تمام باتوں کا نتیجہ ان کی سیاسی رائے سے مطابقت رکھتا ہے وہ نہ بنوامیہ کو کافر کہتے ہیں، نہ خوارج کو اور نہ شیعوں کو بلکہ اہل جیسے نصرانیوں اور یہودیوں کے کفر پر بھی وہ یقین نہیں رکھتے کیونکہ ایمان کا مقام تو انسان کا دل ہے جس پر خدا کے سوا کوئی دوسرا واقف ہی نہیں ہو سکتا۔ یہ نظریہ تمام لوگوں کے ساتھ صلح وصفائی کے ساتھ رہنے کا داعی ہے۔ بعض مستشرقین کا خیال ہے کہ فرقۂ مرجیۂ کی پیدائش کی ابتداء۔ اس کے عقائد کی تفصیلات غرضیکہ تمام چیزیں بڑی ہی پیچیدگی کی حامل ہیں انہی امور کو ان لوگوں نے اس کی علت قرار دیا ہے کہ سلطنت عباسیہ نے اس فرقہ کو کیوں ختم کر دیا اور اس عقیدہ کے نام لیواؤں کو کیوں تہس نہس کر ڈالا۔ جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ یہ فرقہ کسی نہ کسی حد تک بنوامیہ کے لئے مؤید ضرور تھا۔ اور بنوامیہ کے عہد ہی میں یہ پروان چڑھا مگر بنوامیہ کے بعد یہ فرقہ دوسرے فرقوں میں ضم ہوگیا اور اس طرح اس نے اپنے انفرادی وجود کو بالکل ختم کر دیا۔ جس کے بعد پھر کبھی اس فرقہ کو سر اٹھانے کا موقعہ نہیں مل سکا۔

بنوامیہ کے شعراء میں سے ثابت بن قطنہ مرجیۂ کے عقائد پر ایمان رکھتا تھا اور یزید بن المہلب کے ساتھیوں سے تھا جو اسے مختلف سرحدی خدمات پر مامور کر کے اِدھر اُدھر بھیجتا رہتا تھا۔ اس کی فصاحت وبلاغت اور شجاعت وجوانمردی کی بناء پر یزید ابن المہلب اس سے بہت خوش تھا۔ عقیدہ "ارجاء" کے بارہ میں اس کا ایک قصیدہ ہے جو نہایت قابل اعتماد قیمتی دستاویز سمجھا جاتا ہے جس میں اس نے اپنے مذہب کی خاصی وضاحت کر دی ہے۔ ابوالفرج اصفہانی نے "اغانی" میں اس قصیدہ کو نقل کیا ہے۔ اس قصیدہ کے چند اشعار یہ ہیں۔

اے ہند! سن رکھ، ہماری سیرت یہ ہے کہ ہم خدا کی اطاعت کرتے ہیں اور کسی کو اس کے ساتھ شریک نہیں ٹھہراتے۔

معاملات جبکہ مشتبہ ہوں تو ہم فیصلہ کو خدا پر چھوڑ دیتے ہیں البتہ جو شخص ظلم وعناد اختیار کرتا ہے اس کے بارہ میں ہم سچی سچی بات کہہ دیتے ہیں۔

مسلمان اسلام میں سارے کے سارے اور مشرکین اپنے دین میں سب کے سب برابر ہیں۔

میں نہیں سمجھتا کہ کوئی گناہ، کسی انسان کو شرک تک پہنچا سکتا ہے جبکہ وہ خدائے بے نیاز کی توحید کا قائل ہو۔

ہم لوگ خونریزی نہیں کرتے بجز اس صورت کے کہ کوئی ہمارا خون بہانے کا تہیہ کرلے۔ بس یہی ایک صورت ہو سکتی ہے۔

جو دنیا میں اللہ کا تقویٰ اختیار کرتا ہے اسے کل کو حساب دیتے وقت ایک متقی کا اجر ملے گا۔

خدا نے جس امر کا فیصلہ کر دیا ہے وہ رد نہیں کیا جا سکتا اور جو کچھ وہ فیصلہ کر دیتا ہے وہی درست ہوتا ہے۔

تمام خوارج ان امور میں خطاکار ہیں وہ کتنی ہی عبادتیں اور کتنے ہی جہاد کیوں نہ کرتے رہیں۔

علیؓ اور عثمانؓ دونوں خدا کے بندے ہیں جب سے انھوں نے خدا کی اطاعت اختیار کی تھی کبھی شرک سے اپنا دامن آلودہ نہیں کیا۔

ان دونوں کے درمیان شور وشغب پیدا ہوا۔ ان دونوں نے ملت میں افتراق واختلاف کا مشاہدہ کیا اور جو کچھ مشاہدہ کیا تھا وہ ایک حقیقت تھی۔

خدا علیؓ اور عثمانؓ کو ان کی کوششوں کی جزا دے گا۔ مجھے معلوم نہیں ان کے اس حق کے بارہ میں کوئی آیت بھی وارد ہوئی ہو۔

خدا ہی جانتا ہے کہ وہ اپنے کون سے اعمال لے کر آئیں گے۔ ہر بندہ خدا سے اکیلا ہی ملے گا۔

---

**اخذ شدہ نتائج** جب ہم ثابت بن قطنہ کے اس قصیدہ کا تجزیہ کرتے ہیں تاکہ "ارجاءؒ" کی حقیقت معلوم کر سکیں تو ہم اسے یہ کہتا ہوا پاتے ہیں کہ

(۱) وہ کسی مسلمان، پر وہ کیسا ہی گنا ہگار کیوں نہ ہو کفر کا حکم نہیں لگاتے۔

(۲) کسی گناہ سے، چاہے وہ کتنا ہی بڑا گناہ کیوں نہ ہو ایمان جاتا نہیں رہتا۔

(۳) وہ کسی مسلمان کا خون نہیں بہاتے بجز اس کے کہ اپنی جان کی حفاظت میں مدافعت کے طور پر ایسا کیا جائے۔

(۴) جب امور مشتبہ ہوں اور ہر جماعت دوسری جماعت کو کافر بنا رہی ہو تو یہ لوگ ان کا معاملہ خدا کو حوالہ کر کے الگ ہو جاتے ہیں کہ وہ قیامت کے دن ان کے باہمی اختلافات میں خود فیصلہ دے دیگا۔

(۵) واضح ظلم وجور اور کھلم کھلا عناد اور ظاہری اعمال پر البتہ وہ دو ٹوک فیصلہ دیدیتے اور خطا کو ثواب سے اور باطل کو حق سے الگ کر دیتے ہیں۔

(۶) خوارج نے غلطی کی حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کو کافر قرار دے دیا۔ وہ دونوں خدا کے بندے تھے جنہوں نے خدا کی معرفت حاصل ہو جانے کے بعد کبھی شرک نہیں کیا۔

(۷) ان دونوں کے درمیان شور وشغب ضرور ہوا لیکن اس بات نے انھیں ایمان سے خارج نہیں کر دیا۔ لہذا یہ لوگ ان کا معاملہ خدا کے حوالہ کرتے ہیں کہ وہی ان کے عمل کا اندازہ کرے گا اور ان کو جزا دے گا۔

---

اغانی نے عون بن عبداللہ بن عقبہ بن مسعود کا بھی تذکرہ کیا ہے کہ وہ بہت بڑے فقیہہ اور ادیب تھے۔ ابتداءً وہ بھی عقیدۂ "ارجاء" کے قائل تھے مگر بعد میں انھوں نے اس سے رجوع کر لیا تھا۔ عون بن عبداللہ نے کہا ہے ۔۔

سب سے پہلے میں جس چیز سے الگ ہوتا ہوں وہ ایک یقینی چیز ہے شک کی بات نہیں ہے۔ مرجئہ جو کچھ

کہتے ہیں میں اس سے الگ ہوتا ہوں۔

وہ کہتے ہیں کہ ظالم لوگوں میں بھی مومن ہوتے ہیں حالانکہ مومن تو ظالم نہیں ہوا کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ مومن کا خون حلال ہوتا ہے۔ حالانکہ مومن کا خون تو قطعاً حرام ہوتا ہے[۱]۔

---

**طلوع اسلام** یہ ہیں علامہ احمد امین مصری کی تحقیقات کے مطابق، مسلمانوں کے ابتدائی تین اہم فرقوں کے مختصر حالات۔ فرقہ سازی کے متعلق، قرآن کریم کی صاف اور واضح تعلیم کی روشنی میں، طلوع اسلام کا جو مسلک ہے وہ قارئین سے پوشیدہ نہیں۔ اس مسلک کی روشنی میں اس باب میں کچھ اور لکھنا تحصیل حاصل ہے۔ ان فرقوں کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے ان کی حیثیت تاریخی ہے اور بس۔

---

[۱] صفحہ ۲۹۲ جلد ۳


# انسانی

# کیا سوچا؟

زندگی کے اہم مسائل کے حل کے لئے انسانی فکر نے کیا کیا کوششیں کیں اور اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ بیش بہا معلومات کا ذخیرہ سائز ۲۹×۲۲ — ۳۶۸ صفحات قیمت دس روپے

ملنے کا پتہ

ناظم ادارۂ طلوع اسلام ــــــ کراچی ۲۹

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# مذاہب عالم کی حقیقت

## (ایک اہم غیر مطبوعہ کتاب کا پہلا باب)

(محترم عبداللہ المسدوسی (حیدرآبادی، ثم کراچوی) علمی دنیا میں تعارف کے محتاج نہیں۔ تحقیق و تجسس آپ کی نمایاں خصوصیت اور کاوش و محنت گویا جزو زندگی ہیں۔ وہ کچھ مدت سے ایک کتاب کی تالیف میں مصروف بلکہ منہمک ہیں جس میں انھوں نے دنیا کے موجودہ اور بڑے بڑے مذاہب کے پیروؤں کے متعلق اہم معلومات فراہم کرکے یہ بتایا ہے کہ ان کی آبادی کتنی ہے۔ کن کن ممالک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اور ان کا دائرہ اثر و رسوخ کس حد تک ہے۔ یہ اعداد و شمار دور حاضر کی سیاست میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اور اس وقت تک (اور تو ایک طرف) مغربی ممالک کی کسی زبان میں بھی اس وسعت اور صحت کے ساتھ کہیں نہیں ملتے۔ مسدوسی صاحب کی یہ کوشش اور کاوش فی الواقعہ علمی حلقہ میں بنظر تحسین دیکھی جائے گی۔

یہ کتاب پریس میں جا رہی تھی کہ انھوں نے مناسب سمجھا کہ اس کا پہلا باب بغرض تعارف طلوع اسلام میں شائع ہو جائے۔ اسے ہم بمسرت قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ اس باب میں انھوں نے مذہب کی عمومی حیثیت سے بحث کی ہے اور اس ضمن میں دنیا کے بڑے بڑے مذاہب سامنے لائے گئے ہیں۔ امید ہے قارئین اسے دلچسپی سے پڑھیں گے۔ اتنا عرض کر دینا ضروری ہے کہ یہ ساری بحث مذہب (RELIGION) کے متعلق ہے۔ دین کے متعلق نہیں۔ دین خدا کی طرف سے مختلف انبیائے کرام کی وساطت سے ملتا رہا ہے۔ اس لئے اس کے متعلق "تاریخی ارتقاء" کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ طلوع اسلام)

اگلے ابواب میں آپ دنیا کے موجودہ بڑے مذاہب کی آبادی، رقبے، ممالک اور ان کے سیاسی مرتبہ کا تفصیلی حال پڑھیں گے۔ لیکن اس تفصیلی جائزے کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم اجمالاً مذہب کی اصل حقیقت کو سمجھیں اور مختلف مذاہب کے

باہمی فرق و امتیاز اور ان کی بنیادوں کو معلوم کریں۔

**مذہب کی تعریف**

مذہب کی کوئی جامع و مانع تعریف مشکل ہے کیونکہ اس معاملہ میں صرف یہی دقت درپیش نہیں کہ مذہب کے لازمی وظیفہ سے متعلق زندہ اور مردہ مذاہب عالم کا تصور مختلف رہا ہے جس میں کسی قدر مشترک کا وجود نہیں بلکہ اصلی دقت یہ ہے کہ مذہب کی کوئی آسان ترین تعریف بھی قبول کی جائے تو بھی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ چنانچہ (ENCYCLOPAEDIA OF RELIGIONS AND ETHICS) کا مقالہ نگار اس گتھی کی طرف یوں اشارہ کرتا ہے:۔

"اگر اے۔ بی ٹائلر (A. B. TYLOR) کی مختصر ترین تعریف کو قبول کیا جائے جس کے مطابق "مذہب روحانی موجودات پر عقیدہ" کا نام ہے۔ تب بھی یہ تعریف ان موجودات کی ماہیت اور ہر ایک فرقہ کے لئے اس عقیدہ کی اصل اور جواز کے سوال کو پیدا کرتی ہے۔ (جلد اول صفحہ ۶۲۳)

لیکن اس دقت کا ہرگز یہ نتیجہ نہ ہونا چاہیئے۔ کہ مختلف مذاہب کی اصل حقیقت کی تلاش اور ان کے باہمی فرق و امتیاز کے مسئلہ سے دست برداری کر لی جائے۔

مذہب کی ایک یا متعدد تعریفوں کی دریافت میں اس حقیقت کے اعتراف سے کافی مدد ملے گی کہ مذاہب عالم نسل انسانی کی ارتقائی تاریخ کے نمائندہ ہیں اور وہ تمدنی اور سیاسی تاریخ کے مختلف مدارج کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس لئے قدر مذاہب کے منصب کے بارے میں ان کا دائرہ عمل مختلف رہا ہے۔ نتیجتاً معاشرہ پر ان کا اثر و اقتدار بھی کم و بیش رہا ہے۔ اس واضح تاریخی صداقت کو پیش نظر رکھا جائے تو ہم ایک کے بجائے مذہب کی متعدد تعریفوں سے دوچار ہوتے ہیں لیکن اس کا ایک فائدہ یہ ہے کہ ہم مذاہب کے تعلق سے انسانی تاریخ کے مختلف فکری و تہذیبی ادوار کا واضح تصور قائم کر سکتے ہیں۔

**مذہب کا پہلا تصور**

دنیا کے موجودہ اور سابقہ قدیم و ابتدائی مذاہب جن کو بت پرستی (PAGANISM) کہا جاتا ہے۔ ان کے مذہبی عقائد و اعمال کے تجزیہ و تحلیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ مذہب در اصل مافوق الفطرت موجودات اور قوتوں کی پرستش کا دوسرا نام ہے۔ بت پرستی کا دور انسانی تاریخ میں سب سے پہلا تمدنی دور ہے جبکہ انسانی زندگی نہایت سادہ، اس کے احتیاجات برائے نام اور اس کی ضروریات وافر اور بآسانی قابل حصول تھیں۔ اس لئے ان مادی احتیاجات کی بسہولت تکمیل کے بعد انسان کے لئے قلب و ذہن کی آسودگی کی خاطر کسی اعلیٰ تر ہستی کا فطری تخیل کافی تھا۔ جس کو وہ کائنات کے مختلف مظاہر میں دیکھتا یا ان کے پس پردہ محسوس کرتا تھا۔ یہ احساس انسانی فطرت[1] کے تقاضے کے طور پر ایک اعلیٰ تر اور ازلی اور ابدی ذات کے الٰہی تصور کا سرچشمہ تھا لیکن فکر انسانی کی ناپختگی اور خام کاری نے مظاہر

---

[1] یہ تصور محل نظر ہے۔ (طلوع اسلام)

قدرت کی کثرت کو بت پرستی کے لئے مجاب بنا دیا۔ چونکہ یہ دور اجتماعی و معاشی حیثیت سے جیسا کہ بیان ہوا ابتدائی دور تھا۔ اس لئے انسان حائلی اور خاندانی زندگی کے تنگ دائرہ میں محدود تھا چنانچہ اس دور کے مذہبی تصور کا ایک ضروری اور نمایاں پہلو یہ ہے کہ مذہب کا دائرہ عمل اجتماعی زندگی کے حقوق و فرائض سے زیادہ مذہبی رسوم و عوائد (عبادات) تک محدود رہا۔ یہی وہ راز ہے کہ تمام ابتدائی مذاہب بت پرستی پر چند ایسے مذہبی عقائد و اعمال کی پابندی کافی سمجھی جاتی ہے جن کا کوئی راست اور گہرا تعلق انسان کی اجتماعی زندگی سے وابستہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس نقطہ نظر سے مذہب کا یہ سب سے زیادہ محدود تصور ہے کیونکہ اس کا کوئی اثر انسان کے ان اجتماعی اعمال و فرائض پر نہیں پڑ سکتا جو کسی معاشرے کے افراد کے باہمی برتاؤ کو نشان زد کرتے ہیں۔ اس دور میں بلا روک ٹوک جنگل کے قانون کا دور دورہ تھا۔ دوسرے الفاظ میں اس دور میں ہر شخص اپنی ضروریات و خواہشات کی تشفی کے لئے حسب منشا جبر و طاقت کے آزادانہ استعمال میں مختار کل تھا جس پر کسی ضابطہ کی کوئی بندش نہ تھی۔ قدرتی قوانین یا اخلاقی قوانین کے ضابطے جو کبھی کبھی برتے جاتے تھے ان کی حیثیت حکمی قوانین سے زیادہ مصلحت بینی (EXPEDIENCY) کے ان اصولوں کی رعایت کی تھی۔ جن کی خلاف ورزی کو انسان تحفظ ذات و جائداد کے لئے صرف ایک خطرہ خیال کرتا تھا۔

**مذہب کا دوسرا تصور** بت پرستی کی دوسری ترقی یافتہ صورت وہ ہے جبکہ اجتماعی حیثیت سے نسل انسانی نے کافی ترقی کی عائلی زندگی سے آگے بڑھ کر قبائلی زندگی اور قبائلی زندگی نے مملکتوں کی صورت اختیار کی اس دور میں انسان کی انفرادی زندگی نے پہلی دفعہ اجتماعی زندگی کے ایک جزو ترکیبی کی حیثیت اختیار کرلی یعنی افراد اور قبائل نے معاشرہ کے ارکان کی حیثیت سے اپنے آپ کو اجتماعی فرائض و واجبات کا پابند دیکھا اس متبدلہ اور ترقی یافتہ صورت حال کا مذہبی تصور پر اثر پڑنا ناگزیر تھا چنانچہ وہی بت پرستی جو سابقہ دور میں صرف مذہبی رسومات و عوائد میں محدود تھی اب منظم معاشرہ کے نئے تقاضوں میں اجتماعی حقوق و فرائض کے بعض نظریات کو اپنانے پر مجبور ہوئی اس طرح اس دور میں جو مذہب بنا وہ رسوم و عوائد مذہبی کے ساتھ مادی زندگی کی بعض ضروریات اور اجتماعی زندگی کے بعض حقوق و فرائض کے ساتھ مصالحت پر مجبور ہوا۔ انفرادی و اجتماعی زندگی کے ان دو جداگانہ شعبوں میں یہ نیا تعلق متبدلہ حالات کا جبری نتیجہ تھا جس کو تاریخی ارتقاء کی پیداوار سمجھنا چاہیئے نہ کسی سوچی سمجھی کوشش یا آسمانی ہدایت کا نتیجہ۔ یہ انسان کی مذہبی اور اجتماعی زندگی کا بھی ایک غیر اختیاری امتزاج تھا اس طرح اب مذہب کا جو تصور دنیا کے سامنے آیا وہ ابتدائی بت پرستی کی ایک غیر ترقی یافتہ صورت تھی۔ مشرق کے تمام غیر الہامی مذاہب اسی کے نمائندے ہیں۔ چاہے شنتو مذہب ہو۔ اسلاف پرستی ہو، تاؤمت ہو کنفیوشی مت ہو، بدھ مت ہو یا ہندو مذہب۔ ان کے منجملہ تین مذاہب (ہندو مذہب، اسلاف پرست اور شنتو مت) میں یہ بات مشترک ہے کہ ان کے آغاز یا کسی ایک بانی مذہب کا پتہ نہیں ملتا۔ نیز ان مذاہب کے رسومات اور عوائد صدیوں میں چل کر مکمل ہوئے جن میں بے شمار معلوم اور نامعلوم مفکرین اور داناؤں کا حصہ رہا ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان مذاہب کی

تعلیمات کا مجموعہ دراصل ابتدائی بت پرستی کی وہ ترقی یافتہ صورت ہے جو عہد جدید کے تغیرات اور تقاضوں سے مل جل کر بنی ہو۔

دیگر منگولی مذاہب۔ تاؤمت، کنفیوشی مت اور بدھ مت کا حال دوسرے غیر الہامی مذاہب سے بے شک اس حد تک مختلف ہے کہ ان کے بانیوں کا پتہ چلتا ہے جو ایک ہی صدی میں ہوئے ہیں۔ لیکن ان کی تعلیمات پر غور کرنے سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے کبھی اپنے اپنے مذاہب کی مکمل و جامع ہدایات نہیں پیش کیں بلکہ انفرادی و اجتماعی شعبوں سے متعلق کچھ مخصوص نظریات پیش کئے جن کو وہ اپنے دور کے مروجہ مذہب بت پرستی کا تکملہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ تاؤمت کو مروجہ مذہب کے صرف اخلاقی پہلو سے بحث تھی اس لئے چند اخلاقی اصولوں پر زور دے کر مروجہ مذہب کو مکمل کیا گیا۔ کنفیوشی مذہب کو صرف نظم مملکت سے تعلق تھا اس لئے حکیم کنفیوشس کی تعلیمات کا سارا زور اچھی حکومت اور نظم مملکت کے دائرہ میں محدود رہا اور اس شعبے کی اصلاح کے ذریعے انھوں نے بت پرستی کو پنپنے اور مثالی معاشرہ کے لئے کافی سمجھا۔ جہاں تک شنتو مذہب کی تعلیمات کا تعلق ہے اس کے بارے میں تو بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ وہ کنفیوشی مت کی طرح جس سے وہ گہرے طور پر متاثر ہوا دراصل نظم مملکت اور سیاسی مرکزیت کے ان اصولوں کے ساتھ (جو شہنشاہ پرستی کی صورت میں نمایاں ہیں) بت پرستی کی ایک متبدل اور انتہائی صورت ہے۔ چنانچہ جاپان کی ترقی یافتہ مملکت کے بارے میں (GORGE ALLEN UNWIN LTD) نے ۱۹۳۹ء میں جو کتاب شائع کی اس کا نام ہی "بت پرست مملکت کا عروج" (THE RISE OF A PAGAN STATE) ہے۔

اب ہم ذیل میں چند اقتباسات درج کرتے ہیں جن سے یہ بخوبی واضح ہو سکے گا کہ کس طرح یہ مذاہب بت پرستی کی ترقی یافتہ شکلیں ہیں۔

(۱) شنتو مذہب کے بارے میں ٹوکیو کی شاہی یونیورسٹی کے ڈاکٹر کریجی کاٹو جو برسوں تک شنتو مذہب کے پروفیسر اور مستند ماہر رہے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

"اگر ہم تاریخ کے وسیع ترین دور کو پیش نظر رکھیں تو شنتو مذہب کے ارتقاء میں تین بڑے تہذیبی دوروں سے دوچار ہوتے ہیں۔ پہلا دور وہ ہے جو فطرت پرستی یا ارواح پرستی کا ابتدائی دور ہے۔ دوسرا دور اعلیٰ فطرت پرستی کا دور ہے جس کو ہم متعدد دیوتاؤں کی پرستش کہہ سکتے ہیں اور تیسرا دور شنتو مذہب کا ترقی یافتہ دور ہے جس میں "مظاہر کامی" (KAMI OBJECTS) کے بارے میں عقیدہ اور عمل اول درجے کے اخلاقی فکری اثرات کے تابع ہو گئے۔" (صفحہ ۱۵۳)

۲۔ ہندو مذہب کے بارے میں جان کلارک آرکر لکھتا ہے:-

(ا) ہندو مذہب اپنے ابہام کے لحاظ سے عہد حجر کی ایک نشانی ہے یہ اتنا قدیم ہے۔ (ص ۵۴)

(ب) "ہندو مذہب کا کوئی بانی نہیں جو اس کو ایک بنیادی پیغام دے اس کا کوئی ابتدائی رہنما بھی نہیں جو زردشت حضرت مسیح یا حضرت محمد صلعم کے مقابلہ میں پیش ہو سکے (صفحہ 55 THE GREAT RELIGIONS OF THE MODERN AGE)

۳۔ کنفیوشی مت کے بارے میں مقالہ نگار مذکورہ بالا کتاب کے صفحہ ۱۹ پر لکھتا ہے۔

کنفیوشی مذہب زبردست انضمامی انجذابی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کا ابتدائی مذہب سے ارتقاء ہوا۔ اور اس نے خدائے برتر و اعلیٰ شانگتی اور قدرت، وطن بحیثیت خدا اور اسلاف پرستی کو قبول کر لیا۔"

۴۔ تاؤمت کے بارے میں اسی کتاب کا مقالہ نگار لکھتا ہے:-

(۱) بعض لوگوں کا خیال ہے کہ تاؤمت کوئی نیا مذہب نہیں بلکہ یہ پہلے سے چلا آرہا ہے جس میں لاؤزے نے ایک تنظیم پیدا کر کے مکمل کیا۔

(۲) یہ مذہب دراصل اوہام اور جادو ٹونوں کا ایک انبار ہے۔ کہا جاتا ہے کہ لاؤزے خود عالم ارواح سے چیانگ تاؤلنگ کے پاس آیا۔ اور اس کو ایک تلوار اور دیگر ہتھیار دیئے تاکہ وہ لوگوں سے جنوں کے اثر کو زائل کر سکے۔ تاؤلنگ کے اسلاف پر نسلاً بعد نسلٍ ان کے اسلاف کی روحیں منتقل ہوتی ہیں اور وہ اس کے اختیارات کے وارث ہیں۔"

یہی حال بدھ مذہب کا ہے جس کی تعلیمات بھی تاؤمت کی طرح صرف اخلاقی پہلو کی حد تک محدود اور بت پرستی کا ضمیمہ ہے البتہ بدھ کی تعلیمات میں تاؤمت کی اخلاقی تعلیمات کے مقابلہ میں یہ فرق پایا جاتا ہے کہ تاؤمت نظم مملکت یا سیاسی تنظیم کے اصول و مقاصد سے موافق یا مخالف کوئی بحث نہیں کرتا اور دلچسپی ظاہر نہیں کرتا لیکن بدھ مذہب عملاً اس سے بیزاری اور بے تعلقی کا اظہار کرتا ہے اس پہلو میں وہ کنفیوشی مت اور شنتومت کا عین ضد ہے جن کا ہدف (TARGET) حکومت اور سیاست ہے۔ اس طرح بدھ مت کی تعلیمات کا سارا زور صرف اس پر رہا ہے کہ انسان خواہشات کو فنا کر کے اور وجود کو مٹا کر زندگی کے آلام و مصائب سے نجات حاصل کرے اس لئے اصلی بدھ مذہب بت پرستی کے عقائد اور اعمال مذہبی کے قدیم چکر میں مبتلا رہا۔ اس نے کہیں بھی بت پرستی کے قدیم تصور کو یکسر باطل کہہ کر ٹھکرا نہیں دیا ہے۔

## مذہب کا تیسرا تصور

مذہب کا تیسرا تصور دراصل مذہب کا آریائی تصور ہے جس کا سب سے بڑا اور مکمل ترجمان ہندو مذہب ہے۔ یہ بھی ابتدائی بت پرستی کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے لیکن اس میں دیگر مذاہب بت پرستی کے برخلاف ایک خاص پہلو پر غیر معمولی زور دیا گیا ہے اور یہ پہلو آریائی نسل پرستی ہے۔ اس معاملہ میں وہ اگرچہ موجودہ یہودی مذہب کے مماثل ہے جس میں بنی اسرائیل کی پسندیدہ امت ہونے کا تصور ہے لیکن یہودیت کی بنیاد الہامی مذہب پر ہے البتہ شنتو مذہب اس معاملہ میں ایک حد تک ہندو مذہب سے مماثل ہے۔ بہرحال آریائی نسل کی برتری کا تخیل ہندو مذہب کے عقیدہ کا مخصوص پہلو ہے جو اس کو دیگر منگولی مذاہب سے ممتاز بناتا ہے ورنہ ہندو مذہب تو کوئی معین مذہب بھی نہیں ہے بلکہ ہر طرح کے افکار و عقائد کی بھول بھلیاں ہے۔ بہت سے لوگ ہندو عقیدے کی اس رنگا رنگی کی بنا پر جلد بازی سے یہ رائے قائم کر لیتے ہیں کہ یہ ہندو مذہب کی کوئی منفرد خصوصیت ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے یہ تمام غیر الہامی مذاہب کی ایک عام خصوصیت ہے چنانچہ چین کے مذاہب کے بارے میں سابقہ حکومت چین کی وزارت معلومات کا بیان یہ ہے:-

چینی قوم کا بہت بڑا حصہ مذہب کے بارے میں مرنجاں مرنج اور روادار واقع ہوا ہے۔ چنانچہ ایک اوسط چینی اسلاف پرستی بھی کرے گا بدھ مت کے رسوم میں بھی حصہ لے گا۔ اور عیسائی عقائد کی بھی پیروی کرے گا اور ایسا کرتے ہوئے اس کو ذرا بھی تضاد اور منافقت کا احساس نہ ہوگا۔ (GHINA HAND BOOK صفحہ ۳۶)

اصل یہ ہے کہ ہندو قوم بھی اپنے مغربی حریف یونانیوں کی طرح ایک عقلی قوم ہے جس نے اپنے فلسفیانہ اور مابعد الطبیعیاتی نظریات کو مذہب کا جامہ پہنا دیا ہے اور اس پردے میں اپنے نسلی اقتدار کے تحفظ کا بندوبست کیا ہے۔

## مذہب کا چوتھا تصور

آریائی اور منگولی اقوام کے دائرہ سے باہر مذاہب کا جو تیسرا بڑا گہوارہ مشرق وسطیٰ کا علاقہ رہا ہے۔ جو سامی اقوام کا مرزبوم اور تاریخی دائرہ اثر ہے۔ اس خطہ میں جو مذاہب (یہودیت، عیسائیت اور اسلام) پیدا ہوئے انھوں نے بت پرستی سے جداگانہ تصور مذہب پیش کیا جو سراسر انقلابی تھا کیونکہ یہ وحی و الہام پر مبنی تھا۔ اس کے مضمرات پر ہم آگے مناسب مقام پر بحث کریں گے لیکن یہاں اجمالاً اس قدر کہا جا سکتا ہے کہ ان تینوں الہامی مذاہب کی تعلیمات میں انسان کی مادی اور روحانی نیز انفرادی و اجتماعی زندگی کو بڑی حد تک ایک چوکھٹے میں بٹھایا گیا ہے اور اس طرح زندگی کے ضروری اور لازمی پہلوؤں کو پوری طور پر پیش نظر رکھا گیا ہے چنانچہ سب سے قدیم مذہب (یہودیت) میں حکمت کلیمی کی بنیاد نہ صرف توحید خالص پر ہے بلکہ تعلق باللہ اور تزکیۂ اخلاق کے ان اصولوں کے علاوہ جو شریعت موسوی کا طرۂ امتیاز ہیں، مساوی طور پر آزادی اور سیاست کے مسائل پر بھی زور دیا گیا ہے۔ مذہب کا یہی تصور بنیادی طور پر صرف اس فرق کے ساتھ عیسائیت میں بھی پایا جاتا ہے کہ اس میں انسان کی مذہبی اور سیاسی زندگی کو دو علیحدہ شعبوں میں تقسیم کر کے ان کو جداگانہ اقتدار اعلیٰ (پوپ و سیزر، حکومت و کلیسا) میں مرکوز کر دیا گیا۔ علیحدگی اختیارات کا یہ نظریہ جو عیسائیت میں داخل ہو گیا کس حد تک انجیل کی تعلیمات میں تحریف کا نتیجہ ہے؟ اور کس حد تک حضرت عیسیٰ کے زمانہ مابعد کے دور کے سیاسی اسباب کا نتیجہ ہے اس پر بحث کا یہ موقع نہیں اور اسی طرح اس بحث کا کوئی محل نہیں ہے کہ کس حد تک اس نظریے نے بالآخر جمہوریت کے اس مشہور نظریہ تفریق اختیارات (SEPARATION OF POWER) کی بنیاد رکھی جو موجودہ مغربی نظریہ جمہوریت کی نمایاں علامت ہے۔ لیکن اتنی صراحت یہاں مناسب و مفید ہوگی کہ عیسائیت کا اصلی نظریہ بھی بنیادی طور پر کسی طرح مذہب کے ایک ہمہ گیر اور جامع تصور کے خلاف نہ تھا کیونکہ وہ تفریق اختیارات کا حامی ہونے کے باوجود انسان کی دینی و دنیوی، انفرادی و اجتماعی زندگی کے ایک ہونے کا قائل ہے اور اسی طرح تثلیث کے باوجود ایک اعلیٰ تر ہستی کی برتر مطاعیت سے انکار نہ کر سکا۔ الغرض عیسائیت کے بنیادی عقائد (تثلیث اور علیحدگی اختیارات) میں بھی مذہب کے اس طاقتور اور ہمہ گیر تصور سے دبے ہوئے اور سہمے ہوئے دکھائی دیتے ہیں جو توحید کا تصور ہے۔

## مذہب کا پانچواں تصور

جہاں تک اسلام کے نظریۂ دین کا تعلق ہے یہ بات سب پر روشن ہے کہ وہ مذہب کی جامع تر تعریف پیش کرتا ہے۔ اس کے نزدیک دین ایک ایسا ضابطہ حیات ہے جو خدا نے وحدہٗ

---

صلہ دگی کہنا زیادہ مناسب ہے۔ (طلوع اسلام)

لاشریک لہ کی طرف سے اپنے آخری پیغمبر حضرت محمد صلعم کے ذریعہ خدا کی کتاب (قرآن کریم) کی صورت میں دیا گیا جس میں زندگی کے مادی اور روحانی دونوں شعبوں سے متعلق مکمل اور واضح احکامات دیئے گئے۔ مذہب کے اس مکمل اور جامع نظریہ نے جس طرح مذاہب عالم کو متاثر کیا جس طرح اس نے انسانی قلوب میں جگہ پیدا کی اور جس طرح اس نے اپنے پیرووں کو کشمکش حیات میں قوت عطا کی اس کا حال آپ اسلام کے باب میں پڑھیں گے لیکن یہاں ایک اہم نکتہ کی طرف اشارہ ضروری ہے تاکہ مذہب کے اس جامع عقیدہ کے تاریخی پس منظر کو سمجھا جا سکے۔

## اسلام کا پس منظر

اسلام کا آغاز جس دور میں ہوا وہ نوع انسانی کے اجتماعی دور کا وہ نقطہ عروج ہے جس کو فکری اور عملی یا مذہبی یا سیاسی حیثیت سے عالم کا عہد شباب کہا جا سکتا ہے۔ مذہبی حیثیت سے دنیا کے تمام موجودہ بڑے مذاہب نہ صرف دنیا میں پیش ہو چکے تھے بلکہ وہ ربع مسکون کے بڑے حصے میں شائع اور مستحکم ہو گئے تھے دنیا کی قدیم اور شاندار تہذیبوں نے جن نئی اور ترقی یافتہ تہذیبوں کو پیدا کیا تھا وہ چینی، ہندوستانی، ایرانی اور یونانی تہذیبوں کی صورت میں اپنے درجہ کمال کو پہونچ چکی تھیں نیز اجتماعی زندگی قبائلی عملداریوں سے آگے بڑھکر بڑی بڑی شہنشاہیتوں چالوکیہ، گپتا، رومی اور ایرانی شہنشاہیتوں کی صورت میں دنیا کے سامنے آچکی تھیں۔ الغرض عظیم الشان مذاہب، زبردست تہذیبیں اور ان کی نمائندہ بڑی بڑی اور جہانگیر سلطنتیں حیات انسانی کے تمام ممکنہ پہلوؤں اور تقاضوں کے ساتھ برسر پیکار تھیں۔ ان عوامل سے جو ماحول پیدا ہو گیا تھا اس سے دنیا میں وہ تمام طاقتور نظریات اور قوتیں برسر کار آگئی تھیں جو نسل انسانی کی قسمت کے سنوارنے یا بگاڑنے کا سامان کر رہی تھیں۔ ان متضاد نظریات اور عوامل کی باہمی چپقلش بمصداق

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی　　ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا　(غالب)

نوع انسانی کی کامیابی اور ناکامی کے امکانات پیدا کر رہی تھی۔ اس عالم میں اسلام دنیا میں آیا ؎

جب اپنی پوری جوانی پہ آگئی دنیا　　تو زندگی کے لئے آخری پیام آیا　(جوہر)

لیکن یہ آخری پیام صورت حال کا صرف فوری ردعمل یا منفی علاج نہ تھا بلکہ ایک فطری اور مثبت عقیدہ تھا جو صدیوں سے انقلابات عالم کی آغوش میں پرورش پا رہا تھا ؎

نخل اسلام نمونہ ہے برومندی کا　　پھل ہے یہ سینکڑوں صدیوں کی چمن بندی کا　(اقبال)

## ایک نیا عنصر

عیسائیت کے نظریہ علیحدگی اختیار کرنے کے بعد بھی اگرچہ سامی مذاہب کا جامع تر نظریہ دین بحیثیت مجموعی اپنی جگہ پر باقی رہا لیکن اس نے آگے بڑھ کر حالیہ صدیوں میں ایسے تصورات کو طاقت بخشی جس نے اسلام کے جامع تر نظریہ دین کی افادیت کو اجاگر کر دیا ہے۔

سترھویں صدی کے بعد عیسائی اقوام سیاسی و معاشی حیثیت سے دنیا پر غالب آگئیں اور کلیسا کو اس کی تنگ نظری اور

رجعت پسندی کے باعث ہی) بالکل بے طاقت کر کے گوشہ نشین کر دیا گیا اور عملی و اجتماعی زندگی میں لادینیت (SECULARISM) کے فلسفہ کو حکمراں بنا دیا گیا۔ اس سے گو مغرب کی عیسائی اقوام کو اپنے متصادم مفادات کو ہم آہنگ بنانے اور کلیسا کی ارتجاعی طاقتوں سے چھٹکارا حاصل کرنے میں مدد ملی اور اس کے لئے عالمی غلبہ اور استحصال کا راستہ صاف ہوا لیکن اس نے اور خصوصاً صنعتی ترقی نے ملک کی معیشت کو ایک خاص سانچہ میں ڈھالا جس نے طبقاتی مسئلہ کو پیدا کیا جس پر بے طاقت مذہب کا کوئی موثر قابو نہ ہو سکتا تھا۔ اس طبقاتی کشمکش نے بالآخر ایک نئے فلسفے اور مذہب (اشتراکیت) کو جنم دیا جو اب ہمارے زمانے کی ایک عالمگیر اور قابل لحاظ قوت ہے۔ اگر ہم مذہب کی محدود اور روایاتی تعریف کے پابند نہ ہوں تو پھر یہ قرار دینا مشکل ہے کہ اشتراکیت بھی ایک مذہب نہیں ہے۔ اگر بت پرستی اور اسلاف پرستی مذاہب ہیں، تاؤ مت کنفیوشی مت اور شنٹو مت مذاہب ہیں؟ ہندو مذہب اور بدھ مت مذاہب ہیں اور اسی طرح الہامی مذاہب بھی مذاہب ہیں؟ تو ان کا قدر مشترک کیا ہے؟ خدا کا تصور؟ یہ مذاہب عالم کا کوئی مشترک تصور نہیں۔ مذہبی مراسم اور اعمال بھی مشترک کسوٹی نہیں۔ البتہ ان سب میں جو چیز مشترک ہے وہ صرف ایک ایسا غیر متزلزل ہمہ گیر اور مرکزی ایقان (ایمان) ہے جو انسان کے تمام میلانات و رجحانات اور وظائف و اعمال کا سرچشمہ ہو۔ اگر یہ تعریف صحیح ہے تو جس طرح وہ ایک خدا کا تصور ہو سکتا ہے متعدد خداؤں کا بھی ہو سکتا ہے اور سرے سے انکار خدا بھی۔ یہ اور بحث ہے کہ خدا کا تصور ہی در اصل انسان کے انفرادی و اجتماعی مفادات کے باہمی تضاد کو دور کرتا اور ان کے تصادم کو روک کر ان میں کامل ہم آہنگی پیدا کرتا ہے لیکن علمی اور سائنٹفک حیثیت سے اس امر سے انکار مشکل ہے کہ مذہب سے مراد وہ ایقان اور عقیدہ ہے جو انسانی اعمال کا سرچشمہ اور محرک ہو۔ بنا برآں اشتراکیت بھی کم از کم دہریت۔ بت پرستی یا ہندو مذہب کی سطح پر ہر ایک مذہب ہے۔ اسلئے کہ کمیونزم کا عقیدہ بھی اپنے پیروؤں کو اسی طرح متحرک کرتا ہے جس طرح کوئی اور مذہب اپنے پیروؤں کو اور جس طرح دیگر مذاہب کے پیرو اپنی زندگی کے ہر گونہ معاملات کو اپنے مذہبی اصولوں کے تحت طے کرتے ہیں اسی طرح ایک اشتراکی بھی اپنی زندگی کے مسائل کو حل کرتا ہے۔ ایک اشتراکی کا معیار حق و باطل بھی بنیادی طور پر کمیونزم کے مسلمات اور اقدار سے متعین ہوتا ہے۔ ان کے اندر بھی اپنے عقیدہ کے لئے قربانی کا وہی جذبہ پایا جاتا ہے جو دوسرے مذاہب کے پیروؤں میں پایا جاتا ہے یہ بالکل جداگانہ بحث ہے کہ کمیونزم کا عقیدہ اور فلسفہ غلط ہے وہ باطل مذہب ہے لیکن یہ تو ایک زندہ حقیقت ہے کہ اشتراکیت وسیع ترین اور لچکدار معنی میں اسی طرح ایک مذہب ہے جس طرح دنیا کے وہ دیگر مذاہب جو الہامی نہیں ہیں۔

[ہمیں افسوس ہے کہ جگہ کی قلت کی وجہ سے کتاب کے باب اول کا صرف اسی قدر حصہ شائع ہو سکا ہے۔
(طلوع اسلام]

---x---

# دعوتِ انقلاب

(ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب ۔ صدر تحریک جمہور ملت)

ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب سابقہ تحریک خاکساران کے گرم جوش کارکن اور جمہور اسلام پارٹی کے صدر ہیں ۔۔۔ دماغ ٹھنڈا ۔۔۔ دل گرم ۔ جگر پرخوں ۔ نگاہ روشن ۔۔۔ سینہ میں ولولہ ۔۔۔ بازوؤں میں قوتِ عمل ۔۔۔ ایران سب حرارتوں اور تلاطم انگیزیوں کے ساتھ، چٹان کی طرح خاموش ۔۔۔ قرآن کے ساتھ انھیں والہانہ عشق ہے اور اس کے نظام کو عملی شکل میں دیکھنے کے لیئے دل میں بجید تڑپ ۔ انھوں نے سابقہ تحریک خاکساران کے باقیات الصالحات کو ایک نقطہ پر مرکوز کر کے، ان کی قوتوں کو قرآنی سواحل میں محصور کرنے کا عزم کیا ہے ۔ اس مقصد کے لئے انھوں نے "جمہور ملت" کے نام سے ایک جدید تحریک کا آغاز کیا ہے ۔ گذشتہ فروری میں لاہور میں اس تحریک کا پہلا کنونشن منعقد ہوا جس میں ڈاکٹر صاحب نے " دعوتِ انقلاب " کے عنوان سے صدارتی خطبہ پڑھا ۔ یہ خطبہ ایسا ہے جسے پڑھنے کے بعد، ہمارا خیال ہے کہ قارئین طلوع اسلام میں سے ہر ایک بے ساختہ پکار اٹھے گا کہ

میں نے یہ سمجھا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

ہم اس خطبہ کو بمسرت طلوع اسلام میں شائع کرتے ہیں۔

بعض مقامات پر ڈاکٹر صاحب کے لب و لہجہ میں تلخی آ گئی ہے ۔ اس میں شبہ نہیں کہ نوا کی یہ "تلخی"، ذوقِ نغمہ کی کمیابی کی وجہ سے ہے۔[1] لیکن اس کے باوجود، ہم سمجھتے ہیں کہ ایسے مقامات پر بھی وہی ہدایت سامنے رکھنی چاہیئے جو صاحبِ ضربِ کلیم کو فرعون کی طرف جاتے وقت ملی تھی اور جس میں کہا گیا تھا کہ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا

---

[1] نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی۔

لَعَلَّهٗ یَتَذَكَّرُ اَوْ یَخْشٰى (۲۰/۴۴)۔ "تم (دونوں بھائیوں نے) اس سے نرمی سے بات کرنا۔ شاید اس سے وہ نصیحت پکڑے یا اپنے (جرائم کے عواقب سے) اسے ڈر آجائے" اور یوں سیدھا راستہ اختیار کرے۔ طلوعِ اسلام]

---

صدرِ محترم و برادرانِ عزیز و جلیل!

"جمہور ملت کنونشن" کے اس یادگار اجتماع میں آپ سب حضرات کی شرکت فرمائی اس لحاظ سے انتہائی مسرت کا سامان ہے کہ نئی اُمنگیں اور نئے عزائم لے کر آپ ملک کے دور دراز گوشوں سے یہاں جمع ہوئے ہیں۔ آپ نے مختلف پلیٹ فارموں سے سالہا سال تک اپنی ملت کی سربلندی اور اس کے دکھ دور کرنے کے لئے جانیں لڑائی ہیں۔ مصائب برداشت کئے ہیں۔ طوفانوں کا مقابلہ کیا ہے۔ آپ کی قربانیوں سے یہ بدنصیب اور فریب خوردہ قوم حیاتِ تازہ حاصل کرتی رہی اور پھر یہ بھی ہوا کہ قیادت کی خود غرضی اور بے ضمیری نے آپ کے عزائم کو مضمحل کر دیا۔ اور آپ مایوسیوں کا شکار ہو گئے۔ لیکن آج کا یہ منظر قلب و نظر کے لئے کس قدر زندگی بخش ہے کہ اس عالم میں جب آپ کو قوم کی بگڑی بنانے کے لئے پکارا گیا تو آپ پھر ایک نئی تڑپ لے کر اس امید سے یہاں پہنچ گئے کہ شاید قوم کی مصیبتیں ختم کرنے کے لئے آپ کا خلوص و ایثار کسی کام آجائے۔

میں اس کنونشن میں ان مجاہدوں کو بھی ایک بڑی تعداد میں دیکھ رہا ہوں جو میں پچیس برس پہلے غلبۂ اسلام کا پرچم لے کر اٹھے تھے اور متحدہ ہندوستان کی اس سلطنت کو دوبارہ حاصل کرنے کے لئے جو مسلمانوں سے چھن کر غیر ملکیوں کے ہاتھ میں جا چکی تھی۔ انھوں نے سرفروشانہ تحریک کا آغاز کیا اور حصولِ مقصد کے لئے اس قافلے نے جو قربانیاں کیں تاریخ کا مؤرخ انھیں کبھی فراموش نہیں کرے گا لیکن ایسے مہیب اور پرخطر سنگِ راہ ان کے قدموں میں حائل تھے۔ کہ انھیں قدم قدم پر ٹھوکریں کھانی پڑیں۔ بے تدبیریوں کی وجہ سے راستہ چلنا دشوار ہو گیا اور بالآخر یہ قافلہ تھک تھک کر نڈھال اور منتشر ہو گیا۔ تن آسان اور آرام طلب قوم ان کٹھن راہوں میں قافلے کا ساتھ دینے کے لئے تیار نہ ہوئی اور اس نے پورے ہندوستان کی بجائے اس کے ایک ٹکڑے کے حصول پر قناعت کر لی۔ بہرحال ملک تقسیم ہو گیا[1]۔

## نئے حالات اور نئے تقاضے

مجھے ان ایثار پیشہ بھائیوں سے یہ مخلصانہ گذارش کرنے کی اجازت دیجئے کہ اب زمانے کے تقاضے بدل گئے ہیں اور پاکستان کے تحفظ، اس کی تعمیر اور بقا و استحکام کا مسئلہ ایک فوری نصب العین کی طرح اُبھر کر سامنے آگیا ہے۔ کسی چھت پر چڑھنے کے لئے سیڑھی کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن اگر سیڑھی میسر نہ ہو اور اعضاء کمزور ہوں تو محض چیخ و پکار مچانے سے چھت پر چڑھا نہیں جا سکتا۔ لہٰذا اب پاکستان کو مضبوط کئے بغیر

---

[1] خدا کا شکر ہے کہ ملک تقسیم ہو گیا ورنہ اگر ساری قوم اپنی بے تدبیریوں میں اُلجھ جاتی جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے تو آج ہماری جو حالت ہوتی اس کا تصور ہندوستان کے مسلمانوں کی موجودہ حالت سے کیا جا سکتا ہے۔ طلوعِ اسلام

انبیاء سے نبٹنے کی باتیں مجذوب کی بڑ سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتیں۔ فکر و عمل کی سیدھی اور صاف راہ اب یہی ہے کہ قیامِ پاکستان کے حقیقی مقاصد کو سامنے رکھ کر صحیح اسلامی معاشرے کے قیام کے لئے جدوجہد کا آغاز کیا جائے اور ہر اس عنصر کی طرف دستِ تعاون بڑھایا جائے جو اسی نقطۂ نظر سے تعمیرِ پاکستان کا حامی ہو۔ تاریخ بتا رہی ہے کہ رسول خدا نے ہجرت کے بعد مدینے پہنچ کر اپنے معاشرے کی تنظیم و استحکام اس حد تک پہنچا دی تھی کہ فتح مکہ کی منزل تک پہنچنا ممکن ہو گیا۔ چنانچہ معاشرے کی تنظیم کو آپ کے کامیاب سفر کی پہلی منزل بننا چاہیئے۔

حضرات! آپ کو بخوبی معلوم ہے کہ تحریکِ پاکستان کا مقصد ایسا خطۂ زمین حاصل کرنا تھا جہاں مسلمان اپنے مخصوص نظریۂ حیات کے مطابق زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکیں۔ گویا اسلامی طرزِ زندگی اصل نصب العین تھا اور ملک کا حصول اس کا ذریعہ۔ اسے ایک حادثہ سمجھئے کہ حصولِ پاکستان کے بعد یہ نصب العین نگاہوں سے اوجھل ہو گیا اور لوٹ کھسوٹ، نفع بازی اور اقربا نوازی نے اس کی جگہ لے لی۔ اس صورتِ حال نے واضح کر دیا کہ "پاکستان کا مطلب کیا لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ" کا نعرہ لگانا تو آسان تھا لیکن لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ یعنی اسلامی نظامِ حیات کا تصور نہ عوام کے ذہنوں میں تھا اور نہ برسرِ اقتدار طبقہ کے۔ صدیوں کے دورِ ملوکیت کی تہرمانیوں اور انگریز کی غلامی نے آہستہ آہستہ یہ تصور ہی ختم کر دیا تھا کہ اسلامی معاشرہ کے خط و خال کیا ہوتے ہیں۔ اس سوسائٹی کے افراد میں تعلقات کی نوعیت کیا ہوتی ہے۔ قرآن اس معاشرہ میں مسائلِ زندگی کے حل کا کیا طریق بتاتا ہے۔ قومیں کن نظریات کے زور پر زندہ رہتی ہیں۔ اور کن اصولوں کو چھوڑنے سے ان کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ مُلّا کے ذہن میں اسلامی سلطنت کا تصور چند شرعی قوانین تک محدود تھا۔ اور بس۔ اس کے نزدیک ارتفاقی مسائل کو حل کرنے کے لئے کسی قسم کی سوچ بچار کی ضرورت ہی نہیں۔ اس کے خیال کے مطابق ہمارے فقہ و روایات کی کتابوں میں ہر مسئلے کا طے شدہ حل پہلے سے موجود ہے۔ انگریزی تعلیم یافتہ اور دین سے نابلد طبقے کا طرزِ عمل مُلّا کے اس طرزِ فکر کے شدید خلاف تھا، وہ اسلامی ریاست کے تصور کا مذاق اڑاتے رہے۔ وہ دینِ اسلام کا نام لینے والوں کو جذباتی بے وقوف (sentimental Fool) اور مذہبی انتہا پسند (Religdus Extre Mcst) کہہ کر پکارتے رہے۔

یہ تو تھے عوام۔ اب رہے وہ خواص جن کے ہاتھوں میں ملک کی زمامِ اقتدار آئی۔ ان کی پریشان خیالی عوام سے بڑھ کر تھی۔ ملک حاصل کرنے کے بعد انھوں نے سمجھ لیا کہ ہم منزلِ مقصود کو پا چکے ہیں۔ چنانچہ موقع کو غنیمت جان کر انھوں نے ہر جائز و ناجائز طریق سے ملکی دولت کو سمیٹنا اور اسے ملکی و غیر ملکی بنکوں میں بھرنا شروع کر دیا۔

مملکت کے یہ خواص جنھیں آئینِ مملکت کی ترتیب کی ذمہ داری بھی حاصل تھی۔ انھوں نے آٹھ برس کی طویل اور قیمتی مدت ذہنی پریشانی میں گذار دی۔ ان بزرگوں میں اکثر حضرات کا علم اپنے متعلق، اپنی تاریخ کے متعلق، اسلام اور اس کے فلسفۂ حیات کے متعلق، غیر قوموں کی تاریخ اور عروج و زوال کے متعلق محض سطحی سا تھا۔ ان میں اکثر وہ لوگ تھے جن کے آباؤ اجداد نے ضمیر فروشی اور قومی غداری کے عوض انگریز سے جاگیریں حاصل کی تھیں اور اپنی روایتی شان و شوکت اور اجارہ داری کو قائم رکھنے کے لئے وہ

بہرنوع پاکستان کی حکومت سے چمٹ گئے تھے۔ بلکہ اب تک چمٹے ہوئے ہیں۔ ایسے حضرات بھلا قرآن اور اسلام کی عالم آرا حقیقتوں کو کیا سمجھ سکتے تھے۔ اور ایک اسلامی آئین کی ترتیب و تدوین بھلا کیونکر اُن سے ممکن تھی۔ آخر آٹھ برس کے بعد ان کے ہاتھوں ملک کا جو آئین مکمل ہو کر منظرِ عام پر آیا تو اس کے سرورق پر قرآن و سُنّت کے الفاظ اس طرح تبرکاً لکھ دیئے گئے جس طرح خط لکھتے ہوئے ۷۸۶، لکھ دیا جاتا ہے اور ۷۸۶، کا خط کے نفسِ مضمون سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ چونکہ اس دوران میں ملک کی زمامِ اقتدار مذکورہ قسم کے نااہل، بددیانت اور خود غرض لوگوں کے ہاتھوں میں رہی اس لئے ملک کے سیاسی، اقتصادی اور اخلاقی حالات دن بدن بگڑتے چلے گئے اور قوم کی خوشحالی اور سربلندی کی تمام امیدیں ماند پڑتی گئیں۔

اس پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے یہ سوال لازماً اُبھرتا ہے کہ ذلت و خواری اور ذہنی انتشار کی جس فضا میں ہم گھرے ہوئے ہیں اس سے نجات کی بھی کوئی صورت باقی ہے یا ہم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے موت کے چنگل میں گرفتار ہو چکے ہیں۔ حضرات! پیشتر اس کے کہ ہم اس اہم سوال کا جواب دینے کے قابل ہو سکیں یہ سمجھنا ضروری ہوگا کہ کسی قوم کی موت و حیات کا مفہوم کیا ہے؟

## قوموں کی موت و حیات

اس حقیقت کو یاد رکھئے کہ ہر قوم کا ایک مخصوص نصب العین ہوتا ہے اس نظریۂ زندگی کو دورِ حاضرہ کی اصطلاح میں اس قوم کا کلچر یعنی ثقافت کہتے ہیں۔ لہٰذا ایک قوم کی موت سے مراد دراصل یہ ہوتا ہے کہ وہ قوم جس کلچر کی علمبردار تھی اس میں اتنی صلاحیت باقی نہیں رہی کہ وہ زمانے کے تصادمات اور بدلتے ہوئے تقاضوں کا مقابلہ کر سکے یا پھر یہ کہ وہ اپنے کلچر سے ہی بیگانہ ہو گئی۔ دنیا میں مختلف اقوام کے کلچر اور زمانے کے تقاضوں میں مسلسل کشمکش جاری ہے جب تک ایک کلچر ان تقاضوں کا مقابلہ کرتا رہتا ہے اس کی حامل قوم زندہ رہتی ہے جب زمانے کے تقاضے اس پر غالب آجاتے ہیں تو قوم مصافِ زندگی میں پچھڑ جاتی ہے۔

(۱) قرآن اقوامِ عالم کو یہ کہتا ہے کہ کسی قوم کو اپنی زندگی قائم رکھنے کے لئے اس اٹل قانون کی اتباع ضروری ہے مقدس آرزوؤں کے سہارے کسی قوم کا زندہ رہنا ممکن نہیں۔ کائنات میں نہ کہیں دھاندلی ہے اور نہ لاقانونیت۔ یہاں قوموں کی زندگی اور موت کے فیصلے خدا کے مقررہ قاعدے اور قوانین کے تحت علیٰ وجہ البصیرت ہوتے ہیں۔ ہیگل کا فلسفہ یہ ہے کہ ایک نظریہ پیدا ہوتا ہے پھلتا اور پھولتا ہے جب وہ شباب تک پہنچتا ہے تو اس کے اندر سے ایک اور نظریہ اُبھرتا ہے جو اس کی ضد ہوتا ہے اور وہ سابقہ نظریہ مضمحل ہونا شروع ہو جاتا ہے اور اس کی بجائے نیا نظریہ پروان چڑھنے لگتا ہے۔ مارکس نے کہا کہ یہ کشمکش نظریات میں نہیں بلکہ نظامہائے زندگی کے درمیان ہوتی ہے۔ ایک دور میں زندگی کا ایک نظام کارفرما ہوتا ہے کچھ عرصہ بعد اس کے اندر سے ایک نیا نظام پھوٹتا ہے جو اس پہلے نظام کی ضد ہوتا ہے یہ نظام اپنے سابقہ نظام کی جگہ لے لیتا ہے اور اس طرح یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ مارکس کے نزدیک کوئی تصور یا نظام ذاتی طور پر اچھا یا بُرا نہیں ہوتا نہ کسی نظام کو دوسرے نظام پر فوقیت ہوتی ہے یعنی دوسرے لفظوں میں کسی ایک نظام میں ذاتی طور پر یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ ہمیشہ کے لئے باقی رہے۔

اس کے برعکس قرآن بھی کلچرز کے عدم و ثبات کا ایک فلسفہ پیش کرتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ یہاں تک تو بات ٹھیک ہے کہ

دنیا میں متضاد نظریات کی کشمکش جاری ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں کہ ایک نظریئے کو دوسرے پر کوئی فوقیت نہیں ہوتی بلکہ ایک نظریہ ایسا ہوتا ہے جس میں بنیادی طور پر غالب آنے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے اور دوسرا وہ جس میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی۔ اول الذکر نظریئے کو وہ "حق" کہہ کر پکارتا ہے یعنی ایسا نظریہ جس پر عمل کرنے سے مثبت نتائج پیدا ہوں اور ثانی الذکر کو باطل یعنی ایسا نظریہ جس پر عمل کرنے سے منفی نتائج پیدا ہوں۔ حق و باطل کی یہ کشمکش ہمیشہ جاری رہتی ہے اور حق ہمیشہ غالب آتا ہے۔ یہی وہ بنیادی اختلاف ہے جو اسلام کو کمیونزم کی ضد قرار دیتا ہے چنانچہ ازروئے قرآن جس قوم کے اعمال مثبت نتائج پیدا کر رہے ہوں وہ زندگی کی طرف جاتی ہے اور جس قوم کے اعمال سے منفی نتائج مرتب ہوں وہ موت کا رُخ کرتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ بعض اوقات کوئی قوم یا گروہ کچھ قوت جمع کر لیتا ہے اور اس کے ذریعہ وقتی اقتدار حاصل کر لیتا ہے۔ لیکن یہ ایک ہنگامی حادثہ ہوتا ہے جو ایک شعلہ کی طرح بھڑک کر فوراً خاموش ہو جاتا ہے۔ جسے حقیقی معنوں میں قوموں کا عروج و زوال کہتے ہیں وہ ارتقائی طور پر نمودار ہوتا ہے۔ اور پھر تدریجی طور پر سمٹ کر پیچھے ہٹ جاتا ہے۔

(۲) دوسری بات قرآن یہ کہتا ہے کہ جو کلچر انسانی زندگی کو حیوانی سطح پر رکھتا ہے اسے ثبات و بقار نصیب نہیں ہوتی اور وہ کلچر باطل کا حامل ہوتا ہے۔ قرآن کی رُو سے انسان اور حیوان میں اتنا ہی فرق نہیں کہ انسان سلسلۂ ارتقار میں حیوان سے اگلی کڑی ہے بلکہ اس کے نزدیک زندگی انسانی سطح پر پہنچ کر ایسے امتیازات کی حامل ہو جاتی ہے جو حیوانی سطح پر قطعاً موجود نہیں ہوتے۔ انہی امتیازات کا نام شرفِ انسانیت ہے۔ ہمارے دور میں اس نظریۂ زندگی کو جو انسانی زندگی کو محض حیوانی زندگی کی ایک بڑھتی ہوئی شکل قرار دیتا ہے اور اس کے نزدیک خورد و نوش سے بالاتر کوئی دوسرا نصب العین نہیں مادی نظریۂ زندگی کہتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ اس نظریئے کی حامل قومیں خواہ کتنی ہی قوت اور ساز و سامان کیوں نہ جمع کر لیں صحیح معنوں میں کامیاب و کامران نہیں ہو سکتیں۔

(۳) اس کے بعد قرآن نے یہ اصول بیان کیا کہ جس نظام میں حالت یہ ہو کہ نچلا طبقہ دن رات محنت کرے اور اوپر کا طبقہ ان کی محنت پر مفت عیش اڑائے وہ نظام کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ ایسا نظام جس کی بنیاد حق پر قائم ہو اس میں یہ کبھی ممکن ہی نہیں کہ ایک محنت کش طبقہ کے خون کی رنگینی دوسرے بیکار طبقہ کی عشرت گاہوں کی آرائش میں صرف ہو۔ ایسے فاطر نظام میں اوپر کا طبقہ یہ گمان کر لیتا ہے کہ انھیں کوئی پوچھنے والا ہی نہیں۔ وہ اپنے آپ کو قانون کی زد سے بالاتر سمجھتے ہیں اور ایسی تدابیر اختیار کئے رہتے ہیں جن سے وہ قانون کی گرفت میں ہی نہ آسکیں اور اگر کہیں ایسا ممکن نہ ہو تو پھر وہ قوانین ہی ایسے وضع کر لیتے ہیں جن کی رو سے وہ سب کچھ جائز قرار پا جائے (اَلَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ وَ یَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ) چنانچہ نظام سرمایہ داری میں یہی کچھ ہوتا ہے اور اوپر کا طبقہ اس قسم کے قوانین بنا لیتا ہے کہ وسائلِ پیداوار پر انفرادی ملکیت بغیر کسی حد بندی کے جائز ہو۔ دوسری طرف وہ اربابِ شریعت کو اپنے ساتھ ملا لیتا ہے اور وہ اس کے حق میں یہ فتویٰ صادر کر دیتے ہیں کہ ذاتی ملکیت پر حد بندی عائد کرنا مداخلت فی الدین ہے اس طرح یہ سب کچھ قانوناً اور شرعاً جائز قرار پا جاتا ہے۔

اور اس کے متعلق کچھ پوچھنے کا سوال باقی نہیں رہ جاتا۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ ان حیلوں، بہانوں، روباہ بازیوں، خدا فریبیوں اور خود فراموشیوں سے تم خدا کے قانونِ مکافات کی گرفت سے نہیں بچ سکتے۔ نظامِ سرمایہ داری کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ ایک طبقہ محنت کرتا ہے اور دوسرا اس کی محنت پر مفت عیش اڑاتا ہے۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ایک طبقہ دولت کو سمیٹ کر اپنے لئے مخصوص کرتا جاتا ہے اور اسے نوعِ انسانی کی نشو و نما کے لئے کھلا نہیں رکھتا۔ اسے قرآن کی اصطلاح میں بخل کہا گیا ہے قرآن کہتا ہے کہ جو قوم بخل کے نظریے کو دلیلِ راہ بنائے وہ کبھی زندہ و پایندہ نہیں رہ سکتی اسے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا جاتا ہے اور دوسری قوم آگے بڑھ کر اس کی جگہ لے لیتی ہے۔

## اسکیمیں اور عمل

(۴) اس کے بعد قرآن ایک ایسی حقیقت کو سامنے لاتا ہے جس میں قوموں کی موت و حیات کا وہ رازِ پوشیدہ ہے جس کی تہہ تک بہت کم نگاہیں پہنچتی ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ ہر پروگرام کے دو حصے ہوتے ہیں پہلا حصہ پلان یا اسکیم کا ہوتا ہے اس میں پروگرام کے مختلف پہلوؤں پر فکری طور پر غور و خوض کیا جاتا ہے اس کی عملی تقسیم کے مختلف نقشے بنائے جاتے ہیں۔ اس پر پوری بحث و تمحیص کی جاتی ہے۔ یہ حصہ محض لفظوں، باتوں کا غذوں اور لکیروں پر مشتمل ہوتا ہے۔ لیکن اس پروگرام کی تکمیل کے لئے یہ بھی نہایت ضروری ہے کہ جب اس حصے کی تکمیل ہو جاتی ہے تو پھر عملی پروگرام شروع ہو جاتا ہے اور جو باتیں پہلے الفاظ میں محدود تھیں وہ رفتہ رفتہ محسوس شکل میں ظہور پاتی ہیں۔ جو قوم اس طرح پروگرام مرتب کرتی اور پھر انھیں عملی جامہ پہناتی چلی جاتی ہے وہ کامیاب و کامران رہتی ہے اور جو قوم ساری عمر اسکیمیں بناتی رہے اور عملاً ایک قدم نہ اٹھائے وہ تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ خواہ اس کی فکر کتنی ہی بلند کیوں نہ ہو۔ بالفاظِ دیگر قومیں محض فلسفے کے سہارے زندگی کی آب و تاب قائم نہیں رکھ سکتیں۔ زندگی عمل سے بنتی ہے اور عمل کی جولانیاں ہی اسے نشو و ارتقاء کی معراج کی طرف بڑھائے لئے جاتی ہیں۔ مردہ قوم کے مفکر فلسفیانہ مسائل حل کرنے میں ہی دماغ سوزی اور کاوش کرتے رہتے ہیں۔ اس کے لیڈر اسکیموں کی تیاری بیان بازی اور تقریروں میں سرگرم رہتے ہیں اور سب اس گمان کا شکار رہتے ہیں کہ وہ کارہائے نمایاں سرانجام دے رہے ہیں۔ حالانکہ مفکرین کا فکر اور لیڈروں کے الفاظ آج تک کسی قوم کو موت سے نہیں بچا سکے۔ جو قوم عملی مسائل سے آنکھیں بند کر کے نظری مباحث میں اُلجھ گئی اس کی موت کا حادثہ بالآخر یقینی صورت اختیار کر گیا۔

(۵) اب ایسی حقیقت کا ایک دوسرا رخ سامنے لائیے زندگی کا تعلق بیشتر ان معاملات سے ہوتا ہے جن کی کوئی نہ کوئی افادی حیثیت ہو لیکن انسانی طبیعت ایسی واقع ہوئی ہے کہ اسے کام کے ساتھ اعصاب کے سکون کی بھی ضرورت ہے۔ فنونِ لطیفہ کا زیادہ تر تعلق زندگی کے اسی پہلو سے ہے انسانی زندگی میں عمل کی حیثیت اگر پٹرول کی سی ہے تو فنونِ لطیفہ کی موبل آئل کی۔ اس سے زندگی کے پُرزے لچکدار رہتے ہیں۔ لیکن اگر موٹر میں پٹرول کی جگہ بھی موبل آئل ڈال دیا جائے گا تو گاڑی ایک قدم نہیں چل سکتی۔ یہی صورت ان قوموں کی ہے جو زندگی کے پہلو کو نظر انداز کر کے ساری توجہ فنونِ لطیفہ پر مرکوز کر دیتی ہیں۔ تاریخ کے

اوراق سے یونان کی مثال سامنے لائیے اس قوم کے مفکرین کا شمار دنیائے فکر کی صفِ اوّل میں ہوتا ہے اس کے ساتھ ہی فنونِ لطیفہ (مجسمہ تراشی، مصوری اور شاعری) میں بھی وہ جس معراجِ کمال تک پہنچ چکے تھے اس کی مثال اور کہیں موجود نہیں۔ لیکن عملی اور مادی حیثیت سے ان کا حال یہ تھا کہ وہ اپنے ہاں ایک سوئی بھی تیار نہ کر سکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ قوم زوال کی پستیوں میں اس طرح گری کہ اُسے پھر اُبھرنا نصیب نہ ہوا اسی بنا پر قرآن کہتا ہے کہ زندگی مسلسل جدوجہد کا نام ہے۔ جو قوم جس سانس میں جدوجہد سے جی چُراتی ہے اُسی سانس میں اس پر موت طاری ہونی شروع ہو جاتی ہے۔ موت در اصل نام ہی ترکِ جہاد کا ہے۔

## نجات کی صورت

اب دوبارہ اس اصل سوال کی طرف آئیے۔ جس کی ذلت اور شکست میں ہم آج گر چکے ہیں اس سے نجات کی کوئی صورت بھی ہے۔ قرآن جو مایوسی کی تاریکیوں میں رُشد و ہدایت کا ضو فشاں مینار ہے ببانگِ دُہل اعلان کرتا ہے کہ مایوسی کی کوئی بات نہیں۔ اگر تمہارا نظریۂ حیات حق پر مبنی ہے یعنی ایسا ہے جس پر عمل پیرا ہونے سے مثبت نتائج پیدا ہو سکتے ہیں۔ اگر تمہاری زندگی شرفِ انسانیت کی حامل ہے اور تم مادی نظریۂ حیات کے قائل نہیں۔ اگر تمہارے معاشرے میں کوئی مفت خور طبقہ محنت کشوں کی محنت پر نہیں پلتا۔ اگر تمہارے نظام میں دولت در زق پر چند سرمایہ داروں کی اجارہ داری قایم نہیں بلکہ اس کے سرچشمے مفادِ عامہ کے لئے کھلے ہیں۔ اگر تمہارے معاشرے میں اسکیموں کی نمائش اور تقریر بازیوں کا جادو نہیں بلکہ عمل کی جولانیاں بھی حرکت میں ہیں اگر تم جدوجہد اور عمل کی رزمگاہوں سے دامن بچا کر شعر و شاعری اور رقص و سرود کے لئے وقف نہیں ہوئے تو پھر یقین کرو کہ تم زندہ قوموں کی صف میں کھڑے ہو سکتے ہو۔ تم عروج و اقبال کے پرچم بلند کر سکتے ہو اور زندگی کی خوشگواریاں اور کامرانیاں تمہارے قدم چوم سکتی ہیں۔

اس مرحلہ پر یہ سوال لازماً اُبھر کر سامنے آئے گا کہ یہ پاکستانی معاشرے کی اساس کسی ایسے نظریۂ حیات پر قائم ہے جو "حق" پر مبنی یعنی تعمیری اور مثبت نتائج کا سرچشمہ ہو؟ ہماری قومی تقدیر، ہماری زندگی اور موت بلکہ ہمارے مستقبل کا انحصار اسی اہم سوال کے جواب پر ہے۔

ہمارا ہر لیڈر اسٹیج سے یہ پکار تا سنائی دے گا کہ عوام میں بے چینی اور بددلی کار فرما ہے، رشوت ستانی، کنبہ پروری بددیانتی اور لوٹ کھسوٹ کا دور دورہ ہے برسرِ اقتدار طبقہ حکومت پر اپنی گرفت قائم رکھنے کے لئے ہر ناجائز طریقہ بروئے کار لارہا ہے کیا ان نوحہ خوانیوں اور تقریر بازیوں سے یہ برائیاں ختم ہو جائیں گی؟ حالانکہ جب یہی محرومِ اقتدار کھڑپنچ اور طالع آزما خود برسرِ اقتدار ہوتے ہیں تو معاشرے کی حالتِ زار کو فوراً نگاہوں سے اوجھل کر کے نشۂ اقتدار کی بدمستی میں کھو جاتے ہیں۔ اور جونہی اقتدار کی گدیاں اُن سے چھن جاتی ہیں معاشرے کی حالتِ زار اور عوام کے دُکھ انھیں یاد آنے لگ جاتے ہیں۔ مؤثر ترین ہتھیار جو صحیح اور تعمیری معاشرے کے قیام کا سامان بن سکتا تھا وہ ملک کا آئین تھا لیکن سطحی ذہن کے ان خود غرض اور بے اصول طالع آزماؤں نے آئین سازی کی جو مٹی پلید کی اُس کی داستانِ غم ساری قوم کے سامنے ہے۔

جب نعب العین پاکستان کو ایک اسلامی مملکت کی صورت میں ڈھالنا تھا تو پھر لازماً یہ سوال اُبھر ابھر کر سامنے آتا ہے کہ وہ نظریۂ حیات کیا تھا جو اسلام نے پیش کیا جسے ہمارے ملکی آئین کی اساس بننا ہے اور جس پر عمل پیرا ہو کر مثبت نتائج پیدا ہو سکتے ہیں اور ساری ملت وحدتِ فکر و عمل کے ایک مرکز پر جمع ہو سکتی ہے۔

## اسلامی آئیڈیالوجی کیا ہے؟

میں ضروری سمجھتا ہوں کہ وہی نظریۂ حیات جسے ہم اسلامک آئیڈیالوجی کہتے ہیں۔ چند نکات کی صورت میں آپ کے سامنے پیش کر دوں تاکہ اسی آئیڈیالوجی کی روشنی میں آپ اپنی قومی زندگی کے حسن و قبح کا جائزہ لے سکیں۔ اور اپنی منزل متعین کرنے میں وہ نشانِ منزل کا کام دے سکے۔

(۱) مسائلِ زندگی کا حل تنہا عقلِ انسانی نہیں کر سکتی۔ اس کے لئے وحی کی روشنی کی ضرورت ہے۔ غور فرمائیے برادران میں نے یہ نہیں کہا کہ عقل مسائلِ زندگی کا حل نہیں کر سکتی بلکہ کہا یہ ہے کہ عقل تنہا ایسا نہیں کر سکتی۔ قرآن تو اپنی دعوت ہی اُن لوگوں کو پیش کرتا ہے جو عقل اور بصیرت رکھتے ہیں۔ لیکن عقل کا طریق تجرباتی ہوتا ہے۔ مثلاً ایک انسان سوچ کر یہ فیصلہ کرتا ہے کہ یہ بات درست ہے لیکن مدت مدید کے تجربوں کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ اس کا پہلا فیصلہ غلط تھا۔ مثال کے طور پر ایک زمانے میں اس دنیا کے اندر ملوکیت کا دور دورہ تھا۔ لوگ بادشاہ کو خدا کا سایہ سمجھا کرتے تھے۔ صدیوں کے بعد یہ بات سمجھ میں آئی کہ یہ نظام غلط ہے۔ چنانچہ ملوکیت کی جگہ جمہوریت نے لے لی۔ لیکن یہ مغربی جمہوریت بھی آج جس دور سے گذر رہی ہے۔ وہ سب کے سامنے ہے اس میں شک نہیں کہ عقل کی مدد سے انسان بالآخر صحیح نتیجے تک تو پہنچ جاتا ہے لیکن اگر مسائلِ زندگی کو حل کرنے میں عقل وحی کی روشنی سے کام لے تو جتنا وقت اور جس قدر توانائی انسان تجربات میں خرچ کرتا ہے وہ تعمیری جدوجہد کے کام آ سکتی ہے۔ چنانچہ عقل کو وحی کی بعینہٖ اسی طرح ضرورت ہے جس طرح ایک تندرست آنکھ کو روشنی کی۔

(۲) خدا کی وحی ان اصولوں کو بیان کرتی ہے۔ جن کی رو سے ایک عالمگیر انسانی معاشرے کا قیام عمل میں آتا ہے۔

(۳) وحی کے متعین کردہ اصول تمام نوعِ انسانی کے لئے اٹل اور غیر متبدل ہوتے ہیں یہ محکم اور غیر متبدل اصول آج آسمان کے نیچے صرف قرآن کی دفتین میں محفوظ ہیں۔

(۴) ان ابدی اصولوں پر مشتمل تعلیم کا عمود یہ ہے کہ جس طرح خارجی کائنات میں ایک ہی قوت کارفرما ہے اسی طرح انسان کی اپنی دنیا میں بھی ایک ہی قانون نافذ العمل ہونا چاہیئے۔ یعنی تمام انسانوں کا ایک ہی معاشرتی نظام ہو اس معاشرتی نظام کو جو قرآن کے اصولوں پر قائم ہو دین کہتے ہیں۔

(۵) دین کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی رُو سے اسلامی مملکت کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ

(الف) وہ تمام افرادِ مملکت کی بنیادی ضروریاتِ زندگی بطریقِ احسن بہم پہنچائے۔

(ب) ہر فرد کی مضمر صلاحیتوں کی نشو و نما کے یکساں مواقع فراہم کرے۔

(۶) اس نظام کی بنیاد عدل اور احسان پر ہوتی ہے۔ عدل یہ ہے کہ سب کے لئے یکساں مواقع مہیا کئے جائیں۔ اور احسان یہ کہ جہاں کسی فرد میں کوئی کمی رہ جائے اس کو پورا کر کے معاشرے کا توازن برقرار رکھا جائے۔

(۷) اس معاشرے میں دل و دماغ کی تعمیر اس انداز سے کی جائے کہ ہر فرد اپنا یہ فریضہ سمجھے کہ اس کا کام دیگر افراد و معاشرہ کی نشوونما ہے۔

(۸) ہر فرد اس حقیقت پر یقین رکھے کہ انسان کا کوئی عمل بے نتیجہ نہیں رہ سکتا۔ اس کی ذات کی تعمیر یا تخریب اپنی اعمال پر موقوف ہے اور مکافاتِ عمل کا یہ سلسلہ انسانی زندگی میں ہر لحظہ جاری و ساری ہے۔ لیکن زندگی طبعی موت سے ختم نہیں ہو جاتی۔ بلکہ کاروانِ حیات نے طبعی موت کے بعد بھی اپنی منزلیں طے کرنی ہیں۔

برادران! اسلامی آئیڈیالوجی کے مذکورہ نکات کو سامنے رکھئے اور پھر غور فرمایئے کہ اگر مملکت افراد کی ضروریاتِ زندگی پورا کرنے اور ان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما کی ذمہ داری لے لے اور اس کے ساتھ ہر فرد معاشرہ کو یقین ہو کہ جس طرح انسانی جسم کے کسی ایک عضو کی تندرستی کا انحصار باقی اعضاء کی تندرستی پر ہے اگر کوئی ایک عضو بیمار ہو تو باقی سب اعضاء پر اس کا اثر پڑتا ہے۔ اسی طرح کسی دوسرے فرد کی نشوونما درا صل معاشرے کی نشوونما ہے۔ نہیں بلکہ یہ بلاواسطہ اس کی اپنی نشوونما ہے۔ تو ایسی صورت میں معاشرے کے اندر کسی بگاڑ کا امکان ہی باقی نہیں رہتا۔ اسی طرح اگر ہر فرد کو یقین ہو کہ اس کا ہر اچھا عمل اس کی ذات کے لئے مثبت نتیجہ پیدا کرے گا اور اس حقیقت پر بھی یقین ہو کہ طبعی موت کے بعد اس کا جسم تو ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کی ذات ختم نہیں ہوگی۔ تو وہ انسان برائی کی طرف رجوع ہی کیونکر کرے گا۔ اور اسے بھلا موت کی کیا پرواہ اور خوف ہوگا۔

اسلام نے موت کے چہرے کو انتہائی خوبصورت انداز میں دکھایا ہے اور یہی وجہ تھی جس کی بناء پر قرونِ اولیٰ کا مسلمان راہِ حق میں کفن بردوش جان کی بازی لگا دیتا تھا۔

برادران! یہی وہ صراطِ مستقیم تھا جس کی طرف اسلام اور قرآن نے نوعِ انسانی کی رہنمائی کی اور اس نے واشگاف الفاظ میں پکار پکار کر کہا کہ اس راہ پر تم نے اپنے قدم آگے بڑھائے تو منزلیں آگے بڑھ کر تمہارے قدم لیں گی مایوسیوں کے بادل چھٹ جائیں گے۔ مسائلِ زندگی کی راہیں صاف، واضح اور آسان ہو جائیں گی اور تمہارے معاشرے میں جنتِ ارضی کی بساط بچھ جائے گی۔

## تین بڑی کاوٹیں

حضرات! جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا قرآن کہتا ہے۔ کہ زندہ قوم بننا ہے تو باتیں نہ بناؤ بلکہ عمل کی راہ پر قدم بڑھاؤ۔ لیکن میں عرض کر دوں کہ اس راہ پر قدم بڑھانا آسان نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ میں عملی طور پر آگے بڑھنے کی تڑپ اور ولولے موجود ہیں۔ کیونکہ اسی تڑپ اور انہی ولولوں نے آج آپ کو ملک کے گوشے گوشے سے اس ہال کی چار دیواری میں لا جمع کیا ہے۔ عملی قدم بڑھانا دشوار اس لئے ہے۔ کہ اس راہ میں ایسے

ایسے سنگ گراں حائل ہیں جو آپ کو ایک قدم آگے بڑھنے نہیں دیں گے۔ پیشتر اس کے کہ ہم عزم و ہمت سے اس راہ میں قدم اٹھائیں اور پتھروں کو پامال کرنے کی تدبیر کریں یہ ضروری ہوگا کہ ہم ایک ایک کر کے ان کا جائزہ لیں تاکہ ہمارے سفر کا آغاز دھندلکے کی بجائے حق کی روشنی میں ہو۔

## اسلامی نظام کی راہ میں پہلا خطرہ

جہاں تک میں نے غور کیا ہے ایک اسلامی معاشرے کے قیام میں اس وقت یہاں تین بڑی طاقتیں شدت سے حائل ہیں۔ ان میں دین قوت جو سب سے زیادہ محسوس شکل میں سنگ راہ نظر آتی ہے وہ "مترفین" کا طاقتور گروہ ہے اور قرآن کی اصطلاح میں یہ وہ لوگ ہیں جو دوسروں کی محنت پر مفت عیش اڑاتے ہیں۔ دوسری دو بڑی طاقتیں کمیونزم اور ہندو کی ہیں۔

سب سے پہلے "مترفین" کی طرف آیئے۔ لیکن یہ جاننے کے لئے کہ ان کا وجود پاکستان میں اسلامی معاشرے کے قیام کے لئے کس قدر مہلک ہے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ قرآن معاشی ناہمواریوں کو دور کرنے کے لئے کیا اصول پیش کرتا ہے مختصراً قرآن یہ کہتا ہے کہ (۱) زندگی کی تگ و دو اور اللہ کے فضل کی تلاش میں سرگرم کار رہو بیکار نہ بیٹھو۔ (۶۲/۱۰) (۲) صرف حلال روزی کماؤ (۲/۱۶۸) (۳) انسانوں میں مختلف درجات تقسیم کار کے لئے ہیں۔ ایک دوسرے پر بڑائی کے لئے نہیں (۴۳/۳۲) (۴) ہر شخص اپنی جدوجہد کے ماحصل کو ضرورت پوری کرنے کے بعد دوسروں تک پہنچا دے۔ (۲/۲۱۹) (۵) جب تک معاشرے کے اندر کوئی دوسرا شخص ضروریاتِ زندگی سے محروم ہے اپنی دولت سمیٹ کر نہ رکھو (۳/۱۸۰ نیز ۱۰۴/۱) (۶) جس طرح انسانی جسم کے اندر خون کی گردش ضروری ہے اور اس کا جسم کے کسی ایک حصے میں رُک جانا سارے جسم کے لئے مہلک ہے۔ اسی طرح مال و دولت کا کسی مخصوص طبقے میں جمع ہو جانا سارے معاشرے کے لئے تباہ کن ہوگا (۵۹/۷، ۱۶/۷۱) (۷) اللہ تعالیٰ نے جو کچھ کسی کو اپنے فضل سے عطا کیا ہے وہ اس کا مالک نہیں بلکہ امین ہے۔ ملکیت کا حق صرف خدا اور اس کے قانون کو حاصل ہے (۵۷/۷) (۸) زمین کی پیداوار تمام بنی آدم کی مساویانہ مملوک ہے (۴۱/۱۰) (۹) دولت کی مناسب تقسیم کا حل یہ ہے کہ جن افراد کے پاس ضروریاتِ زندگی سے زیادہ دولت ہے وہ اُسے اس نظام کے سپرد کر دے جس کے ذمے قانونِ خداوندی کا انفاذ اور ہر فرد کو ضروریاتِ زندگی مہیا کرنا ہے۔ (۹/۱۱۱)

یہ ہیں وہ اصول جن کے ذریعے اسلام معاشرے کی ناہمواریاں دور کرتا ہے۔ قرآن واضح کرتا ہے کہ ہر زمانے کا رسول اپنے اپنے دور میں معاشی انقلاب کا داعی تھا۔ اور اس کی مخالفت میں جو لوگ سب سے پہلے اُٹھے اور آگے بڑھے وہ یہی مفت خور سرمایہ پرست عناصر تھے۔ جنھیں قرآن مترفین کے الفاظ سے یاد کرتا ہے۔ حضرت شعیبؑ نے جب اسی معاشی انقلاب کی دعوت اپنی قوم کو دی تو مترفین پکار اٹھے قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَاؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا۔ یعنی اے شعیب کیا تیری صلوٰۃ تجھے اس بات کا حکم دیتی ہے کہ ہم اپنے آباؤ اجداد کے طریقِ عبادت کو ترک کر دیں اور اپنے اموال اپنی مرضی سے خرچ نہ کریں۔ وہ بدبخت یہ سمجھتے تھے

کہ دین صرف پوجا پاٹ کا معاملہ ہے اور اسے ان کی جاگیرداریوں اور سرمایہ پرستیوں سے کیا واسطہ۔ آج بھی قوم شعیب کی صدائے بازگشت یہاں ہر گوشے سے سنائی دے رہی ہے۔ اس لئے کہ آج کا مذہب بھی دورِ ملوکیت کی پیداوار اور سرمایہ داری کی یادگار ہے۔ اور سرمایہ پرست عناصر اور ان کے ترجمان یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ چند مذہبی رسوم کی ادائیگی کے علاوہ اسلام کو ان کی زمینداریوں، جاگیروں، سونے چاندی کے خزانوں اور بینک بیلنسوں سے کوئی واسطہ نہیں۔ قرآن ببانگ دہل اس تاریخی حقیقت کا اعلان کرتا ہے کہ وَمَا أَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِّن نَّذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَا إِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُم بِهِ كَافِرُونَ ○ (۳۴/۳۴) یعنی یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہم نے جس بستی میں بھی ڈرانے والا بھیجا وہاں کے سرمایہ پرستوں نے یہ کہہ کر اس کی مخالفت کی کہ ہم تیری دعوت قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں۔

حضرات! اب آپ ان زمینداروں، جاگیرداروں، نوابزادوں کا جو پاکستان کی سیاست پر قابض اور جمہوریہ اسلامیہ پاکستان کی اقتدار کی مسندوں پر فائز ہیں جائزہ لیجئے۔ قرآن کہتا ہے کہ محنت کی کمائی کھاؤ اس کے برعکس یہ مزارعین کی خون پسینے کی کمائی پر انھیں بھوکے اور ننگے رکھ کر اپنے عشرتکدوں میں ساغرِ عیش لنڈھاتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ حلال کی کمائی کھاؤ۔ یہ عوام کی عرق ریزیوں سے سیر ہو کر سمگلنگ اور چوربازاری کا رُخ کرتے ہیں۔

قرآن کہتا ہے کہ انسانوں میں مختلف درجات تقسیم کار کی خاطر ہیں۔ ایک دوسرے پر ذاتی بڑائی کے لئے نہیں لیکن انھوں نے غریب عوام کو اچھوت بنا کر رکھ دیا۔ قرآن کے نزدیک اکرم وہ ہے جو قانونِ خداوندی کی زیادہ پابندی اختیار کرے لیکن یہاں اکرم وہ قرار پاتا ہے۔ جو مال و دولت کو زیادہ سمیٹے۔ قرآن کہتا ہے کہ اپنی ضروریات پوری کرنے کے بعد فاضل سرمایہ ضرورت مندوں تک پہنچاؤ۔ جب تک معاشرے میں دوسرا فرد ضروریاتِ زندگی سے محروم ہے اپنی دولت سمیٹ کے نہ رکھو۔ لیکن کروڑوں فاقہ مستوں کی موجودگی میں ہمارے سرمایہ داروں کی عیش سامانیاں سب پر خوب عیاں ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ ملکیت کا حق صرف خدا اور اس کے قانون کو ہے اور جو کچھ خدا نے کسی کو اپنے فضل سے عطا کیا ہے وہ اس کا مالک نہیں امین ہے۔ لیکن یہاں ایک زمیندار ہزاروں اور لاکھوں ایکڑ زمین پر اجارہ داری اور ملکیت قائم کر کے لاکھوں محنت کشوں کو فاقوں کا شکار بنا رہا ہے۔ چنانچہ حضرات! جب تک پاکستان کی سیاست پر ایسے جاگیرداروں کا قبضہ ہے اسلامی نظامِ زندگی کا تصور بھی ذہنوں میں نہیں آسکتا۔ لہٰذا پاکستان کی سرزمین پر اسلامی معاشرے کے قیام کی جدوجہد کا جو پرچم یہاں بلند ہوگا اس کے علمبرداروں کو سب سے پہلے انہی بڑے بڑے جاگیرداروں اور سرمایہ پرستوں کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ خوب سوچ لیجئے کہ دولت و رزق اور اقتدار کے سرچشموں پر سے اس بیبب گروہ کی اجارہ داری ختم کرنے کے لئے طاقت کے کتنے پہاڑ راہ میں حائل ہوں گے۔ مترفین کا یہ گروہ بظاہر مسلم لیگ، ری پبلکن پارٹی اور نیشنل پارٹی کے مختلف کیمپوں میں بٹا ہوا ہے لیکن یاد رکھئے کہ ان سب کا مفاد ایک ہے۔ ان کا وجود عوام کے خلاف ایک مستقل اور منظم سازش ہے۔ اور جب کبھی ان کے مفاد پر کسی طرف سے زد پڑے گی یہ سب مل کر سامنے آئیں گے۔ جب تک ان کی جاگیر ولیا

اور زمینداریاں ختم نہ ہوں گی اور ملک کی مسندِ اقتدار پر ان کا تسلط قائم رہے گا اس وقت تک ملک کے اندر افراتفری، بے چینی، انتشار اور علاقائی سازشوں کے فتنے بدستور قائم رہیں گے۔ اور جب تک عوام کو ان کی منظم سازش کے خطرات کا پورا پورا احساس نہیں دلایا جائے گا ان کے خلاف ایک منظم تحریک پیدا نہیں ہو سکتی۔ یاد رکھئے کہ جب تک پاکستان ایسی عظیم اور منظم تحریک ملک کو ان کی لوٹ کھسوٹ اور اقتدار سے پاک نہیں کرے گی الیکشنوں کے نعرے بے نتیجہ ثابت ہوں گے۔ عام انتخابات جب بھی ہوں گے۔ دولت و اقتدار کی منظم طاقت سے یہی گروہ کامیاب ہوگا۔ اور برسرِ اقتدار آئے گا۔ ان کی موجودگی میں مزدوروں اور کسانوں کا برسرِ اقتدار آنا تو ایک طرف متوسط طبقے کے وہ لوگ جن میں وکیل، ڈاکٹر، پروفیسر غرضکہ سارا ذہین طبقہ شامل ہے۔ کبھی برسرِ اقتدار نہیں آسکتے۔ حکومت بنے گی تو انہی جاگیرداروں کی۔ جن میں ملک کا چھوٹے سے چھوٹا مسئلہ حل کرنے کی اہلیت نہیں۔ ہمارے فاقہ کش عوام کی روزی انہی جاگیرداروں کے ہاتھ میں ہے۔ ہزاروں ایکڑ زمین کا مالک جاگیردار نہ صرف اپنے ہزاروں مزارعین کے ووٹوں کا بلاشرکتِ غیرے مالک ہے بلکہ انہی کے خون پسینے کی سمیٹی ہوئی کمائی سے وہ ہزاروں دوسرے ووٹ خریدنے پر بھی قادر ہے اور ہمارے بھولے بھالے اور سیدھے سادے عوام ابھی یہ سمجھنے کے قابل نہیں کہ پانچ دس یا سو روپے کے بدلے وہ اپنے بال بچوں اور اپنے ملک و ملت کا مستقبل ان سرمایہ داروں کے ہاتھ فروخت کر دیتے ہیں جو بہرقیمت صحیح اسلامی نظام کے قیام کی مخالفت کریں گے۔ کیونکہ اس نظام میں ان کی جاگیرداریاں اور غیر محدود ملکیتیں ختم ہو جاتی ہیں۔

## دوسری رکاوٹ

حضرات! دوسری بڑی طاقت جو اس وقت ملک کے اندر اسلامی نظام کے قیام میں حائل ہے اور جو بار بار ہمارے رہنماؤں کی کوتاہ بینی اور اسلام ناشناسی کے باعث پاکستان کی سیاست متزلزل کئے ہوئے ہے مشرقی پاکستان کے ہندو کی طاقت ہے۔ یہی وہ منظم گروہ ہے جو پاکستان میں رہتے ہوئے بھارت کے اشارے پر ناچتا ہے۔ اور پاکستان کے سیاسی طالع آزماؤں کا ایک گروہ ان کی حمایت حاصل کرنے کے لئے کبھی متحدہ قومیت کا نعرہ بلند کرتا ہے اور کبھی مخلوط طریقِ انتخاب کا۔ ہوسِ اقتدار کی اس نعرہ بازی نے مشرقی پاکستان کے ہندو کو اب اس قدر مضبوط کر دیا ہے کہ اب وہ ملک کے سیاسی توازن کو اپنے ہاتھ میں لے چکا ہے۔ اور اس کی سازشوں کی بدولت مشرقی پاکستان کی سیاست میں نت نئے فتنے ابھر رہے ہیں۔

## اسلام اور قومیت کا تصور

پاکستان اور اس کی سرزمین پر اسلامی نظام کے قیام کے سلسلے میں ہمیں اس مسئلے کی نوعیت کما حقہٗ سمجھنے کے لئے یہ دیکھنا ہوگا کہ از روئے قرآن قومیت کا معیار کیا ہے؟ اور اسلامی مملکت میں مسلم اور غیر مسلم کے تعلقات کس نوع کے ہونے چاہئیں؟ انسانی زندگی کے ارتقائی مراحل پر غور کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ انسانوں نے جب سے مل جل کر رہنے کی زندگی اختیار کی۔ وہ آپس میں مختلف گروہوں میں بٹے چلے آئے۔ شروع شروع میں انسان نے قبائلی زندگی کا آغاز کیا۔ ہر قبیلہ

دوسرے قبیلے کا دشمن تھا اور ان میں باہمی جنگ وجدل اور خونریزی کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ جب انسانی آبادی مزید بڑھی اور قبائل بڑھتے بڑھتے دور تک پھیل گئے تو انھوں نے نسلی تقسیم کا رنگ اختیار کر لیا۔ منگولی نسل، سامی نسل آریائی نسل وغیرہ وغیرہ اور ان میں ہر نسل دوسری کے خلاف نبرد آزما رہی۔ یہی امتیازات آگے بڑھے۔ تو انھوں نے وطنی قومیت کی صورتیں قائم کرلیں۔ ایک خطۂ زمین پر بسنے والے ایک قوم کے افراد۔ اور دوسرے ملک میں رہنے والے دوسری قوم کے افراد۔ اسی تقسیم کو فی زمانہ نیشنلزم کہا جاتا ہے۔ تقسیم و تفریق کے یہ مختلف معیار تھے جو انسان نے اپنی عقل کی رو سے زمانہ بہ زمانہ قائم کئے اور اس طرح خون، رنگ، نسل اور دریاؤں پہاڑوں کی وطنی حدود کے نام پر نوعِ انسانی کے افراد ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بنے رہے۔ ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کا دشمن ایک نسل دوسری نسل کے خلاف برسرِ پیکار۔ اور ایک ملک دوسرے ملک سے جنگ آزما۔ یہ تھی انسانی عقل کی پیدا کردہ حد بندی۔ جن کی فتنہ سازیوں سے اولادِ آدم ہمیشہ قتل وغارت کے طوفان میں ایک دوسرے کے ساتھ لڑتی آئی۔

عقلِ انسانی کی ان فتنہ سازیوں کے مقابلے میں آسمانی وحی نے نوعِ انسانی کے لئے قومیت کا جو معیار قائم کیا وہ پوری نوعِ انسانی کے لئے حقیقی سامانِ رحمت تھا۔ چنانچہ قرآن نے ان تمام عقلی معیاروں کو غلط قرار دیا اور اعلان کیا کہ تمام دنیا کے انسان ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں۔ كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً۔ اس لئے نسل اور وطن کی چار دیواریاں اس وحدت میں کوئی تفریق اور امتیاز پیدا نہیں کر سکتیں۔ ان میں امتیاز وہ چیز پیدا کرے گی جو ایک انسان کو انسان ہونے کی بنا پر دوسرے انسانوں سے ممتاز کرتی ہے۔ مثلاً جھوٹے اور سچے ایک گروہ کے افراد نہیں بن سکتے۔ خواہ وہ ایک ہی خاندان کے افراد کیوں نہ ہوں۔ مجرم اور نیکوکار ایک جماعت کے رکن نہیں کہلا سکتے۔ خواہ وہ ایک ہی زبان کیوں نہ بولتے ہوں۔ ایک شریف باپ اور اس کا بدمعاش بیٹا خواہ حیوانی سطح پر باپ بیٹا کیوں نہ کہلائیں۔ لیکن انسانی سطح پر ان میں کوئی اجتماعی تعلق نہیں رہ سکتا۔ یہ تھا انسانوں میں تفریق اور امتیاز کا وہ اصول جو وحی نے مقرر کیا۔ چنانچہ قرآن کسی وقت بھی عرب کی قوم، ایران کی قوم یا یونان کی قوم کا قائل نہیں ہوا۔ قرآن میں ہمیشہ قوم المجرمین، قوم الظالمین، قوم الفاسقین کے الفاظ استعمال ہوئے۔ جب وہ قوم الکافرین کہتا ہے تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ کافر خواہ دنیا کے کسی حصے میں آباد ہوں وہ سب ایک قوم ہیں۔ قرآن نے ان جزئیات کو سمیٹا کر ایک عالمگیر کلیہ کے اندر بند کر دیا ہے جب اس نے کہا کہ دنیا کے تمام وہ لوگ جو انسانیت کی مستقل قدروں کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں سب ایک قوم کے افراد ہیں۔ اور وہ تمام لوگ جو اس نظریے سے انکار کریں۔ دوسری قوم کے افراد ہیں۔ پہلے گروہ کو قرآن کی اصطلاح میں "مومن" کہا گیا ہے اور دوسرے کو کافر۔ یعنی دنیا بھر کے وہ تمام انسان جو انسانیت کی ان اقدار کی سچائی پر یقین رکھیں۔ جو وحی کی رو سے حاصل ہوئیں وہ ایک گروہ، ایک قوم، ایک ملت اور ایک امت کے ارکان ہیں اور جو لوگ ان پر یقین نہیں رکھتے وہ کافر۔ یعنی غیر رکن ہیں۔ قرآن اور وحی کی رو سے قومیت کا معیار روزِ اول سے یہی رہا۔

چنانچہ قومیت کے اس نظریئے کے مطابق لوط علیہ السلام کی بیوی دینِ حق سے کفر اختیار کر کے امت سے خارج ہوگئی۔

اور فرعون کی مومنہ بیوی نے جب دعوتِ حق کو قبول کیا تو قومیت کے خونی، نسلی اور جغرافیائی رشتے ٹوٹ گئے اور وہ اپنے شوہر کے بالمقابل ملتِ حقہ کی صفوں میں شامل ہو گئی۔ قومیت کے اسی معیار کی بنا پر قارون بنی اسرائیل کا فرد ہو کر غیر کہلایا اور قومِ فرعون کے جادوگر دینِ حق کی آئیڈیالوجی پر ایمان لا کر ملتِ موسوی کے رکن بن گئے۔ قومیت کا یہی عالم آرا تصور تھا جس کی بنا پر روم کے صہیبؓ فارس کے سلمانؓ اور حبش کے بلالؓ رسولِ عربیؐ کے ہم قوم بن گئے۔ لیکن اپنے ہی گھر کے ابوجہل اور ابولہب کو اسی نظریے کے اختلاف نے دوسری قوم کے افراد بنا دیا اسی نظریے کی اساس پر خدا کے آخری رسول نے ایک مملکت کا سنگ بنیاد رکھا اور ایک ایسی مملکت تشکیل کی جس کے نظام میں کسی غیر مسلم کو ادنیٰ دخل نہ ہو سکا۔ اسی آئیڈیالوجی کی بنا پر جداگانہ قومیت کا نظریہ تھا جس نے پاکستان کو جنم دیا۔ ہندوؤں اور ان کے ہمنوا مسلمانوں کا دعویٰ تھا کہ ہندوستان میں بسنے والے تمام گو عقائد و نظریات کے اختلاف کے باوجود ایک قوم ہیں۔ اس کے برعکس مسلم جمہور کا نظریہ یہ تھا کہ قومیت کا معیار وطن و رنگ، نسل زبان اور وطن کے اشتراک پر نہیں۔ بلکہ آئیڈیالوجی کے اشتراک پر ہے۔ یہی وہ اصولی اور بنیادی اختلاف تھا جس پر متحدہ ہندوستان کی سیاست کی پوری عمارت استوار ہوئی۔ یہی اختلاف جداگانہ مملکت اور مطالبۂ پاکستان کے دعوے کی دلیل بنا۔ اسی اصل کی شاخ تھی جو جداگانہ انتخاب کی صورت میں سامنے آئی۔

پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد چاہیئے تو یہ تھا کہ قرآنی تصورات کے مطابق غیر مسلموں کے اسلامی مملکت میں حقوق کا واضح تعین ہو جاتا۔ لیکن ہماری سب سے بڑی مصیبت یہی تھی کہ "پاکستان کا مطلب کیا: لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه" کا نعرہ بلند کرنا تو آسان تھا۔ لیکن جب اس "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه" کو سمجھنے کا وقت آیا تو ہمارے نعرہ باز لیڈروں کے ذہن اس حقیقتِ عظمیٰ سے قطعاً خالی تھے۔ چنانچہ بھارت کی سیکولر سٹیٹ کے لادینی آئین کی تقلید کر کے بھٹ سے ہندوؤں کو پاکستان کی اسمبلیوں میں داخل کر لیا گیا۔ جس طرح بھارت نے شو بوائز کے طور پر مسلم وزیر رکھے ہوئے تھے۔ اسی طرح یہاں بھی غیر مسلم وزیر مقرر کر دیئے گئے اور اس حقیقت پر ادنیٰ غور و خوض کی ضرورت محسوس نہ کی گئی کہ اسلامی مملکت کی اساس ایک لادینی ریاست کی بنیاد سے قطعاً مختلف ہوتی ہے۔ چنانچہ جب ایک بار غیر مسلم پاکستان کی سیاست میں داخل ہو گئے تو ایسا شدید ذہنی انتشار برپا ہوا کہ آج ہمارے رہنماؤں کو اس گرد و غبار میں کوئی راہ سجھائی نہیں دیتی۔

قرآن ان مسائل کو کھول کھول کر بیان کر چکا تھا۔ اس کی تیسری سورت کی ۱۱۸ — ۱۲۰ آیات میں واشگاف الفاظ میں کہہ دیا گیا تھا کہ اے ایمان والو! اپنوں کے سوا اغیار کو اپنا رازدار نہ بناؤ۔ یہ لوگ تمہاری تخریب میں کوئی کوتاہی نہیں کریں گے۔ اسی طرح تیسری سورت کی اٹھائیسویں آیت پھر پانچویں سورت کی ۵۷ تا ۱۶۰ آیات، پھر نویں سورت کی ۲۳ — ۲۴ ویں آیات، پھر ساری کی ساری سورت ممتحنہ میں بار بار قرآن نے غیر مسلموں کو رازدار بنانے سے منع فرمایا۔ از روئے قرآن ایک اسلامی مملکت میں غیر مسلموں کی جان و مال ان کی عزت و آبرو اور عبادت گاہوں کی حفاظت مملکت کا فریضہ ہے۔ غیر مسلموں کی ضروریاتِ زندگی کی بہم رسانی اور ان کی نشو و نما کی ذمہ داری بھی اسلامی مملکت پر ہے۔ اسلامی مملکت

غیر مسلموں کے ان تمام شہری حقوق کی حفاظت کی ذمہ دار ہے جو ایک شریف انسان اور وفادار شہری کو کسی مملکت میں حاصل ہو سکتے ہیں۔ لیکن ایک اسلامی مملکت کسی قیمت پر اپنے نظام میں ان لوگوں کو راز دار نہیں بنا سکتی جو اس نظام کے اصولوں کو درست اور حق تسلیم نہیں کرتے۔ ایسی صورت میں یہ ممکن ہی نہیں کہ غیر مسلم ان شورائی مجالس اور اسمبلیوں میں شریک ہوں جو ایک مملکت کو اسلامی آئیڈیالوجی کے اصولوں پر چلانے کے لئے قائم ہوں۔ پاکستان کی آئین سازی کے دوران میں ہم نے حکومت اور ارکین دستوریہ کو اس پر متوجہ کیا۔ لیکن ہماری حقیقت آفرین صدا اس نقار خانے میں طوطی کی آواز بن کر رہ گئی اور اس غلطی کے باعث طریق انتخاب کے مرحلے پر ایسا گورکھ دھندا پیدا ہوا جو آج تک نہ سلجھ سکا اور نہ آئندہ چل کر سلجھ سکے گا۔ مشرقی پاکستان کے ہندوؤں کے ووٹ حاصل کرنے کے لئے سہروردی صاحب نے مخلوط انتخاب کا نعرہ بلند کیا۔ اور اس سلسلے میں عجیب وغریب دلائل پیش کئے۔ موچی دروازے کے میدان میں ہم ان دلائل کا پوری طرح چھان پھٹک کر جواب دے چکے ہیں۔

سہروردی صاحب کے مقابلے میں مسلم لیگ جداگانہ انتخاب کا نعرہ بلند کر رہی ہے۔ لیکن یہ نعرہ اسلامی آئیڈیالوجی کے کسی ٹھوس نظریے کی بنا پر نہیں۔ بلکہ محض ایک سلوگن کے طور پر بلند کیا جا رہا ہے۔ حالانکہ طریق انتخاب مخلوط ہو یا جداگانہ ہندو دونوں صورتوں میں اسمبلیوں میں پہنچیں گے۔ اور اسلام کا وہ بنیادی تصور بہر صورت ختم ہو جائے گا کہ غیر مسلم اسلامی مملکت کی اسمبلیوں میں شریک کار اور حصہ دار نہیں بن سکتے!

پاکستان کو اسلامی مملکت قرار دیتے ہوئے یہ ممکن تھا کہ غیر مسلموں کی الگ ذیلی اسمبلیاں قائم کر دی جائیں۔ تاکہ ان اسمبلیوں میں وہ اپنے مخصوص مسائل پر غور کر سکیں۔ اور جہاں کہیں مملکت میں ان کے شہری حقوق پر زد پڑتی ہو حکومت کی توجہ دلا سکیں۔ لیکن ہوس اقتدار کی جنگ میں ہندو ووٹوں کی حمایت کے حصول نے اس صورت پر کسی کو غور کرنے کی مہلت ہی نہیں دی۔ مسٹر سہروردی کی عوامی لیگ اور مسلم لیگ کے علاوہ بے اصول بے ضمیر طالع آزماؤں کا ایک تیسرا طائفہ ری پبلکن پارٹی کے نام پر یہاں برسر اقتدار ہے۔ جن کے اصول ومقاصد میں صبح وشام ایسی ایسی مضحکہ خیز تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں جن کی مثال شاید آج دنیا کی کسی بدترین مملکت میں بھی نہ مل سکے۔ اقتدار کے تند وتیز نشے میں اس پارٹی کے رئیسوں اور جاگیرداروں نے وہ قلابازیاں کھائیں اور اس کے لیڈروں نے گرگٹ کی طرح ایسے ایسے رنگ بدلے کہ ملک سے سیاسیات، اصول اور نظریات کا بچا کھچا احترام بھی ناپید ہو گیا۔ اور آج ملک ایسے انتشار اور بے راہ روی کے کنارے کھڑا ہے کہ کوئی اس کے بنیادی مسائل پر توجہ مبذول کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ مہاجرین کی بے بسی اور عوام کی فاقہ کشی اب کوئی قابل ذکر مسائل قرار نہیں پاتے اور اس مایوسی اور افراتفری نے کشمیر جیسے اہم مسائل کو حل کرنے کا کوئی سوال باقی نہیں رکھا۔ اگر سیاسی سٹنٹ کے طور پر کشمیر کا نعرہ استعمال کیا جاتا ہے۔ تو یہ دوسری بات ہے۔

حضرات! تقسیم ملک کے موقعہ پر ناگزیر حالات کے تحت ہندو نے رسمی طور پر تقسیم کو ضرور منظور کر لیا۔ لیکن ہندو دو قومی نظریے کا اب بھی قائل نہیں۔ اور اس کا نصب العین اب بھی "اکھنڈ بھارت" ہے۔ میں یہ کچھ بھارت کے ہندو کے متعلق نہیں

کیسا ۔ بلکہ پاکستان کے بندیے کے متعلق بھی ۔ مخلوط طریقِ انتخاب کے موقع پر کیوں مشرقی پاکستان کے ہندو نے سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا ؟ اس طریقِ انتخاب کے پاس ہونے پر ان کے گھروں میں گھی کے چراغ جلائے گئے تھے ؟ یہ سوالات ہر صاحبِ فکر کے لئے قابلِ غور ہیں ۔ ہندو نے یہ سب کچھ اس حقیقت کو جانتے ہوئے کیا کہ مخلوط طریقِ انتخاب کسی اقلیت کے لئے فائدہ مند نہیں ہو سکتا ۔ لیکن عیار ہندو خوب جانتا تھا کہ اس تھوڑی سی قربانی سے وہ بہت بڑا مقصد حاصل کر رہا ہے اور وہ مقصد یہ تھا کہ مخلوط طریقِ انتخاب پاکستان کی نظریاتی اساس کو تہ و بالا کر دے گا اور ساتھ ہی ساتھ اس نے اس حقیقت کا بھی خوب اندازہ لگایا کہ کوتاہ اندیش اور خود غرض مسلمان ایک مختصر اور عارضی مفاد کے لئے کیونکر اپنی مملکت کے بنیادی تصورات پر ہوسِ اقتدار کا کلہاڑا چلانے اور ہندو کی حمایت حاصل کرنے پر تل جاتا ہے ۔

## تیسری رکاوٹ

حضرات ! اب میں اس تیسری اہم طاقت کو لیتا ہوں ۔ جو اس مملکت میں اسلامی نظام کی راہ میں سنگِ گراں بن کر حائل ہے اور وہ ہے کمیونزم ۔ گو اس کی مخالفت ایک واضح اور محسوس شکل میں ابھی کھل کر آپ کے سامنے نہیں آئی ۔ لیکن اندر ہی اندر اس نے جو اثرات پیدا کئے ہیں وہ سب سے زیادہ ہولناک ہیں ۔ اور اگر آپ گذشتہ حالات کی رفتار کا بغور جائزہ لیں تو صاف نظر آئے گا کہ اسلامیانِ پاکستان کی متحدہ قومیت کا تار و پود بکھیرنے میں سب سے زیادہ حصہ کمیونسٹ اثرات کا ہے ۔ یہی عنصر تھا جس نے ہماری ملی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کے لئے صوبائی تعصبات اور طبقاتی منافرت کو ہوا دی اور وحدتِ مغربی پاکستان کے خلاف محاذ قائم کیا ۔ سرمایہ داری کی نظریاتی مخالفت کے باوجود انھوں نے نہ صرف جاگیرداروں کی ری پبلکن پارٹی سے سمجھوتہ کیا ۔ بلکہ مترفین کے گروہ کو اپنی پارٹی میں بھی شامل کیا ۔ اور اس عجیب و غریب منظر نے ایک تاریخی واقعہ کی صورت اختیار کی کہ سرمایہ داری کے دشمن کمیونسٹ صوبائی منافرت سے وحدتِ ملی کو پارہ پارہ کرنے کے لئے بدترین جاگیرداروں کے ساتھ ہراول دستے کے طور پر اگلی قطار میں تھے ۔ ان کی نیشنل پارٹی کی صدارت کی مسندیں بڑے بڑے جاگیرداروں اور زمینداروں کے ہاتھ میں تھیں ۔ یہ فتنہ انگیز رجحان بھی اسی گروہ نے پیدا کیا کہ ہم نہ مسلمان ہیں اور نہ پاکستانی ۔ بلکہ سب سے پہلے پٹھان ، پنجابی ، سندھی ، بلوچی اور بنگالی ہیں ۔ اور ہمارا مفاد ایک دوسرے سے قطعاً جدا اور مختلف ہے ۔

اسلامی نقطۂ نظر سے پاکستان میں وحدانی طرزِ حکومت قائم ہونی چاہیئے تھی ۔ لیکن اگر ملک کے ہر دو حصوں کے دور افتادہ ہونے کے باعث یہاں دو یونٹ قائم کر دیئے گئے تو اسے بھی ایک مثبت اقدام سمجھنا چاہیئے ۔ لیکن جس طرح ایک یونٹ کے خلاف نعرہ لگانے والوں کی نیت درست نہ تھی ۔ اسی طرح ایک یونٹ کے بانیوں کا مقصد بھی دیانت اور خلوص پر مبنی نہیں تھا ۔ ون یونٹ سے ان کا مقصود قومی یکجہتی اور ہم آہنگی ہرگز نہ تھا ۔ بلکہ وہ بھی اپنی مصلحتِ اقتدار کی خاطر یہ سب کچھ اس لئے کر رہے تھے کہ بنگالی ان کی مسندِ اقتدار پر غلبہ نہ پا سکیں ۔ اور ہر دو وحدتوں میں برابری قائم کر کے اس اندیشے کو دور کر لیا جائے ۔

لیکن اصل سوال اب یہ ہے کہ اب جبکہ ایک یونٹ بن چکا ہے۔ اس کی تعمیر پر قوم کی خون پسینے کی کمائی سے لاکھوں روپے کا خرچ آچکا ہے۔ ملک کا آئین بھی اسی کی بنیاد پر مرتب ہوا ہے۔ کیا یونٹ کو توڑنے کا انجام یہ نہیں ہوگا کہ دس سالوں میں بڑی مشکلوں کے بعد بڑے بھلے دستور کی صورت میں جو کچھ تیار ہوا ہے اس کا تار و پود بکھر کر رہ جائے۔ اور ہم پھر الٹی زقند لگا کر اسی مقام پر پہنچ جائیں جہاں سے دس گیارہ برس پہلے ہم اپنی نئی منزل کے سفر پر روانہ ہوئے تھے۔ اس کا ردِ عمل کیا ہوگا؟ عوام کی حالت کس حد تک بدتر ہو جائے گی؟ ان کی بڑھتی ہوئی مایوسیوں میں کس قدر اضافہ ہو جائے گا؟ مُترفین کی اجارہ داری اس کامیابی کے بعد کس قدر مضبوط ہو جائے گی؟ کمیونسٹوں کی حکمتِ عملی یہ ہے کہ جس ملک میں وہ اپنے نظریات کی تکمیل چاہتے ہیں۔ وہاں سب سے پہلے ملک کی مرکزیت، قوم کی وحدت اور استحکام کو ختم کرتے ہیں۔ اور پھر انتشار کی فضا میں اپنے نظریات کی تخم ریزی شروع کرتے ہیں۔ وحدتِ مغربی پاکستان کا خاتمہ یقیناً کمیونسٹوں کے اس منشا کو پورا کر دے گا۔

پاکستان اسلامی آئیڈیالوجی کی عملی تشکیل کے لئے معرضِ وجود میں آیا اور موجودہ سیاسیات میں اگر کوئی قوت آئیڈیالوجی کی حیثیت لے کر اسلام کے مقابل آئی ہے تو وہ صرف کمیونزم ہے۔ اسلام کی طرح کمیونزم بھی ایک فلسفۂ حیات کی داعی اور علمبردار ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام اس کے مقابلے میں نہیں ٹھہر سکتا۔ اور اُسے اپنے مدمقابل اگر کوئی طاقت نظر آتی ہے تو وہ اسلام ہے۔

کمیونزم کی تاریخ اس حقیقت کی شہادت دے رہی ہے کہ اس کا سارا فلسفہ سرمایہ داری کے خلاف شدید ردِ عمل کا نتیجہ ہے۔ لیکن اس کے باوجود کہ کمیونسٹ جاگیرداروں اور سرمایہ پرستوں کے دشمن ہیں انھوں نے اس ملک میں انتشار برپا کرنے کے لئے یہاں کے جاگیرداروں کے ساتھ گٹھ جوڑ پیدا کر لیا ہے۔ اور نیشنل عوامی پارٹی کی تنظیم میں جہاں سب سے زیادہ ہاتھ کمیونسٹ کارکنوں کا ہے۔ وہاں سندھ اور سرحد کے بڑے بڑے زمیندار بھی اس میں شامل ہیں۔ اور یہ وقت کی عجیب ستم ظریفی ہے کہ پاکستان میں اسلامی نظام کے امکانات ختم کرنے کے لئے ان ہر دو طاقتوں میں متضاد رجحانات کے باوجود اس قدر واضح گٹھ جوڑ اور سازش موجود ہے۔

حضرات! میں نے انتہائی وضاحت سے آپ کی خدمت میں اُن سنگہائے گراں کی تفصیل پیش کر دی ہے۔ جو ایک اسلامی جمہوری تحریک کی راہ میں قدم قدم پر حائل ہوں گے۔ اپنے بلند و بالا مقاصد کے حصول کے لئے آپ کو عوام میں زندگی کا ایک نیا شعور اور مُلک گیر ذہنی انقلاب پیدا کرنا ہوگا۔

اس شعور اور ذہنی انقلاب کی بدولت آپ کی تحریک کے لئے اسلامی معاشرے کی تشکیل ممکن ہو جائے گی۔ لیکن یاد رکھیئے کہ یہ کٹھن راہیں اخباری بیانوں اور تقریر بازیوں سے طے نہیں ہوں گی۔ اس کے لئے آپ کو گلی گلی، کوچے کوچے، قریہ قریہ اور شہر شہر عوام کی تربیت کا فرض سر انجام دینا ہے۔ جب تک آپ یہ عظیم ذمہ داری اپنے کندھوں

نہیں لیتے کوئی انقلاب برپا نہیں ہو سکتا۔ اور جب تک ذہنی انقلاب کی صورت نمایاں نہ ہو۔ انتخابات بے معنی ثابت ہوں گے۔

اس لئے اُٹھیئے، اور خدا کا نام لے کر اُٹھیئے! زندگی کا نور بن کر ان اندھیروں پر چھا جایئے۔ جو ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یقین رکھیئے کہ جب آپ نے اس خلوص اور عزم کے ساتھ اپنے قدم آگے بڑھائے تو خدا کی رحمتیں قدم قدم پر آپ کے شامل حال ہوں گی۔


## نوعِ انسانی کا سب سے اہم اور مشکل سوال اس کا معاشی مسئلہ ہے

## اس مسئلہ کا حل عقلِ انسانی نے کیا سوچا؟

## اور

## قرآن نے اس کا کیا حل بتایا ہے؟

دورِ حاضر کی عظیم کتاب

# نظامِ ربوبیت

بڑا سائز ضخامت ۴۰۰ صفحات۔
قسم اوّل مجلد چھ روپے۔
قسم دوم غیر مجلد چار روپے۔

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام
۲۵-بی گلبرگ کالونی۔ لاہور

# حقائق و عبر

## ۱۔ ولی عہد کی اہمیت

اس ماہ کی ایک اہم خبر ملکہ ثریا کی طلاق ہے۔ یہ خبر اس لئے اہم نہیں کہ طلاق کسی ملک کی ملکہ کو ملی ہے۔ ہمارے نزدیک عورت ہونے کی حیثیت سے دنیا کی ہر عورت یکساں ہے اور ملکہ ہونے کی جہت سے، ہر عورت اپنے گھر کی ملکہ ہوتی ہے۔ اس خبر کی اہمیت ان خصوصی حالات کی بنا پر ہے جن کی وجہ سے نوبت طلاق تک پہنچی ہے۔ بتایا یہ گیا ہے کہ شاہ اور ملکہ (میاں اور بیوی) ہنسی خوشی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان کے تعلقات نہ صرف خوشگوار بلکہ محبت و مودّت کے مظہر تھے۔ ان میں کسی قسم کی کوئی ناچاقی یا بدمزگی نہیں تھی۔ لیکن ان کی سات سالہ ازدواجی زندگی میں ملکہ کے ہاں اولاد نہیں ہوئی اور چونکہ نرینہ اولاد کے بغیر تخت شاہنشاہی بغیر ولی عہد کے رہ جاتا تھا، اس لئے بادشاہ کو بادلِ ناخواستہ ملکہ کو طلاق دینی پڑی۔ اور ملکہ کو باصد حسرت و یاس اس فیصلہ کو قبول کرنا پڑا۔۔۔ وہ فیصلہ جس سے ایران کے بہت سے گھرانوں میں صفِ ماتم بچھ گئی۔

اس سے دو اہم سوال ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ایک عام انسانی حیثیت سے۔ دوسرا قرآنی نقطۂ نگاہ سے۔

عام انسانی حیثیت سے یہ کہ 'کیا کسی عورت کے ہاں اولاد نہ ہونا' واقعی ایسا جرم ہے جس سے وہ اس قسم کی انتہائی سزا کی مستحق قرار پا جاتی ہے؟ ہمارا خیال ہے کہ جو لوگ اس سوال کا جواب مثبت میں دیں، انہیں اس کا قطعاً حق حاصل نہیں کہ وہ صفِ انسانیت میں کھڑے ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کے تمثیلی انداز میں بیان کردہ قصہ آدم کی رُو سے جب آدم کے دل میں حیاتِ جاوید کی آرزو پیدا ہوئی تو ابلیس نے اس کے کان میں یہ افسوں پھونکا کہ وہ اولاد کے ذریعے حیاتِ جاوید حاصل کر سکتا ہے۔ اسی سے اس کا نام ہمیشہ کے لئے روشن رہ سکتا ہے۔ وہ دن اور آج کا دن' اولاد کی آرزو انسان کی تگ و دو میں تکمیل ذات نے معلوم اسے کہاں کہاں لئے پھرتی ہے۔ اور ستم بالائے ستم کہ اس ناکردہ گناہ کی سزا اکثر و بیشتر بیچاری حوا کی بیٹی کو بھگتنی پڑتی ہے۔ خدا جانے آدم کا شعور کب بیدار ہو گا اور وہ کب ابلیس کے اس فریب سے نکل سکے گا کہ وہ حیاتِ جاوید اولاد کے ذریعے حاصل کر سکتا ہے۔ حیاتِ جاوید انسانی ذات کی نشوونما اور پختگی سے حاصل ہوتی ہے نہ کہ اولاد کے ذریعہ بقائے نسل سے۔ بقائے نسل کا نظریہ ذہنی فریب سے زیادہ کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔

قرآنی نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ فیصلہ اور بھی زیادہ حسرت انگیز اور عبرتناک دکھائی دیتا ہے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ اللہ

کا ہونا یا نہ ہونا طبیعی قوانین کے مطابق ہوتا ہے جس پر مرد یا عورت کسی کا بھی اختیار نہیں ہوتا۔ (اگر مرد یا عورت میں سے کسی میں) اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں (اور مناسب علاج کے باوجود یہ صلاحیت پیدا نہیں ہو سکی) تو اس میں فردِ متعلقہ کا کوئی قصور نہیں جس کی وجہ سے اسے مستحق سزا قرار دیا جائے۔ سورہ شوریٰ میں ہے یَهَبُ لِمَنْ یَّشَآءُ اِنَاثًا وَّیَهَبُ لِمَنْ یَّشَآءُ الذُّكُوْرَ۔ اَوْ یُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّاِنَاثًا وَیَجْعَلُ مَنْ یَّشَآءُ عَقِیْمًا..... (۴۲/۴۹) وہ جسے چاہتا ہے (اپنے قانون مشیت کے مطابق) بیٹیاں دیتا ہے جسے چاہتا ہے بیٹے۔ یا بیٹے اور بیٹیاں دونوں۔ اور جسے چاہتا ہے بے اولاد رکھتا ہے (یہ سب اُس کے مقرر کردہ قانون کے مطابق ہوتا ہے)

جہاں تک طلاق کا تعلق ہے قرآن نے کہیں یہ نہیں کہا کہ عورت کا بے اولاد ہونا طلاق (یا نکاح ثانی) کے لئے وجہ جواز ہو سکتا ہے۔ نکاح کا مقصد میاں بیوی میں سکون اور مودت و رحمت ہے (۳۰/۲۱) اور جب تک ازدواجی زندگی میں یہ حسین عناصر موجود ہیں انقطاعِ تعلقات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اگلی (اور سب سے اہم) چیز "ولی عہدی" کا سوال ہے۔ کون مسلمان اس حقیقت سے بے خبر ہے کہ اسلام کی گاڑی اس دن سے دوسری پٹڑی پر جا پڑی جس دن خلافت "ملوکیت" میں تبدیل ہو گئی۔ ملوکیت کے معنی ہیں "سلطنت کا باپ سے بیٹے کی طرف وراثتاً منتقل ہونا"۔ یہ وہ آواز ہے جو گذشتہ تیرہ سو برس سے ہر محراب و منبر سے اٹھتی اور مسلسل فضا میں پھیلتی رہی ہے کہ سلطنت میں وراثت اور ولی عہدی کا تصور شجرِ اسلام کو جڑ سے کاٹ دیتا ہے۔ لیکن کس قدر بدبختی ہے کہ جہاں تیرہ سو سال سے ہر محراب و منبر سے یہ آواز اٹھ رہی ہے، اس کے ساتھ ہی تیرہ سو برس سے مسلمانوں کے ہر ملک میں "سلطنت باپ سے بیٹے کی طرف وراثتاً منتقل ہوتی چلی آ رہی ہے۔ حتیٰ کہ آج جب کہ دنیا کی قریب قریب تمام غیر مسلم سلطنتیں، زمانے کے تقاضے سے مجبور ہو کر ملوکیت کو اپنے ہاں سے ختم کر چکی ہیں، ملوکیت اگر کہیں باقی ہے تو مسلمانوں کے ممالک میں باقی ہے۔ اور یہی ملوکیت ہے جس نے ایران میں ولی عہد سلطنت کی ضرورت کو اس قدر اہمیت دی ہے کہ اس کے لئے ایک بے گناہ (خاتون) کو حوالۂ قربان گاہ کر دیا گیا ہے۔

اس سے بھی آگے بڑھیے تو ایک چیز بالکل واضح ہے۔ یعنی یہ کہ اسکی ضمانت کیا ہے کہ شاہ ایران کے ہاں کسی اور بیوی سے ضرور بالضرور اولاد پیدا ہو گی۔ اور وہ لڑکا ہی ہو گا۔

اور سب سے آخر یہ کہ شاہ ایران (ماشاء اللہ) ابھی جوان ہیں۔ اور قانون طبیعی کے مطابق ان کے کافی مدت تک زندہ رہنے کی توقع کی جا سکتی ہے۔ جس سرعت سے آجکل مزاجِ روزگار بدل رہا ہے اس کے پیش نظر اس کی بھی کیا گارنٹی ہے کہ جب تاج کے ولی عہد کی تخت نشینی کا دور آئے گا، اس وقت، اندازِ ملوکیت دنیا میں باقی ہو گا؟

ان احوال و ظروف کے پیش نظر ہمارے نزدیک شاہ ایران کا یہ فیصلہ بڑا ہی افسوسناک ہے۔ اس کے مقابلہ میں دنیائے محبت میں انگلستان کے اس "شہنشاہِ نکو فرجام"[1] کا مقام کس قدر بلند ہے جس نے بیوی کی محبت کی خاطر تخت و تاج کو ٹھکرا دیا!

---

[1] علامہ اقبال نے (ارمغانِ حجاز میں) شاہ ایڈورڈ ہشتم کو یہی کہہ کر پکارا ہے۔

اگر شاہ ایران اسلامی اصولوں کی خاطر ان چیزوں کو ٹھکرا دیتا تو دنیائے انسانیت میں اس کا مقام کتنا بلند ہو جاتا!

---

## ۲۔ سلطانی و درویشی

لیکن اگر ہمارے ہاں ایک بادشاہ اپنے تخت کو آسانی سے نہیں چھوڑتا تو یہ کونسی تعجب انگیز بات ہے جب ایک ملا اپنے مصلائے امامت کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ کراچی کا واقعہ ہے عصر کی نماز کے وقت جماعت تیار تھی۔ امام صاحب آگے بڑھنے والے تھے کہ اتنے میں مسجد کے پہلے امام اپنے مقتدیوں سمیت تشریف لے آئے اب دونوں جماعتیں اپنے اپنے اماموں کے پیچھے صف آرا ہو گئیں۔ نماز کے لئے نہیں لڑنے کے لئے۔ باہمی تصادم ہوا قریب آٹھ نمازی زخمی ہوئے۔ باقیوں کو پولیس نے گرفتار کر لیا۔ نماز عصر بھی اسی ہنگامہ کی نذر ہو گئی (بحوالہ ڈان۔ مورخہ ۲۴؍ مارچ سنہ ۱۹۵۸ء)۔ اقبال زندہ ہوتے تو ان کا یہ گلہ مٹ جاتا کہ۔

مسلمانوں میں خوں باقی نہیں ہے

---

## ۳۔ رمضان کے روزے

اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ پنجاب یونیورسٹی کا میٹرک کا امتحان ۲۶ مارچ سے شروع ہونے والا تھا۔ اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہوئی کہ چونکہ اس زمانے میں رمضان المبارک کے روزے شروع ہو چکے ہوں گے اس لئے امتحان کو ملتوی کر دیا جائے۔ چنانچہ امتحان کی تاریخوں کو بدل دیا گیا۔ (بحوالہ ڈان مورخہ ۳؍ مارچ سنہ ۱۹۵۸ء)

ہمیں اب تک یہ بتایا جاتا رہا ہے کہ روزوں کا حکم سنہ ۲ھ میں نازل ہوا۔ اور اسی سال سترھویں روزے کو بدر کی جنگ ہوئی جس میں مسلمانوں نے اپنے سے کئی گنا زیادہ دشمن کو شکست فاش دی۔

پھر یہ کہ فتح مکہ بھی رمضان میں ہوئی۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اُس وقت کے روزے کیسے تھے جو مسلمانوں کو میدان جنگ میں آنے سے بھی نہیں روکتے تھے اور آج کے روزے کیسے ہیں جن کی وجہ سے ہمارے نوجوان امتحان کے کمرے میں بھی نہیں بیٹھ سکتے۔ غور کیجئے کہ یہ خود کرنے کی باتیں ہیں۔

---

## ۴۔ بد سے بدتر

جیسا کہ ہم طلوع اسلام میں کئی بار لکھ چکے ہیں، پاکستان کی تاریخ میں وہ دن سخت منحوس تھا جب حکومت نے یہ فیصلہ کیا کہ ملازمتوں میں صوبجاتی تناسب قائم رکھا جائے گا۔ اس سے ایک طرف صوبجاتی کشیدگی بڑھتی گئی اور دوسری طرف قابلیت کا معیار دن بدن گرتا چلا گیا۔ اس صورت حالات سے ہر قلب حساس مرتعش تھا کہ اگر معیار انتخاب یوں پست ہوتا گیا تو ملک کی انتظامی مشینری کا انجام کیا ہوگا؟ اندازہ یہ تھا کہ کچھ عرصے کے تجربے کے بعد ارباب حل وعقد کو

اپنی غلطی کا احساس ہوگا اور وہ صوبجاتی نمائندگی کے فیصلہ کو "خالص قابلیت" کی میزان سے بدل دیں گے۔

لیکن اب محترم وزیر اعظم نے جس جدید پالیسی کا اعلان فرمایا ہے اس سے معلوم ہوا کہ ہمارے ہاں گنگا الٹی بہہ رہی ہے۔ اس وقت طریق انتخاب یہ ہے کہ پہلی بیس اسامیاں خالص قابلیت کے معیار پر پُر کی جاتی ہیں اور بقایا اسامیاں مشرقی اور مغربی پاکستان میں برابر برابر تقسیم کر دی جاتی ہیں۔ وزیر اعظم صاحب کی جدید پالیسی کے معنی یہ ہیں کہ اب کوئی اسامی خالص قابلیت کے معیار پر پُر نہیں کی جائے گی، بلکہ تمام اسامیاں مشرقی اور مغربی پاکستان میں برابر برابر بانٹ دی جائیں گی، اور اگر مشرقی پاکستان میں ایسے امیدواروں کی کمی ہوگی جو معیار ملازمت پر پورے اتریں تو اس صوبے کی حکومت کو اجازت ہوگی کہ وہ ایسے امیدوار بھرتی کرے جو معیار قابلیت پر پورے نہ اتریں"۔ انھوں نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اس طرح موجودہ "حماقت آمیز پالیسی کا کسی حد تک ازالہ ہو جائے گا۔ (بحوالہ ڈان مورخہ ۵ مارچ ۱۹۵۸ء) اس فیصلہ پر مملکت پاکستان کے ارباب بست و کشاد کے متعلق اس سے زیادہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ

ہوئے تم دوست جس کے اس کا دشمن آسماں کیوں ہو؟

---

## ۵۔ خدا اور قیصر

قارئین کو یاد ہوگا کہ ہم نے جنوری ۱۹۵۸ء کے طلوع اسلام میں ایک فہرست شائع کی تھی جس میں جمہوریہ اسلامیہ پاکستان کے محکمہ موسمیات نے بتایا تھا کہ ۵۸ء کے دوران رویت ہلال کی امکانی تاریخیں کیا ہوں گی۔ فہرست کے ساتھ ہم نے حسب ذیل تبصرہ بھی شائع کیا تھا۔

> ایک اسلامی مملکت کے محکمہ موسمیات کی طرف سے رویت ہلال کے متعلق جو معلومات شائع ہوں انھیں اس مملکت کے لئے مستند سمجھا جانا چاہیئے۔ لیکن اس کے بعد ہوگا یہ کہ مسجدوں میں حسب معمول رویت ہلال کمیٹیاں بیٹھیں گی اور خود حکومت پاکستان اپنے دفاتر میں تعطیلات وغیرہ کے فیصلوں کے لئے ان کمیٹیوں کے اعلان کا انتظار کریگی جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ حسب معمول ایک ہی شہر میں الگ الگ دنوں میں عید (وغیرہ) کی تقریبات منائی جائیں گی۔ سوال یہ ہے کہ اگر محکمہ موسمیات کی طرف سے شائع شدہ معلومات قابل اطمینان ہیں تو حکومت انھیں واجب العمل کیوں نہیں سمجھتی۔ اور اگر قابل سند مسجدوں کے اعلانات ہی ہیں تو پھر محکمہ موسمیات کے اس اعلان کے کیا معنی ہیں؟
>
> یاد رکھیئے! جب تک "خدا اللہ قیصر کی یہ دوعملی ختم نہیں ہوتی، دین کا مقام بلند تو ایک طرف آپ صف انسانیت میں کھڑے ہونے کے قابل بھی نہیں ہو سکتے۔

ابھی اس تبصرہ کی یاد تازہ تھی کہ احتشام الحق صاحب (خطیب جامع مسجد جیکب لائن۔ کراچی) کی طرف سے اخبارات میں ایک بیان شائع ہوا جس میں انھوں نے لوگوں سے کہا ہے کہ وہ حکومت کی طرف سے شائع کردہ فہرست پر اعتماد نہ کریں۔ اس لئے بھی کہ شرعی

نقطہ نگاہ سے حساب و شمار پر مبنی پیش گوئی رویت ہلال کے مقصد کے لئے کافی نہیں قرار پا گئی۔ (بحوالہ ڈان مورخہ ۱۶ مارچ ۱۹۵۸ء)

آپ نے اپنے بچپن کے زمانہ میں شہروں میں ڈھنڈورا پٹتا سنا ہوگا جس میں پکارا جاتا تھا کہ

ملک خدا کا۔ سلطنت بادشاہ سلامت کی۔ حکم کمپنی بہادر کا

اب اس میں ذرا سی تبدیلی ہو گئی ہے۔ یعنی

ملک خدا کا۔ سلطنت پاکستان کی۔ حکم مولوی صاحب کا

لیکن دلچسپ یہ ہے کہ حکومت بدستور اپنی فہرستیں شائع کرتی رہیگی اور ملا بدستور اپنا حکم چلاتا رہے گا۔ اور مسلمان بے چارہ اس دوراہے پر کھڑا ہر اک سے پوچھتا رہے گا کہ "جاؤں کدھر کو میں"!

---

## ......فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

قوموں کی تقدیر ان کی ابھرنے والی نسلوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ جس قوم نے اپنے بچوں اور نوجوانوں کو سنبھال لیا، اس کا مستقبل روشن ہو گیا۔ جس نے ان کی طرف سے تغافل برتا، وہ تباہ ہو گئی۔ ہمارے ہاں حالت یہ ہے کہ جس طرح قوم کے افراد بچے پیدا کر کے انہیں گلیوں اور محلوں میں آوارہ چھوڑ دیتے ہیں۔ اسی طرح ہمارا اجتماعی معاشرہ کبھی پوچھتا ہی نہیں کہ قوم کے نوجوانوں کی حالت کیا ہے۔ نتیجہ یہ کہ ہماری آنے والی نسلیں صحت اور تعلیم و تربیت دونوں اعتبار سے مفلوج ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ اس صورت حالات کا اندازہ اس سے لگائیے کہ صادق ایجرٹن کالج۔ بہاولپور کے پرنسپل نے اپنی سالانہ رپورٹ میں لکھا ہے کہ ان کے ہاں "ایک ہزار چوہتر طالب علموں میں سے بمشکل بارہ فیصد ایسے ہوں گے جن کے متعلق کہا جا سکے کہ ان کی صحت اوسط درجے کی ہے۔ باقی اٹھاسی فیصد ایسی بیماریوں میں مبتلا ہیں جو قلت یا خرابی غذا سے پیدا ہوتی ہیں۔" (ٹائمز آف کراچی۔ ۱۳ مارچ ۱۹۵۸ء)

یہ تو رہا صحت کا عالم۔ اب آئیے طالب علموں کے کیریکٹر کی طرف جو تعلیم کا فطری نتیجہ ہے ہماری درسگاہوں میں جنسیات سے متعلق جن اوباشیوں اور بدلگامیوں کا آئے دن مظاہرہ ہوتا رہتا ہے ہم سردست ان سے صرف نظر کر کے کیریکٹر کے اس پہلو کو لیتے ہیں جس کا تعلق تعلیمی دیانت سے ہے۔ تعلیمی دیانت سے ہماری مراد یہ ہے کہ طالب علم اپنی محنت اور استعداد کی بناء پر امتحان میں کامیاب ہونے کے اصول پر کاربند ہو۔ اس کے لئے ناجائز طریق اور ذریعہ کی طرف اس کا دھیان تک نہ جائے لیکن اس باب میں جو کچھ ہمارے سامنے آتا ہے وہ بڑا تاسف انگیز اور مایوس کن ہے۔ اگلے دنوں کراچی میں بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن کے ایک امتحان کا پرچہ "آؤٹ" ہو گیا۔ اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے روزنامہ پاکستان ٹائمز اپنی ۱۷ مارچ ۱۹۵۸ء کی اشاعت (کے مقالہ افتتاحیہ) میں لکھتا ہے کہ یہ کوئی نیا واقعہ نہیں۔ امتحان میں کامیابی کے لئے ہر قسم کے جائز اور ناجائز حربے استعمال کرنا ہمارے ہاں کے طالب علموں کا گویا معمول بن چکا ہے۔ قریب چار سال ادھر کی بات ہے پنجاب یونیورسٹی کے ڈپٹی رجسٹرار نے اسی اخبار کے کالموں میں لکھا تھا کہ حالت یہ ہو چکی ہے کہ "ممتحنوں تک سفارشات

پہنچائی جاتی ہیں۔ امتحان کی نگرانی کرنے والوں پر اثر ڈالا جاتا ہے کہ وہ کمرۂ امتحان میں طالب علم کی مدد کریں۔ مختصراً یہ کہ کامیابی کے لئے ہر وہ ذریعہ اختیار کیا جاتا ہے جو ذہن انسانی میں آسکے..... سی آئی ڈی نے صرف ایک مقام سے سینکڑوں ایسے خطوط پکڑے جن میں یہ سب کچھ کیا گیا تھا۔ اس کے تھوڑے عرصہ کے بعد یونیورسٹی کی سالانہ رپورٹ میں بتایا گیا کہ جو لڑکے امتحان کے کمروں میں ناجائز ذرائع استعمال کرتے ہوئے پکڑے گئے ان کی تعداد چودہ سو سے بڑھ کر اٹھارہ سو تک پہنچ چکی ہے۔

یہ رہی علمی دیانت۔ طالب علموں کے ضبط و خویش کی یہ حالت ہے کہ آپ آئے دن اس قسم کی خبریں پڑھتے رہتے ہیں کہ (مثلاً) میڈیکل کالج (کراچی) کے طالب علموں کی یونین کے سالانہ اجلاس میں طلبا میں باہمی تصادم ہوا جس میں کئی لڑکے زخمی ہوئے (ٹائمز آف کراچی مورخہ ۱۹ مارچ ۱۹۵۸ء) یا مثلاً کھیل کے میدان میں ایک لڑکے کو چھرا گھونپ کر مار دیا۔ (ایضاً)

یہ ہے نمونہ ان صفات و خصائص کا جن کی حامل ہماری آنے والی نسلیں ہو رہی ہیں۔ یہی وہ طالب علم ہیں جن کے ہاتھوں میں ملک کا نظم و نسق اور قوم کی تقدیر آنے والی ہے۔

ملک کے ارباب اقتدار کو چھوڑیئے کہ انھیں اپنی اپنی کرسیاں سنبھالنے کی فکر سے ہی فرصت نہیں ملتی۔ سوال یہ ہے کہ کیا سارے ملک میں دو چار دس ارباب دانش و بینش بھی ایسے نہیں جنھیں اس صورت حالات کا احساس ہو اور وہ اس کشتی کے بچانے کی کوئی فکر کر سکیں جس میں ہم (اور وہ) سب سوار ہیں؟ وہ ارباب فکر و نظر جو ملک کے دیگر مسائل کو الگ رکھ کر، صرف بچوں کی تعلیم و تربیت کے مسئلہ کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیں!

---

## ۷۔ جائز اور ناجائز بیٹا

کراچی سے شائع ہونے والے اخبار سنڈے پوسٹ کی ۱۶ مارچ کی اشاعت میں ایک دلچسپ مقدمہ کی روئداد چھپی ہے جس کا فیصلہ تصور کے سول جج کی عدالت سے سنایا گیا ہے۔

بات یوں ہوئی کہ ایک عورت کے ہاں اس کے خاوند کی وفات کے سولہ ماہ بعد لڑکا پیدا ہوا۔ فیصل طلب امر یہ تھا کہ اس لڑکے کو مرحوم کا جائز بیٹا تصور کیا جائے یا نہ۔ بچے کی والدہ کے وکیل نے عدالت میں کہا کہ اگر کسی عورت کے ہاں اس کے خاوند کی وفات کے دو سال بعد بچہ پیدا ہو تو فقہ حنفی کی رو سے اسے مرحوم کی جائز اولاد تسلیم کیا جاتا ہے اور مالکی فقہ میں ہے کہ اگر بچہ چار سال بعد پیدا ہو تو بھی وہ مرحوم کی جائز اولاد متصور ہوگا بشرطیکہ بچے کی ماں اپنے خاوند کی وفات کے وقت اس امر کا اعلان کر دے کہ وہ حمل سے ہے۔ امام مالکؒ خود اپنے والد کی وفات کے چار سال بعد پیدا ہوئے تھے اور پیدائش کے ساتھ ہی ان کے دانت نکلنے شروع ہو گئے تھے۔

دانتوں کے مسئلہ سے قطع نظر شرعی نقطہ نظر سے قضیہ یوں مرتب ہوتا ہے کہ چونکہ امام مالکؒ اپنے والد کی وفات کے چار سال بعد پیدا ہوئے تھے۔ اس لئے شریعت کا فیصلہ یہ قرار پایا کہ اگر ایک بچہ اپنی والدہ کے خاوند کی وفات کے چار سال بعد بھی پیدا ہو تو اسے مرحوم کی جائز اولاد تصور کیا جائے۔ سوال یہ ہے کہ اگر وہ ساڑھے چار سال بعد پیدا ہو تو اسے جائز سمجھا جائے گا یا

ناجائز؟ غالباً ناجائز۔

دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کسی عورت کو اس کے خاوند کی وفات سے (مثلاً) ایک ہفتہ پہلے حمل قرار پایا ہو تو ظاہر ہے کہ اُسے خاوند کی وفات کے وقت اس حمل کا احساس نہیں ہو سکتا اس لئے وہ اس کا اعلان نہیں کر سکتی۔ لہٰذا فقہ مالکی کی رو سے یہ بچہ مرحوم کی جائز اولاد تصور نہیں کیا جا سکتا۔

آپ نے غور فرمایا کہ ہماری مروجہ شریعت کے قوانین کس طرح مرتب ہوئے تھے؟ یہ ہیں وہ قوانین جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اب ان میں ردوبدل کا حق کسی کو حاصل نہیں۔

---

## ۸۔ پاکستان اور مولانا آزاد مرحوم

ہندوستان کے جریدہ مدینہ (بجنور) نے اپنی ۵ مارچ کی اشاعت میں مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) کی وہ تقریر شائع کی ہے جو انھوں نے تشکیل پاکستان کے بعد، اکتوبر ۱۹۴۷ء میں جامع مسجد دہلی میں مسلمانوں کے مجمع سے خطاب کرتے ہوئے کی تھی۔ اس تقریر میں انھوں نے منجملہ دیگر امور یہ کہا تھا کہ

> ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں بیتا جب میں نے تمہیں کہا تھا کہ دو قوموں کا نظریہ حیات مسلمانوں کے لئے مرض الموت کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کو چھوڑ دو۔ یہ ستون جن پر تم نے بھروسہ کر رکھا ہے نہایت تیزی سے ٹوٹ رہے ہیں...... تمہارے گروہ نے جو ساحت کردہ انا توں کا غول تھا ملک کی آزادی کے بارے میں وہ رویہ اختیار کیا جو صفحۂ ہستی سے محو ہو جانے والی قوموں کا ہوا کرتا ہے۔ ...... مجھے آج جو کہنا ہے اسے بے روک ہو کر کہنا چاہتا ہوں۔ متحدہ ہندوستان کا بٹوارہ بنیادی طور پر غلط تھا...... ہندوستان کے مسلمانوں پر مصیبتوں کا جو ریلا آیا ہے وہ یقیناً مسلم لیگ کی غلط قیادت کی فاش غلطیوں کا بدیہی نتیجہ ہے۔

پاکستان میں ایسے لوگ موجود ہیں جنھوں نے مولانا آزاد کی وفات پر کہا ہے کہ وہ مسلمانوں کے سب سے بڑے مفکر اور صحیح اسلامی سیاست کے سب سے بڑے علمبردار تھے۔ یہ ظاہر ہے کہ جس شخص کے پاکستان کے متعلق وہ خیالات ہوں جن کا اظہار مولانا آزاد کی مندرجہ بالا تقریر میں کیا گیا ہے۔ جو پاکستانی اسے عالم اسلام کا سب سے بڑا مفکر اور صحیح اسلامی سیاست کا سب سے بڑا علمبردار قرار دیں اُن کے متعلق آسانی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ پاکستان کے متعلق خود ان کے خیالات کیا ہیں۔

باقی رہا "دو قوموں کا نظریہ" (یعنی یہ نظریہ کہ مسلمان بر بنائے مذہب، ایک جداگانہ اور مستقل قوم ہیں) سو اس کے متعلق وہی (مولانا) آزاد جن کی تقریر کا اقتباس اوپر دیا گیا ہے۔ (اپنے دور الہلال میں) یہ کہا کرتے تھے کہ

> یہ (مسلمانوں کی) برادری خدا کی قائم کی ہوئی ہے۔ ہر انسان جس نے کلمۂ لا الٰہ الا اللہ کا اقرار کیا

بجرد اقرار کے اس برادری میں شامل ہو گیا۔ خواہ وہ مصری ہو خواہ الجیریا کا وحشی۔ خواہ قسطنطنیہ کا تعلیمیافتہ ترک۔ لیکن اگر وہ مسلم ہے تو اس ایک خاندانِ توحید کا عضو ہو جس کا گھرانہ کسی خاص وطن اور مقام سے تعلق نہیں رکھتا۔ بلکہ تمام دنیا اس کا وطن اور تمام قومیں اس کی عزیز ہیں۔ دنیا کے تمام رشتے ٹوٹ سکتے ہیں مگر یہ رشتہ کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔

اس سے بھی واضح تر الفاظ ہیں۔

ہمارے ملکی بھائی (یعنی ہندو) اپنے اندر صرف قومیت اور سیلست کی روح بیدار کر کے زندگی کی حرارت پیدا کر سکتے ہیں۔ اسی طرح اور قومیں بھی۔ لیکن مسلمانوں کی تو کوئی ایسی قومیت نہیں جو کسی خاص نسل و خاندان یا زمین کی جغرافیائی تقسیم سے تعلق رکھتی ہو۔ ان کی ہر چیز مذہب یا بالفاظ مناسب تر ان کا تمام کاروبار صرف خدا سے ہے۔ پس جب تک وہ اپنے تمام اعمال کی بنیاد مذہب کو قرار نہیں دیں گے۔ اس وقت تک ان میں نہ قومیت کی روح پیدا ہو سکیگی نہ وہ اپنے بکھرے ہوئے شیرازے کو جمع کر سکیں گے۔ آج دنیا "قوم" اور "وطن" کے نام میں جو تاثیر دیکھتی ہے۔ مسلمانوں کے لئے وہ صرف "اسلام" یا خدا کے لفظ میں ہے۔

متحدہ قومیت کی علمبردار کانگریس میں شرکت کے متعلق ان کا اعلان تھا کہ

ہمارا عقیدہ ہے کہ جو مسلمان اپنے کسی عمل و اعتقاد کے لئے بھی اس کتاب کے سوا کسی دوسری جماعت یا تعلیم کو اپنا راہ نما بنائے وہ مسلم نہیں بلکہ شرک فی صفات اللہ کی طرح شرک فی صفات القرآن کا مجرم اور اس لئے شرک ہے۔ اسلام اس سے بہت ارفع و اعلیٰ ہے کہ اس کے پیروؤں کو پولیٹیکل پالیسی قائم کرنے کے لئے ہندوؤں کی پیروی کرنی پڑے۔ مسلمانوں کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی شرمناک سوال نہیں ہو سکتا کہ وہ دوسروں کی پولیٹیکل تعلیموں کے آگے جھک کر نیا راستہ پیدا کریں۔ ان کو کسی جماعت میں شامل ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ خود دنیا کو اپنی جماعت میں شامل کرنے اور اپنی راہ پر چلانے والے ہیں۔

غیر مسلموں سے تعلقات استوار کرنے کے سلسلے میں وہ کہا کرتے تھے کہ

کفار سے مسلمانوں کو ساز باز نہ رکھنی چاہیئے۔ ان سے بے تعلق ہونا لازم ہے جو ساز باز رکھتے ہیں جنہیں ان سے بے تعلق رہنے میں اپنے اور اپنی قوم کے لئے مشکلات اور مصائب کا اندیشہ ہے۔ وہ غلطی پر ہیں۔ ان کو پشیما[illegible]نا پڑے گا۔ اسلام کو فتح نصیب ہو گی اور مسلمانوں کی بہبود و بہتری کا قدرت کاملہ کوئی اور انتظام کرے گی۔

یہ تھے اسلام کے وہ بنیادی تصورات جنہیں کسی زمانے میں مولانا ابوالکلام آزاد پیش کیا کرتے تھے اور جن کی بناء پر علامہ اقبالؒ نے مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کا نظریہ اور اس کی بنیاد پر ہندوستان کے بٹوارے کا تصور پیش کیا اور جسے راس زمانے کی مسلم لیگ کی قیادت نے عملی سیاست کی حیثیت سے آگے بڑھایا اور اس میں کامیابی حاصل کی۔

اور یہی تھی مسلم راہ نماؤں کی وہ روش جسے ابوالکلام صاحب آزاد نے قوم کے حق میں مرض الموت اور ان کے جملہ مصائب کا ذمہ دار قرار دیا۔

اور انہی آزاد صاحب کو ہمارے پاکستانی بھائی مسلمانوں کا سب سے بڑا مفکر اور اسلامی سیاست کا سب سے عظیم علمبردار قرار دے رہے ہیں!

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیئے؟

---

# استفسارات

**۱۔ لاء کمیشن** اکثر قارئین کی طرف سے استفسارات موصول ہوتے رہتے ہیں کہ لاء کمیشن کے سلسلہ میں مزید کارروائی کیا ہو رہی ہے؟ ان استفسارات سے مترشح ہوتا ہے کہ کمیشن کے متعلق ملک میں کافی دلچسپی موجود ہے۔ جواباً عرض ہے کہ (جیسا کہ اخبارات میں شائع ہوا تھا) کمیشن کی پہلی میٹنگ ۲۰ر جنوری کو کراچی میں منعقد ہوئی تھی جس میں کمیشن کے تواعد وضوابط سے متعلق امور طے پائے۔ اس کے بعد کہا گیا تھا کہ کمیشن کی طرف سے ایک سوالنامہ شائع ہوگا۔ اس وقت تک نہ تو وہ سوالنامہ ہی شائع ہوا ہے اور نہ ہی کمیشن کی آئندہ میٹنگ کی کوئی اطلاع ہے۔

**۲۔ لغات القرآن** کمیشن سے کہیں زیادہ استفسارات لغات القرآن کی طباعت کے متعلق موصول ہو رہے ہیں۔ جیسا کہ سابقہ اشاعت میں بتایا جا چکا ہے، فن طباعت سے دلچسپی رکھنے والے احباب مختلف تجاویز پر غور کر رہے ہیں۔ ان میں سے ایک تجویز یہ بھی ہے (جس کی تائید بعض بزمیوں کی طرف سے بھی موصول ہوئی ہے) کہ خود اپنا پریس لگایا جائے۔ طباعت کے سلسلہ میں سب سے پہلا مرحلہ کتابت کا ہے جس پر کافی وقت لگ جائے گا۔ کتابت شروع کرائی جا سکتی تھی لیکن چونکہ خود کتابت کا انحصار بھی اس پر تھا کہ طباعت کس طریق پر ہوگی اس لئے جب تک طریق طباعت کے متعلق طے نہ ہو جائے کتابت شروع نہیں کرائی جا سکتی تھی۔ اب یہ طے پا چکا ہے کہ طباعت لیتھو یا ٹائپ کے طریق پر نہیں ہوگی اس لئے فیصلہ کیا گیا ہے کہ کتابت ایسی کرائی جائے جس سے کتاب بلاک یا فوٹو آفسیٹ کے طریق سے چھپ جائے۔ لہٰذا اب ارادہ ہے کہ دفتر کے لاہور منتقل ہو جانے کے بعد کتابت شروع کرا دی جائے۔ جتنے میں اس کی تکمیل ہوگی طباعت کے متعلق آخری فیصلہ ہو جائے گا۔

---

# رابطۂ باہمی

**۱۔ منظور شدہ بزمیں** | ابتدائی بزموں کی منظور شدہ فہرست میں "بزم مظفر گڑھ" کا اضافہ کر لیا جائے۔ محترم عبدالغفور چغتائی صاحب نمائندہ منتخب ہوئے ہیں۔

**۲۔ تبدیلی** | محترم سعود احمد خاں صاحب، نمائندہ بزم سید حسین کی جگہ محترم امیر حسن شاہ صاحب کو نمائندہ منتخب کیا گیا ہے۔ کیونکہ اول الذکر کسی دوسری جگہ منتقل ہو گئے ہیں۔

---

## روئداد

**کراچی** | بزم کے چار اجتماعات منعقد ہوئے۔ پمفلٹ "السلام علیکم" کی تقسیم نہایت خوش اسلوبی سے ہوئی اور اسے مفید مقامات تک پہنچایا گیا۔ لوگوں نے اس پمفلٹ کو پسند کیا اور اس قسم کے پمفلٹس کی ضرورت کا اظہار کیا۔ دوسرا پمفلٹ "نعرۂ تکبیر" شائع ہو چکا ہے جس کی تقسیم جاری ہے۔ تیسرا پمفلٹ "حی علی الفلاح" کے عنوان سے عنقریب شائع ہو جائے گا۔ بزمہائے طلوعِ اسلام کو ان پمفلٹس کی ضرورت ہو تو کراچی بزم کو تحریر کریں۔ یہ پمفلٹس مفت تقسیم کئے جاتے ہیں۔

مندرجہ ذیل تجاویز پیش ہوئیں۔

(۱) پرویز صاحب کے کراچی سے لاہور منتقل ہو جانے پر اس ہفتہ وار درس کا سلسلہ ٹیپ ریکارڈ کے ذریعہ جاری رکھا جائے جو پرویز صاحب ہر ہفتہ اپنے مکان پر دیتے رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں ٹیپ ریکارڈ اور جگہ کے تعین کا مسئلہ زیرِ غور ہے۔

(۲) پرویز صاحب کے کراچی سے لاہور منتقل ہو جانے پر بزم کراچی کے ہفتہ وار اجلاس ارکان کے مکانوں پر ہوا کریں گے۔

(۳) کراچی میں ایک مرکزی دارالمطالعہ کا قیام۔ اس سلسلہ میں طے ہوا کہ جب تک کسی بہتر مقام پر دارالمطالعہ قائم نہ ہو اس وقت کے لئے کچھ علاقوں میں ارکان کے مکانوں پر لائبریریاں کھول دی جائیں۔ جہاں بزم کی جانب سے طلوعِ اسلام کا مکمل لٹریچر رکھا جائے۔ فی الحال چار مقامات پر اس کا بندوبست کیا گیا ہے۔

۱۔ جناب لطیف الرحمٰن صدیقی صاحب　　۵/۸ بزرٹا لائن۔ کراچی ۵

۲۔ جناب عارف اقبال فاروقی صاحب　　۸/۶۔ 3.J. لالوکھیت۔ کراچی

۳۔ جناب شہزاد علی خاں و امام الدین صاحبان　　بہار کالونی ٹینری روڈ مکان ۱۸۷/۳ کراچی

۴۔ جناب عبداللہ جمال صاحب ۔　　لائبریری رائل برادرس ، جیب اسکوائر ، بندر روڈ ۔ کراچی

ایک لائبریری شیر شاہ کالونی میں پہلے ہی سے موجود ہے۔

**بزم لائلپور** ۹ر فروری کو ماہانہ اجتماع میں حسب ذیل قرارداد منظور کی گئی۔

• تمام اراکین بزم جناب محترم پرویز صاحب اور ان کے ہمراہ تشریف لانے والے معزز مہمانوں کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انہوں نے سفر کی صعوبتوں کو برداشت فرما کر اور سخت سردی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے ہماری دعوت کو قبول فرمایا اور حسب وعدہ اپنا قیمتی وقت صرف کر کے اہالیان لائلپور اور گرد و نواح کے عوام کو قرآن کا صحیح پیغام پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ اور ہم امید کرتے ہیں کہ آئندہ بھی ہماری گذارشات کو قبولیت کا شرف حاصل ہوگا۔ ازاں بعد اللہ تعالیٰ کے حضور میں دعا کی گئی کہ محترم پرویز صاحب کی دین اسلام اور قرآن کریم کی بے لوث خدمت اور انتھک کوششوں کو کامیاب فرمائے۔ بعدہ آخر میں محترم پرویز صاحب کی درازئ عمر اور صحت کامل کی دعا کی گئی۔

(۱) محترم پرویز صاحب کی تقاریر کے متعلق عوام تاثرات کا مجموعی طور پر جائزہ لیا گیا تو معلوم ہوا کہ عوام میں قرآن کریم کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے بے حد شوق پایا جاتا ہے۔ لیکن رسم و رواج یا تقلیدی بندھنوں کو توڑنا بھی آسان کام نہیں۔ اس لئے صدیوں سے زمانے کے ناہموار ماحول میں گھرے ہوئے انسانوں کو راہ راست پر لانے کے لئے بڑا وقت صرف ہوگا۔ لہذا بزم کے اراکین عوام کو قرآن کی روشنی تک پہنچانے میں مقدور بھر کوشش کریں گے۔

(۲) عوام تک قرآن کا صحیح پیغام پہنچانے کے لئے ہر قسم کے پمفلٹ شائع کئے جائیں گے اور مفت تقسیم کئے جائیں گے اور ان کا خرچ اراکین بزم برداشت کرتے رہیں گے۔ اور عوام کی معلومات کے اضافہ کی خاطر بزم کی لائبریری کے لئے نو عدد کتب خرید کی گئیں۔

**۳۔ شیخوپورہ** طے پایا کہ محترم مرزا غلام حیدر صاحب ہر اجتماع میں باقاعدہ درس قرآن حکیم دیا کریں گے۔

**۴۔ مردان** طباعت لغات القرآن کے سلسلہ میں تجویز ہے کہ پہلے اپنا پریس لگانے کی اسکیم پر پورا پورا غور کیا جائے خواہ اس سے کتابوں کے چھپنے میں کچھ تاخیر بھی کیوں نہ ہو جائے۔

**۵۔ پشاور** اپنا پریس لگانے کی تجویز پر غور کیا جائے نیز لغات القرآن اور مفہوم القرآن کو اس انداز سے چھاپا جائے کہ ان کی قیمت غریب طبقہ کی استطاعت سے باہر نہ ہو۔ (۲) شہر اور چھاؤنی کی بزمیں تبلیغی کاموں میں مصروف ہیں۔

**ایک ضروری وضاحت** ایک بزم نے اپنے ہاں یہ تجویز کیا کہ لغات القرآن کی طباعت کے سلسلہ میں عام چندہ جمع کرنا شروع کیا جائے۔ انہیں اس سے روک دیا گیا ہے۔ عام چندہ جمع کرنا طلوع اسلام کے مسلک کے خلاف ہے۔ لغات القرآن کی طباعت کے ضمن میں صرف ان حضرات کے عطیات قبول کئے جائیں جو طلوع اسلام کے مسلک سے متفق ہوں اور وہ خود اس سلسلہ میں تعاون کرنا چاہیں۔

# پیشکش برائے طباعت لغات القرآن

مصنفہ:۔ محترم پرویز صاحب

حسب معمول فہرست عطیات (موعودہ اور ایفا شدہ) پیش خدمت ہے

## منجانب نئے حلقے طلوع اسلام

رقم موصولہ

| پیش کنندہ | مقام | وعدہ | سابقہ | تا ۲۸ مارچ ۵۸ء |
|---|---|---|---|---|
| جناب سراج الدین صاحب | قادر آباد | ۱۰۰ | - | - |
| جناب عبدالغفور محسن صاحب | کوئٹہ | ۱۵۰ | - | - |
| جناب حافظ شاہ حسینی صاحب | ٹنڈو محمد خان | ۳۰۰ | - | - |
| جناب نہال خاں صاحب | جام پور | ۳۰۰ | - | - |
| جناب غلام جیلانی صاحب | شیخوپورہ | ۳۰۰ | ۱۰۰ | |
| جناب عبدالجلیل صاحب | اسعید قطر | ۹۰۰ | - | - |
| جناب محمد رفیق صاحب | قادیان | ۳۰۰ | - | - |
| جناب مشتاق احمد صاحب | ڈیرہ غازیخان | ۲۵۰ | ۵۰ | - |
| جناب گلزار حسین صاحب | لائلپور | ۵۰۰ | - | - |
| جناب عبدالحکیم صاحب | مردان | ۱۰۰۰ | - | ۲۰۰ |
| جناب نصراللہ خاں صاحب | سرگودھا | ۵۰۰ | - | - |
| جناب مظفر عباس صاحب | جھنگ | ۵۰۰ | - | - |

رقوم موصولہ

| پیش کنندہ | مقام | وعدہ | سابقہ | تا ۲۸ مارچ ۵۸ء |
|---|---|---|---|---|
| جناب مرزا علی محمد صاحب | پشاور | ۲۰۰۰ | ۵۳۰ | ۲۵۰ |
| جناب غلام ربانی صاحب | ٹیکسلا | ۵۰ | - | - |
| جناب بخت جمال خاں صاحب | سیالکوٹ | ۵۰۰۰ | ۱۵۰۰ | - |
| جناب عظمت حسین صاحب | ایبٹ آباد | ۲۰۰ | - | - |
| جناب محمد اختر صاحب | واہ چھاؤنی | ۶۷۵ | ۱۷۵ | ۱۰۰ |
| جناب محمد گل صاحب | لاڑکانہ | ۳۰۰ | ۱۰۰ | - |
| جناب عطا محمد صاحب | پنج گسی | ۳۰۰ | ۱۸۰ | ۳۰ |
| جناب زبیر عزیز صاحب | اوکاڑہ | ۱۰۰۰ | - | ۵۰۰ |
| جناب محمد اسمٰعیل صاحب | گوجرانوالہ | ۳۰۰ | | |
| جناب عبداللطیف لغاری صاحب | لاہور | ۵۰۰۰ | ۳۸۰ | |
| جناب محمد اکبر صاحب | دیونہ منڈی | ۳۰۰ | ۵۰ | |
| | | ۱۹,۶۲۵ | ۳۰۶۵ | ۱۰۷۰ |
| کلیۃً ایفا شدہ وعدے | | ۸,۱۸۱ | ۸۱۸۱ | |
| میزان رقوم | | ۲۷,۸۰۶ | ۱۲,۳۱۶ | |

# انفرادی پیشکش

رقوم موصولہ

| پیش کنندہ | مقام | وعدہ | سابقہ | تا ۲۸ مارچ ۵۸ء |
|---|---|---|---|---|
| جناب روشن خاں صاحب | کراچی | ۳۰۰۰ | - | - |
| جناب ڈاکٹر رضا محمد خاں صاحب | مردان | ۵۰۰ | - | - |
| جناب ابو الاثر حفیظ جالندہری صاحب | مجانب مردان | ۱۰۰۰ | - | - |
| جناب فضل کریم صاحب | مردان | ۱۰۰ | - | - |
| جناب خواجہ رسول صاحب | پنڈدادنخاں | ۱۰۰ | - | - |
| جناب میر تجمل حسین صاحب | جھنگ | ۱۰۰۰ | (مقدمہ کے فیصلہ پر) | |
| جناب حاجی بشیر محمد پراچہ صاحب | کراچی | (۶۰۰۰) | - | ۶۰۰۰ |
| جناب عبد العزیز صاحب | دہران | (۱۰۰) | - | ۱۰۰ |
| جناب گمنام صاحب | کراچی | (۱۰۰) | - | ۱۰۰ |
| جناب محمد شفیع صاحب | لاہور | (۵۰) | - | ۵۰ |
| جناب گمنام صاحب | لاہور | (۲۰۰) | - | ۲۰۰ |
| جناب مقبول احمد صاحب | دہران | (۲۰۰) | - | ۲۰۰ |
| جناب محمد اسلم قریشی صاحب | " | (۲۰۰) | - | ۲۰۰ |
| جناب ملک محمد اشرف صاحب | " | (۱۰۰) | - | ۱۰۰ |
| جناب محمد اقبال صاحب | " | (۱۰۰) | - | ۱۰۰ |
| جناب محمد اسحٰق میر صاحب | " | (۲۰۰) | - | ۵۰ |
| جناب ایم اے درانی صاحب | " | (۱۰۰) | - | ۱۰۰ |
| جناب حکیم احمد الدین صاحب | پیج مسی | (۲) | - | ۲ |
| جناب محمد شعیب صاحب | چاربلغ | (۱۰) | - | ۱۰ |
| جنابہ مسز عبد اللہ جمال صاحبہ | کراچی | (۱۰) | - | ۱۰ |
| | | ۱۲،۰۷۲ | - | ۷،۲۲۲ |
| (انفرادی) تمام کلیتہً ایفا شدہ وعدے | | ۷،۸۵۲/۸ | - | ۷،۸۵۲/۸ |
| (انفرادی) میزان | | ۱۹،۹۲۴/۸ | | ۱۵،۰۷۴/۸ |
| میزان کل | | ۴۹،۴۳۰/۸ | | ۲۷،۳۹۰/۸ |


## سلسلہ معارف القرآن (پرویز)

(قرآنی تعلیمات و تصورات کی وضاحت قرآنی آیات کی بنیاد پر)

۱۔ ابلیس و آدم صفحات ۳۷۶۔ بڑا سائز قیمت آٹھ روپے ۲۔ جوئے نور صفحات ۳۰۴ قیمت چھ روپے

۳۔ برق طور صفحات ۳۲۰۔ بڑا سائز قیمت چھ روپے ۴۔ معراج انسانیت صفحات ۷۳۲ قیمت بیس روپے

۵۔ انسان نے کیا سوچا؟ صفحات ۳۶۸۔ قیمت دس روپے

# انتہائی کم قیمت پر بہترین کپڑا

# 96000

- اعلیٰ درجہ کی سفید شرٹنگ
- مرغا چھاپ سفید شرٹنگ
- دل چھاپ ساٹن ڈرل وغیرہ وغیرہ

میسرز علی محمد اسمٰعیل 39A/S موجی جیٹھا مارکیٹ — کراچی

## نیز

اسٹال:۔ مل اونرز ریٹیل کلاتھ مارکیٹ۔ پرانی نمائش
بندر روڈ ایکسٹینشن کراچی سے بھی مل سکتا ہے

# داؤد کاٹن ملز لمیٹڈ۔ کراچی